آج

۵۱

اورخان پامک
وجے دان دیتھا

میلان کنڈیرا
سوزن سونٹاگ

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۵۱

جنوری ۲۰۰۶ء

رابطے کے لیے پتا:

آج کی کتابیں

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: city_press@email.com, aajquarterly@gmail.com

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) ۳۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

ہندستان: ایک سال (چار شمارے) ۴۳۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) ۳۰ امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک خریداری کے لیے پتا:

Dr. Baidar Bakht

21 White Leaf Crescent

Scarborough, Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391

Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

اورخان پامک

۷

سفید قلعہ

(ناول)

***

وِسے دان دیتھا

۹۱

دُبدھا

***

میلان کنڈیرا

۱۱۷

کوئی نہیں ہنسے گا

Scanned with CamScanner

سوزن سونٹاگ

۱۵۵

دوسروں کی اذیت کا نظارہ

نئی کتابیں

گم شدہ خطوط

اور دیگر تراجم

انتخاب اور ترجمہ: محمد عمر میمن

پیپر بیک: Rs. 90

منتخب تحریریں

نرمل ورما

ترتیب: اجمل کمال

مجلد: Rs. 280

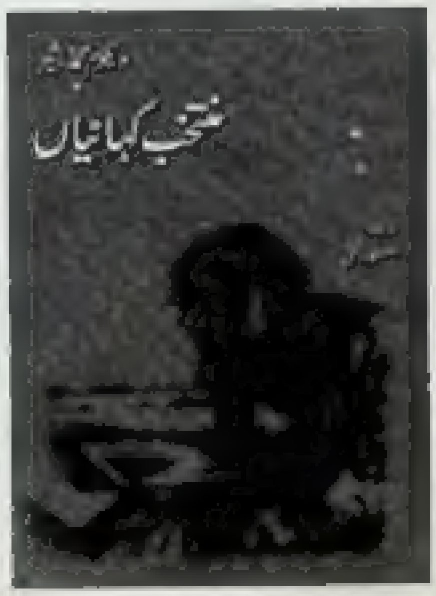

منتخب کہانیاں

ویکوم محمد بشیر

ترتیب: مسعود الحق

مجلد: Rs. 180

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

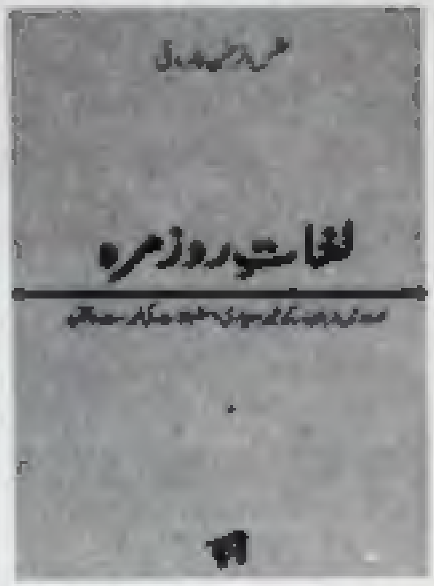

لغاتِ روزمرہ
شمس الرحمٰن فاروقی
پیپر بیک: Rs. 150
مجلد: Rs. 250

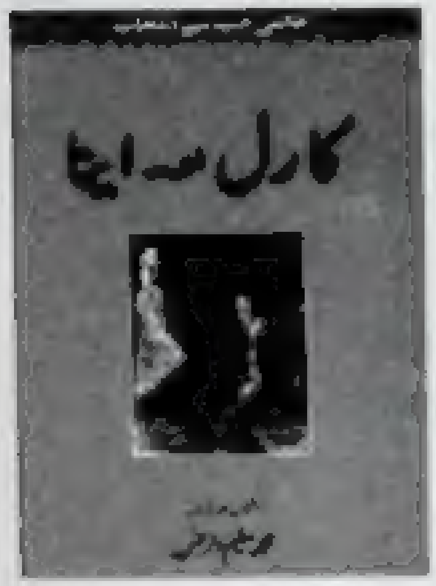

کارل اور اینا
(منتخب ترجمے)
انتخاب اور ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
پیپر بیک: Rs. 80

خیمہ
میرال طحاوی
ترجمہ: اجمل کمال
پیپر بیک: Rs. 75

Scanned with CamScanner

اورحان پامُک

سفید قلعہ

مترجم:

محمد عمر میمن

Scanned with CamScanner

جدید ترکی کے نامور ادیب اورخان پامک (Orhan Pamuk) کو یوروپی ناول کی روایت کے معاصر تسلسل کا ایک اہم ادیب تسلیم کیا جاتا ہے۔ پامک ۱۹۵۲ء میں استنبول میں پیدا ہوئے، یعنی اس شہر میں جو ایشیا اور یوروپ میں بیک وقت واقع ہے اور جسے ایک دریا نہیں بلکہ سمندر دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پامک نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے ناول کا میدان منتخب کیا جو بنیادی طور پر ایک یوروپی صنف ہے۔ یہ انتخاب ایک سے زیادہ اعتبار سے بامعنی ہے۔ پامک نے اپنی طبع ایجاد کے وفور سے ناول کی صنف کو اس کشمکش کی صورت گری کی غرض سے استعمال کیا جسے عموماً مشرقی اور مغربی اقدار، یا روایت اور جدیدیت کی کشمکش کہا جاتا ہے اور جو گزشتہ کئی صدیوں سے ایشیا اور افریقہ کے بیشتر معاشروں کی زندگی کا بنیادی تحرک رہی ہے۔ بیانیے کے فن سے پامک کو طبعی مناسبت ہے، اور ایک تبصرہ نگار کے لفظوں میں، ناول کے میدان میں ان کی سرگرمی کا منتہائے مقصود دراصل بیانیے کی طاقت سے اپنے ملک کو وجود عطا کرنا ہے۔ کہانی بُننے کے نت نئے، پرلطف، پیچیدہ اور انتہائی معنی آفریں طریقے اختیار کرنے کے معاملے میں پامک کا موازنہ اتالو کلوینو، بورخیس اور نابوکوف سے کیا جاتا رہا ہے، اور اب وہ معاصر ممتاز بین الاقوامی ناول نگاروں کے اس قبیلے کے مسلمہ رکن ہیں جن کی ہر تصنیف کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

''سفید قلعہ'' میں، جو ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا اور پامک کے اب تک سامنے آنے والے سات ناولوں میں تیسرا ہے، ان کا فن اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ کہانی کا تعارف، پیش لفظ کے طور پر، ایک فرضی شخص فاروق دارون اوغلو کی طرف سے تحریر کیا گیا ہے جو پامک کے ایک اور ناول *The House of Silence* کا ایک باقاعدہ کردار ہے۔ افسانہ در افسانہ کا یہ کھیل، جسے مکمل اور قابلِ یقین بنانے کے لیے پامک نے اس فرضی کردار کی طرف سے اس کی بہن کے نام انتساب تک ناول میں شامل کیا ہے، بورخیس کی یاد دلاتا ہے۔ خود ناول میں، جیسا کہ آپ آئندہ صفحات میں پیش کیے گئے عمدہ ترجمے میں ملاحظہ کریں گے، زندگی کے واقعات کو تحریر میں لانے کے عمل، اور اس عمل کے ذریعے اپنی شناخت کی دریافت اور گمشدگی، کی کلیدی اہمیت ہے۔

Scanned with CamScanner

ناول کا اصل راوی سترھویں صدی کا ایک اطالوی عالم ہے جسے وینس سے نیپلز کے بحری سفر کے دوران عثمانی ترکوں کے ہاتھوں گرفتار کر کے غلام بنا لیا جاتا ہے اور آگے چل کر اس کے ہم شکل مسلمان امیر خوجہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ناول کے پیش لفظ میں پڑھنے والے کو اشارہ دیا گیا ہے کہ ان دونوں کرداروں کے باہمی تفاعل میں معاصر سیاسی حقائق اور مشرق و مغرب کے طویل اور لاگ اور لگاوٹ پر مبنی رشتوں کی علامات دیکھنا غیر ضروری ہے لیکن، جیسا کہ ناول کا ایک اور تبصرہ نگار پال برمن کا کہنا ہے، یہ دراصل ناول کے قصے کو اس زاویے سے دیکھنے کا دعوت نامہ بھی ہو سکتا ہے۔

اس ناول کے کل گیارہ باب ہیں جن میں سے چھ کا ترجمہ آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔ یہ ترجمہ محمد عمر میمن نے کیا ہے جو اس سے پہلے البیر کامیو، میلان کنڈیرا، امین مالوف اور دیگر ادیبوں کی تحریروں کا اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ ناول کے ترجمے کا کام ابھی جاری ہے اور امید ہے کہ "سفید قلعہ" کے بقیہ ابواب کا ترجمہ بھی "آج" کی کسی قریبی اشاعت میں آپ کے مطالعے کے لیے پیش کیا جا سکے گا۔

Scanned with CamScanner

انتساب

نیلگوں داروِن اوگلو
(محبت کرنے والی بہن)
کے لیے
(۱۹۶۱ء تا ۱۹۸۰ء)

یہ تصور کرنا کہ جو شخص ہمارے تجسس کو ابھارتا ہے اس کی رسائی ایسے طرزِ زیست تک ہے جو نہ صرف نامعلوم ہے بلکہ اپنے اسرار کی وجہ سے پرکشش بھی، یہ یقین کرنا کہ ہم صرف اسی شخص کی محبت کے ذریعے زندہ رہنے کا آغاز کریں گے۔ یہ اگر ایک شدید جذبے کی پیدائش نہیں تو اور کیا ہے؟

— مارسیل پروست
(سی۔ کے۔ کراحتان اوگلو کے غلط ترجمے سے)

پیش لفظ

یہ مخطوطہ ۱۹۸۲ء میں میرے ہاتھ آیا، اس فراموش کردہ "دستاویز گھر" میں جو گبزے میں گورنر کے دفتر سے متصل تھا، جہاں ہر گرما میں ہفتہ بھر چھان بین کیا کرتا تھا۔ ایک خاک آلود صندوق کی تہہ میں جو شاہی فرامین، ملکیت کی دستاویزات، عدالتی دفاتر اور ٹیکس کے پلندوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس کی خوابناک نیلے رنگ کی نازک، ابری دار جلد بندی، اس کی چمکدار کتابت، جو رنگ اڑی حکومتی دستاویزوں میں جھلک رہی تھی، فوراً میری نظر میں کھب گئی۔ لکھائی کے فرق سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے اصلی خطاط کے علاوہ کسی اور شخص نے بعد میں، گویا میری دلچسپی کو مزید ہوا دینے کے لیے، کتاب کے پہلے صفحے پر یہ عنوان ٹانک دیا تھا "رضائی بنانے والے کا سوتیلا بیٹا۔" کوئی اور تحریر نہیں تھی۔ حاشیے اور خالی صفحے ایسے لوگوں کی تصویروں سے بھرے تھے جن کے سر چھوٹے تھے اور ان پر بٹن جڑے سرپوش تھے، اور جو کسی طفلانہ ہاتھ کے بنے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کتاب فوراً پڑھ ڈالی، بے حد لطف کے ساتھ۔ خورسند، لیکن قلمی نسخے کو نقل کر لینے کے معاملے میں خاصا کاہل، میں نے اسے چرا لیا۔ اس کوڑا گھر سے جسے نوجوان "ورزیجی" "دستاویز گھر" کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، نگراں کے اعتماد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو چھوٹا اتنا مؤدب نکلا کہ میری نگرانی کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس کی، اور، پلک جھپکتے میں، اسے اپنے بستے میں سرکا دیا۔

شروع میں مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ اس کتاب کا کیا کروں گا، سوائے اس کے کہ اسے بار بار پڑھوں۔ اس زمانے میں تاریخ سے میری بے اعتمادی ہنوز مستحکم تھی، اور میں کہانی پر فنی نقطہ ارتکاز کرنا چاہتا تھا، بجائے مخطوطے کی سائنسی، ثقافتی، بشری، یا "تاریخی" قدر و قیمت کے۔ مجھے خود مصنف میں کشش نظر آئی۔ چونکہ مجھے اور میرے احباب کو دانش گاہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا، میں نے اپنے [illegible] کا قاموس نویسی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا تبھی مجھے مشاہیر سے متعلق ایک قاموس کے حصہ تاریخ

میں — جو میرے حوالے کیا گیا تھا — ایک یادداشت مصنف کے بارے میں بھی شامل کرنے کا خیال آیا۔

اس کام کے سلسلے میں نے اپنا وہ وقت وقف کر دیا جو قاموس پر کام کرنے اور پیچتے پالنے سے بچ رہتا تھا۔ جب میں نے مصنف کے زمانے سے متعلق مآخذ سے رجوع کیا، مجھے فوراً نظر آ گیا کہ کہانی میں بیان کیے گئے کچھ واقعات کی امرِ واقعہ سے مطابقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ مثال کے طور پر، میں نے تصدیق کی کہ ان پانچ برسوں میں جب گیرز دلو نے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا، ایک موقعے پر ایک ہولناک آگ لگی جس نے استنبول کو تباہ کر دیا تھا، لیکن کسی قابلِ اندراج وبا پھوٹنے کی مطلق کوئی شہادت نہیں ملتی تھی، چہ جائیکہ طاعون کی جیسا کہ کتاب میں دکھایا گیا تھا۔ اس دور کے بعض وزیروں کے نام کے ہجے غلط دیے گئے تھے، کچھ ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیے گئے تھے، اور کچھ کے تو نام تک بدل دیے گئے تھے۔ شاہی نجومیوں کے نام محل کی یادداشتوں میں مندرج ناموں سے مختلف دیے گئے تھے، لیکن میرے خیال میں چونکہ اس عدم توفق کا کہانی میں اپنا مقام تھا، میں نے اس پر بہت زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ دوسری طرف، ہمارے تاریخ کے "علم" سے کتاب میں مندرج واقعات کی عام طور پر تصدیق ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات تو یہ "صداقت" مجھے حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلوں میں بھی نظر آئی: مثلاً، مورخ نعیمہ نے شاہی منجم حسین افندی کی سزائے موت اور محمد چہارم کے براہو رمحل میں خرگوشوں کے شکار کی مہم بن و عن بیان کی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ مصنف، یہ بالکل واضح ہے کہ وہ پڑھنے اور ہوائی قلعے بنانے سے لطف اندوز ہوتا تھا، ان مآخذ اور بہت سی دوسری کتابوں سے واقف رہا ہو — جیسے یورپی سیاحوں اور آزاد کردہ غلاموں کی ذاتی یادداشتیں — اور انھیں سے اپنی کتاب کا مواد نکالا ہو۔ اس نے بخش اولیا چلبی کی سیاحتوں کے روزنامچے پڑھے ہوں، جس کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اس سے واقف ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس کا اسٹ بھی درست ہو سکتا ہے، میں اپنی کہانی کے مصنف کا پتا لگانے کی کوشش کرتا رہا، لیکن استنبول کے کتب خانوں میں جو تحقیق میں نے کی اس سے میری زیادہ تر امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ مجھے ان رسائل اور کتب میں سے ایک بھی نہیں ملی جو محمد چہارم کو ۱۶۵۲ء اور ۱۶۸۰ء کے درمیان پیش کی گئی تھیں، نہ توپ کاپہ محل کے کتب خانوں میں، نہ دیگر عوامی یا شخصی لائبریریوں میں جہاں میرا خیال تھا کہ وہ بھٹکتے ہوئے پہنچے ہوں گی۔ بس ایک سراغ ملا: کہانی میں مذکور

Scanned with CamScanner

"چپ دست کاتب" کی دوسری چیزیں ان کتب خانوں میں دستیاب تھیں۔ کچھ وقت تو میں ان کا تعاقب کرتا رہا، لیکن اطالوی دانش گاہوں سے، جنھیں میں نے اپنی تابڑ توڑ فرمائشات سے تنگ کر مارا تھا، صرف مایوس کن جواب ہی موصول ہوئے۔ مصنف کے نام کی تلاش میں (جو خود کتاب میں دیا گیا تھا، گو عنوان والے صفحے پر نہیں) گیبزے، جنت حصار، اور اوسکدار کے قبرستانوں میں کتبوں کے درمیان میری سرگردانی بھی ناکام ہی رہی، اور تب تک میں اس سے بھر پایا تھا: میں ممکنہ تفتیشی سراغوں سے دست کش ہوا اور قاموس میں تعارفی مضمون خود کہانی کی بنیاد پر ہی لکھ دیا۔ جیسا کہ مجھے خدشہ تھا، انھوں نے وہ مضمون نہیں چھاپا، لیکن اس وجہ سے کہ اس کا موضوع بحث کوئی خاصی مشہور خیال کی جانے والی شخصیت نہیں تھی۔

شاید اسی وجہ سے میرے لیے کہانی کی کشش بڑھ گئی۔ میں نے احتجاجاً استعفیٰ دینے کا خیال بھی کیا، لیکن مجھے اپنا کام اور اپنے رفقا پسند تھے۔ کچھ وقت تو میں ہر ملنے والے کو اپنی کہانی سناتا رہا، اتنے ہی جوش سے جیسے یہ میری ہی تصنیف ہو، نہ کہ میری دریافت ہو۔ اسے زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے میں اس کی علامتی قدر و قیمت پر گفتگو کرتا، اس بنیادی ربط پر جو اسے ہمارے زمانے کی حقیقتوں سے تھا، کہ اس کہانی کے ذریعے کس طرح خود میں اپنے عصر کو سمجھ سکا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جب یہ دعوے کیے، تو نوجوانوں کو جو سیاست، فعالیت، مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات، یا جمہوریت جیسے مسائل میں عام طور پر زیادہ محو ہوتے ہیں، اول اول ان میں کافی کشش نظر آئی، لیکن میرے پینے پلانے کے ندیموں کی طرح، وہ بھی جلد ہی میرے قصے کو بھلا بیٹھے۔ ایک دوست، جو پروفیسر تھا، جس نے صرف میرے اصرار پر مخطوطے کی ورق گردانی کی تھی، بولا کہ استنبول کی عقبی گلیوں کے قدیم چوبی گھروں میں ایسے ہزاروں لاکھوں مخطوطے ہیں جو اسی قبیل کی کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اگر ان مکانوں میں رہنے والے سادہ لوگوں نے انھیں، اپنے عثمانی خط کے باعث، سہواً عربی قرآن سمجھ کر کبھی اپنی الماریوں کے اوپر نہ رکھا ہوتا تو وہ شاید انھیں صفحہ صفحہ پھاڑ کر اپنے چولھے جلا رہے ہوتے۔

چنانچہ میں نے ایک مخصوص، چشمہ بردار لڑکی کی ہمت افزائی کرنے پر جس کے ہاتھ سے سگریٹ کبھی جدا نہ ہوتی، کہانی کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا، وہ کہانی جسے میں بار بار پڑھنے کے لیے لوٹتا رہا۔ میرے قارئین دیکھیں گے کہ کتاب کو عصرِ حاضر کی ترکی کے قالب میں ڈھالتے ہوئے میں نے

اس کے اسلوب کی ترتیب کا زعم نہیں کیا ہے: مخطوطے سے، جسے میں ایک میز پر رکھتا، وہ ایک جملے پڑھنے کے بعد میں دوسرے کمرے میں ایک دوسری میز پر جاتا جہاں اپنے کاغذات رکھتا تھا، اور اس تاثر کو جو میرے ذہن میں بچ رہتا آج کے محاورے میں بیان کرنے کی کوشش کرتا۔ کتاب کے عنوان کا انتخاب میں نے نہیں کیا ہے، بلکہ اس اشاعت گھر نے جو اسے طبع کرنے پر راضی ہوا۔ شروع میں دیے گئے انتساب کو دیکھ کر قارئین شاید یہ پوچھیں کہ اس کی کیا کوئی ذاتی معنویت ہے۔ میرے خیال میں ہر چیز کو ہر دوسری چیز سے مربوط دیکھنا ہمارے زمانے کی لت ہے۔ چونکہ میں نے بھی اس بیماری کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں، اسی لیے اس کہانی کو شائع کر رہا ہوں۔

فاروق دارون اوغلو

Scanned with CamScanner

1

ہم وینس سے نیپلز کی طرف جا رہے تھے کہ ترکی بیڑا نمودار ہوا۔ کل ملا کر ہمارے تین جہاز تھے، لیکن کہرے سے نکلتی ہوئی ان کی کشتیوں کی قطار کا کوئی انت نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے وسان خطا ہو گئے؛ آناً فاناً ہمارے جہاز پر خوف طاری ہو گیا اور افراتفری مچ گئی، اور ہمارے کشتی بان، جو زیادہ تر ترک اور مور (Moors) تھے، خوشی سے چلانے لگے۔ ہمارے جہاز نے اپنے مستک کا رخ زمین کی طرف، مغرب کی طرف موڑ لیا، جیسے بقیہ دونوں نے، لیکن ان کے برخلاف، ہمارے جہاز کی رفتار میں تیزی نہ آ سکی۔ ہمارا کپتان، اس بات سے خوفزدہ کہ پکڑے جانے پر کہیں عقوبت کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے، قیدیوں پر، جو کشتی کھے رہے تھے، کوڑے برسانے کا حکم نہ دے سکا۔ بعد کے سالوں میں مجھے اکثر یہ خیال آیا کہ بزدلی کے اس لمحے نے میری پوری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔

لیکن اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہمارا کپتان خوف سے اچانک مغلوب نہ بھی ہوا ہوتا تو بھی میری زندگی بدل جاتی۔ بیشتر لوگ اس کے معتقد ہیں کہ کوئی زندگی بھی پیشگی متعین نہیں ہوتی، کہ تمام کہانیاں بنیادی طور پر اتفاقات کا ایک سلسلہ ہوتی ہیں۔ تاہم، وہ بھی جو اس پر اعتقاد رکھتے ہیں، جب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ واقعات جنھیں انھوں نے اتفاق سمجھا تھا اصلاً ناگزیر تھے۔ میں اس لمحے اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوں، اس وقت جب میں ایک پرانی میز کے پاس بیٹھا اپنی کتاب لکھ رہا ہوں، چشمِ تصور سے بھوت پریتوں کی طرح کہرے سے ابھرتی ہوئی ترکی کشتیوں کے رنگوں کو دیکھتا ہوں: یہ قصہ سنانے کا بہترین وقت معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے کپتان کی یہ دیکھ کر ڈھارس بندھی کہ بقیہ دو کشتیاں ترکی کشتیوں سے بچ نکل کر کہرے میں غائب ہو گئی ہیں، اور بالآخر اس نے کشتی رانوں کی زدوکوب کی جرأت کر ڈالی، لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ایک بار جب آزادی کا جوش ان میں مشتعل ہو گیا تھا، کوڑوں کی کوئی مار بھی غلاموں کو اطاعت گزاری پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ دھند کی حوصلہ شکن دیوار کو رنگ برنگے لہریوں میں کاٹتی ہوئی، دس سے بیش ترکی کشتیاں اچانک ہم پر آ دھمکیں۔ انجام کار، اب جا کر ہمارے کپتان نے مقابلہ کرنے

Scanned with CamScanner

کا فیصلہ کیا، اس بات کی کوشش کہ غنیم کو نہیں، بلکہ میرا خیال ہے خود اپنے خوف اور ندامت کو مغلوب کر سکے؛ اس نے غلاموں پر نہایت بے رحمی سے کوڑے برسوائے اور توپوں کو تیار رکھنے کا حکم دیا، لیکن جنگ کا جذبہ، جس کو مہمیز کرنے میں اتنی تاخیر ہوئی تھی، اتنی ہی زود رفتاری سے بجھ بھی گیا۔ ہم گولا بارود کی تابڑ توڑ یورش میں آ گئے — اگر ہم نے فوری ہتھیار نہیں ڈال دیے تو ہماری کشتی کا غرقاب ہونا یقینی تھا — ہم نے سپر اندازی کا سفید جھنڈا بلند کر دیا۔

جب ہم پُرسکون سمندر پر ترکی کشتیوں کے ہمارے پہلو بہ پہلو آ جانے کا انتظار کر رہے تھے، میں اپنی کیبن میں آیا کہ اپنی چیزوں کو ٹھیک سے رکھوں، گویا اپنے جانی دشمنوں کا نہیں، جو میری پوری زندگی بدل کر رکھ دیں گے، بلکہ چند دوستوں کی آمد کا متوقع ہوں، اور اپنا چھوٹا سا صندوق کھول کر، خیالات میں گم، اپنی کتابوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، جس کی میں نے فلورنس میں بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے: مجھے تیز چیخوں، تیزی سے آتے جاتے قدموں، اور باہر ایک مسلسل غل غپاڑے کی آواز سنائی دی۔ مجھے معلوم تھا کہ کوئی دم جاتا ہے کہ کتاب میرے ہاتھوں سے جھپٹ لی جائے گی، تاہم میں اس کی بابت نہیں سوچنا چاہتا تھا بلکہ اس کے اوراق پر جو تحریر تھا اس کی بابت۔ ایسا تھا گویا اس کتاب میں جو خیالات، جملے، مساواتِ جبریہ [اکویشنز] تھیں ان میں میری پوری گزشتہ زندگی سمائی ہوئی تھی جس کو کھو دینے سے مجھے خوف آ رہا تھا؛ دریں اثنا، میں زیرِ لب اِدھر اُدھر سے جملے پڑھتا رہا، جیسے دعا مانگ رہا ہوں۔ مجھے بڑی شدید خواہش ہو رہی تھی کہ پوری کتاب کو اپنے حافظے پر کندہ کر لوں تاکہ جب وہ آئیں تو میں ان کے بارے میں نہ سوچوں، اور نہ ان مصائب کے بارے میں جو وہ مجھ پر توڑیں گے، بلکہ اپنے ماضی کے رنگوں کو یاد کروں، جیسے کسی کتاب کے بہت ہی مرغوب الفاظ کی بازخوانی کر رہا ہوں جنھیں میں نے شوق سے ازبر کیا ہو۔

اُن دنوں میں ایک مختلف آدمی ہوا کرتا تھا، حتیٰ کہ ماں، منگیتر، اور دوست مجھے ایک مختلف نام سے پکارتے تھے۔ اب بھی کبھی کبھار میں اپنے خوابوں میں اس آدمی کو دیکھتا ہوں جو میں ہوا کرتا تھا، اور جو، جیسا کہ اب میرا اعتقاد ہے، میں تھا، اور پسینے میں شرابور حالت میں بیدار ہوتا ہوں۔ یہ شخص جو ذہن میں اب اُڑے ہوئے رنگوں کا خیال لاتا ہے، ان سرزمینوں کے خواب صفت رنگ جو کبھی تھیں ہی نہیں، چرند پرند جن کا سرے سے کبھی وجود تھا ہی نہیں، وہ ناقابلِ یقین ہتھیار جو ہم نے آگے چل کر

Scanned with CamScanner

سال بہ سال ایجاد کیے، تب تیئیس سال کا تھا، اس نے فلورینس اور وینس میں "سائنس اور آرٹ" کا مطالعہ کیا تھا، یہ فرض کرتا تھا کہ اجرام فلکی، ریاضی، طبیعیات، اور پینٹنگ کے بارے میں کسی قدر علم رکھتا ہے۔ یقینی بات ہے، وہ مغرور تھا۔ جو کچھ بھی اس کے وقتوں سے پہلے انجام دیا جا چکا تھا اس کو ہڑپ کر چکنے کے بعد ہر چیز پر ناک بھوں چڑھاتا تھا؛ اسے ذرا بھی شک نہ تھا کہ وہ یہ سب بہتر طور پر کر سکتا ہے؛ اس کا کوئی ہمسر نہیں؛ اسے معلوم تھا کہ وہ ہر کسی کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور مولک ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک معمولی سا جوان تھا۔ جب مجھے اپنے واسطے ایک ماضی ایجاد کرنا پڑتا ہے، یہ سوچ کر تکلیف ہوتی ہے کہ یہ جوان آدمی جو اپنی محبوبہ سے اپنے جذبوں، اپنے منصوبوں، دنیا اور سائنس کے بارے میں گفتگو کرتا تھا، جسے یہ بالکل فطری معلوم ہوتا تھا کہ اس کی منگیتر اس کی شیدائی ہے، درحقیقت وہ میں ہی تھا۔ لیکن مجھے اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ جو میں یہاں رقم کر رہا ہوں ایک دن معدودِ چند لوگ اسے صبر و تحمل سے آخر تک پڑھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ وہ جوان آدمی مَیں نہیں تھا۔ اور شاید وہ باصبر قاری یہ سوچیں، جیسا کہ اب میں سوچتا ہوں، کہ اس جوان کی کہانی، جس نے اپنی نایاب کتابیں پڑھنے میں اپنی زندگی گنوا دی، بعد میں اس مقام سے جہاں وہ منقطع ہو گئی تھی، جاری ہو گئی۔

جب ترکی کشتی بانوں نے اپنی متحرک سیڑھیاں نیچے ڈالیں اور ہماری کشتی کے عرشے پر چڑھ آئے، میں نے اپنی کتابوں کو اپنے صندوق میں ڈالا اور باہر جھانکنے لگا۔ ہماری کشتی پر خاصی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وہ سبھوں کو عرشے پر جمع کر رہے تھے اور کپڑوں سے الف ننگا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ اس گڑبڑ میں میں چاہوں تو پانی میں چھلانگ لگا سکتا ہوں، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ وہ مجھے پانی ہی میں گولی مار دیں گے، یا پکڑ لیں گے اور فوراً مار ڈالیں گے، اور، بہرکیف، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم زمین سے کتنے قریب ہیں۔ شروع شروع میں کسی نے مجھ سے کوئی بازپرس نہیں کی۔ مسلمان غلام، جن کی زنجیریں ڈھیلی کر دی گئی تھیں، خوشی کے مارے چلا رہے تھے، اور ان کی یک ٹولی ان لوگوں سے جنھوں نے انھیں کوڑے مارے تھے، فوراً انتقام لینے کی فکر میں لگ گئی۔ جلد ہی انھوں نے مجھے میری کیبن میں پایا۔ اندر آئے، اور میرے اثاثے کی تلاشی لے ڈالی۔ سونے کی تلاش میں میرے صندوقوں کو مقفل یا قفل کر کے رکھ دیا، اور جب میری چند کتابیں اور سارے کپڑے لے لیے، کسی نے مجھے دبوچ لیا، جبکہ میں خالی الذہنی سے دو ایک بچی ہوئی کتابوں کے مطالعے میں غرق تھا، اور کپتانوں میں سے

Scanned with CamScanner

ایک کے پاس لائے۔

یہ کپتان، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، جینوا کا رہنے والا تھا جس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا، تو اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ اس نے میرا پیشہ پوچھا۔ چپو چلانے سے باز رہنے کی خاطر میں نے جھٹ اعلان کر دیا کہ اجرام فلکی اور رات میں کشتی رانی کے راستوں کا علم رکھتا ہوں، لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر میں نے تشریح الابدان کی کتاب پر بھروسا کرتے ہوئے جو انھوں نے میرے پاس چھوڑ دی تھی، یہ دعویٰ کیا کہ ڈاکٹر ہوں۔ جب مجھے ایک آدمی دکھایا گیا جس کا ایک بازو نہیں رہا تھا، تو میں نے احتجاج کیا کہ میں جراح نہیں ہوں۔ اس پر انھیں غصہ آ گیا، اور وہ مجھے چپو چلانے پر لگانے ہی والے تھے کہ کپتان نے، میری کتابیں دیکھ کر، پوچھا کہ کیا میں پیشاب اور نبض کے بارے میں بھی کچھ جانتا ہوں۔ جب میں نے کہا کہ ہاں، تو میری چپوؤں سے جاں بخشی ہو گئی اور اپنی چند اور کتابوں کی بازیابی میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن اس رعایت کی مجھے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ دوسرے عیسائی، جو چپو چلانے پر لگائے گئے تھے، فوراً مجھے قابل نفرین سمجھنے لگے۔ اگر ان کا بس چلتا تو مجھے جہاز کے نچلے خانے [ہولڈ] میں، جہاں ہمیں رات کے وقت بند کر دیا جاتا تھا، مروا ڈالتے، لیکن خوف کے مارے باز رہے، کیونکہ میں نے پلک جھپکتے ہی میں ترکوں سے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ ہمارا بزدل کپتان ابھی ابھی سولی پر اپنی جان سے جاتا رہا تھا، اور انتباہ کے طور پر غلاموں پر کوڑے برسانے والے جہازرانوں کے ناک کان کاٹ دیے گئے تھے پھر انھیں رافٹ پر اتار کر سمندر میں بہا دیا گیا تھا۔ چند ترکوں کا علاج کرنے کے بعد، جس میں میں نے اپنی عقل سلیم سے کام لیا تھا، نہ کہ علم تشریح الابدان سے، اور ان کے زخم بھی از خود مندمل ہو گئے تھے، ہر کوئی مجھے ڈاکٹر سمجھنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ وہ بھی جنھوں نے حسد کے مارے ترکوں کو بتا دیا تھا کہ میں ڈاکٹر واکٹر نہیں ہوں، رات کو ہولڈ میں مجھے اپنے زخم دکھانے لگے۔

ہم بڑی دھوم دھام کے ہجوم میں استنبول میں داخل ہوئے۔ یہ کہا گیا کہ طفل سلطان جشن کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ انھوں نے اپنے علم ہر مستول پر بلند کیے اور ان کے زیریں حصے میں ہمارے جھنڈے، کنواری مریم کی شبیہیں، اور صلیبیں سر کے بل، ڈال دیں تاکہ شہر کے گرم خو، جو عرشے پر چڑھ آئے تھے، ان پر چاندماری کریں۔ توپ کے گولے سارے آسمان پر پھٹ پڑے۔ یہ تقریب، ایسی

Scanned with CamScanner

بہت سی دوسری تقریبوں کی طرح جن کا آنے والے سالوں میں میں زمین سے اداسی، تنفر، اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مشاہدہ کرنے والا تھا، اتنی دیر تک جاری رہی کہ بہت سے تماش بین سورج کی تمازت کے باعث بے ہوش ہو گئے۔ کہیں شام کے قریب ہم قاسم پاشا میں لنگر انداز ہوئے۔
سلطان کی خدمت میں پیش کرنے سے قبل ہمیں زنجیریں لگا دی گئیں، ہمارے فوجیوں کو ان کی زرہ بکتر تمسخر کے واسطے الٹی پہنوائی، ہمارے افسروں کی گردنوں کے گرد لوہے کے طوق ڈالے، اور زور زور سے بھونپو [ہورن] اور ترچیاں [ٹرمپٹس] بجاتے ہوئے، جو انھوں نے ہمارے جہازوں سے ہتھیائی تھیں، ادھم مچاتے ہوئے، فتح مندی کے ساتھ، ہمیں محل لائے۔ شہر کے لوگ شاہراہوں پر قطار بنائے کھڑے ہمیں تفریح اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ سلطان نے، جو ہماری نگاہ سے اوجھل تھا، اپنے حصے کے غلام چنے اور انھیں دوسروں سے الگ کروا دیا۔ وہ ہمیں گولڈن ہورن پار کرا کر بلّی کھینے والی کشتیوں [کایاک] میں گھسا لائے اور صادق پاشا جیل خانے میں ٹھونس دیا۔

بندی خانہ بڑی تکلیف دہ جگہ تھی۔ تنگ سی مرطوب کوٹھڑیوں کی غلاظت میں سینکڑوں قیدی پڑے سڑ رہے تھے۔ مجھے وہاں بے شمار لوگ ملے جن پر میں اپنا نیا پیشہ آزما سکتا تھا، اور میں نے ان میں سے چند کو صحت یاب بھی کر دیا۔ ان چوکیداروں کے واسطے، جو کمر یا ٹانگوں کے درد کے شاکی تھے، نسخے بھی لکھے۔ چنانچہ یہاں بھی میرے ساتھ بقیوں سے مختلف سلوک کیا گیا، مجھے بہتر کوٹھڑی دی گئی جس میں سورج کی روشنی پہنچتی تھی۔ دوسروں پر جو گزر رہی تھی اسے دیکھ کر میں نے اپنی صورت حال پر شکر ادا کرنے کی کوشش کی، لیکن ایک صبح دوسرے قیدیوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اٹھا دیا گیا اور بتایا گیا کہ باہر کام کرنے کے واسطے لے جایا جاؤں گا۔ میں نے جب احتجاج کیا کہ ڈاکٹر ہوں، جسے سائنس اور طب کا علم آتا ہے، تو وہ ہنسنے لگے پاشا کے باغ کے گرد دیواریں بنائی جانے والی تھیں جس کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ ہر صبح طلوع آفتاب سے پہلے ہمیں زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا جاتا اور شہر کے باہر لے جایا جاتا۔ سارا دن پتھر چننے کے بعد جب شام کو، ابھی تک زنجیروں سے ساتھ ساتھ جڑے، ہم لشتم پشتم اپنے قید خانے لوٹتے، میں غور کرتا کہ استنبول واقعی ایک خوبصورت شہر ہے، لیکن یہاں آدمی کو آقا، نہ کہ غلام، ہونا چاہیے۔

اس کے باوجود میں کوئی معمولی غلام نہیں تھا۔ لوگوں تک یہ بات پہنچ گئی تھی کہ میں معالج ہوں،

Scanned with CamScanner

چنانچہ اب میں صرف قید میں سڑتے غلاموں ہی کی نہیں بلکہ اوروں کی بھی دیکھ ریکھ کر رہا تھا۔ علاج سے جو معاوضہ ملتا تھا اس کا ایک بڑا حصہ مجھے چوکیداروں کو دینا پڑتا جو مجھے خفیہ طور پر باہر نکال لاتے تھے۔ وہ رقم جو میں ان سے چھپانے میں کامیاب ہو جاتا، اسے میں ترکی زبان سیکھنے پر خرچ کرتا تھا۔ میرا معلم ایک خوشگوار، عمر رسیدہ آدمی تھا جس کے ذمے پاشا کے چھوٹے موٹے کاموں کی نگہداشت تھی۔ اسے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی تھی کہ میں ترکی زبان سیکھنے میں کافی چست تھا، اور وہ یہ بھی کہتا کہ میں جلد ہی مسلمان ہو جاؤں گا۔ مجھے ہر سبق کے بعد پڑھانے کا معاوضہ قبول کرنے کے لیے اس کو باقاعدہ مجبور کرنا پڑتا تھا۔ میں اسے اپنے واسطے کھانا لانے کے لیے بھی پیسے دیتا، کیونکہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی پوری دیکھ بھال کروں گا۔

ایک کہر آلود شام ایک افسر میری کوٹھڑی میں آیا اور کہا کہ پاشا مجھ سے ملنے کا خواہشمند ہے۔ متعجب اور ہیجان زدہ، میں فوراً تیار ہو گیا۔ میں نے خیال کیا، ہو نہ ہو پیچھے گھر میں میرے کسی باوسائل رشتے دار نے، شاید میرے باپ، شاید میرے مستقبل خسر نے، میرا تاوان ادا کرنے کے واسطے رقم بھیجی ہے۔ دھند میں پیچ کھاتی، تنگ سی گلیوں سے ہو کر گزرتے ہوئے مجھے یہ لگا کہ اچانک اتفاقیہ اپنا گھر نظر آ جائے گا یا اپنے پیاروں کے بالکل سامنے پہنچ جاؤں گا جیسے کسی خواب سے بیدار ہو رہا ہوں۔ شاید وہ میری رہائی کی گفت و شنید کے واسطے کسی کو بھیجنے میں کامیاب ہو گئے تھے، شاید آج رات ہی اسی دھند میں مجھے ایک جہاز پر سوار کر کے گھر روانہ کر دیا جائے گا۔ جب میں پاشا کی حویلی میں داخل ہو تبھی مجھ پر واضح ہوا کہ میرا آزاد ہونا اتنا آسان نہیں۔ لوگ یہاں پنجوں کے بل چل رہے تھے۔

پہلے وہ مجھے ایک لمبی سی راہداری میں لائے جہاں مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑا جب تک کہ مجھے ایک کمرے میں نہیں لے جایا گیا۔ ایک چھوٹے سے دیوان پر کمل کے نیچے ایک مختصر سا خوش اخلاق آدمی پسرا ہوا تھا۔ ایک اور آدمی، بڑا ہٹا کٹا، اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ پسرا ہوا آدمی پاشا تھا، جس نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے باتیں کیں۔ اس نے مجھ سے کئی سوال کیے۔ میں نے بتایا کہ میرے مطالعے کے اصلی موضوعات فلکیات، ریاضی، اور ان سے کم تر درجے پر، انجینئری رہے ہیں، لیکن مجھے طب کا علم بھی ہے اور میں نے بہت سے مریضوں کا علاج کیا ہے۔ وہ مجھ سے سوالات کرتا رہے اور میں اس کو کچھ اور بتانے ہی والا تھا کہ اس نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر میں نے ترکی اتنی سرعت سے

Scanned with CamScanner

سیکھ لی ہے تو یقیناً ذہین آدمی ہوں گا، یہ اضافہ کیا کہ اسے کوئی بیماری ہے جس کا علاج آور ڈاکٹروں میں سے کوئی بھی نہیں کر سکا ہے، اور کہ میرے بارے میں سن کر، وہ میری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔

اس نے اپنے عارضے کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گیا کہ عوام الناس کے اس پاشا کو جو بیماری لاحق ہے روئے زمین پر نایاب ترین ہے، کیونکہ اس کے دشمنوں نے افترا پردازی سے خدا کو دھوکا دیا ہے۔ لیکن اس کو صرف ہانپنے کا عارضہ تھا۔ میں نے اس سے تفصیلی سوال کیے، اس کی کھانسی کا معائنہ کیا، پھر باورچی خانے میں جا کر جو کچھ بھی ہاتھ لگا اس سے پودینے کی مہک والی گولیاں تیار کیں۔ میں نے کھانسی کے واسطے راب [سیرپ] بھی تیار کیا۔ چونکہ پاشا کو زہر دیے جانے کا خطرہ رہتا تھا، میں نے اس کے سامنے خود ایک قرص شربت کے ایک گھونٹ کے ساتھ نگلی۔ اس نے مجھے حویلی سے خفیہ طور پر نکلنے کی، غایت درجے کی احتیاط سے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، اور قید خانے لوٹنے کی ہدایت کی۔ افسر نے بعد میں بتایا کہ پاشا نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے ڈاکٹروں کے رشک کو ہوا دے۔ اگلے دن میں واپس لوٹا، اس کی کھانسی کی آواز سنی، اور دوبارہ وہی دوا دی۔ ان رنگین گولیوں سے جو میں نے اس کی ہتھیلی پر رکھ دی تھیں، وہ اتنا ہی خوش ہوا جتنا ایک بچہ ہوتا ہے۔ اپنی کال کوٹھڑی کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے دعا کی کہ وہ صحت یاب ہو جائے۔ اگلے روز باد شمالی چل رہی تھی۔ یہ ایک آہستہ رو، خنک ہوا تھی اور مجھے خیال آیا کہ اس موسم میں کوئی شخص بھی رو بصحت ہو سکتا ہے، چاہے ایسا اس کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، لیکن کوئی خبر نہ ہوئی۔

ایک ماہ بعد جب مجھے بلایا گیا، ایک بار پھر بیچ رات میں، پاشا اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا اور بشاش تھا۔ جب اس نے چند لوگوں کو ڈانٹا ڈپٹا، تو میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ اسے سانس لینے میں دقت نہیں محسوس ہو رہی۔ مجھے دیکھ کر اسے مسرت ہوئی، بولا کہ اس کی بیماری جاتی رہی ہے، اور کہ میں اچھا ڈاکٹر ہوں۔ میں اس سے کس نوازش کا خواستگار ہوں؟ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے یکدم آزاد نہیں کرے گا اور گھر نہیں جانے دے گا۔ چنانچہ میں نے اپنی کوٹھڑی کی شکایت کی، اور جیل خانے کی؛ بیان کیا کہ بلاوجہ شدید مشقت سے مجھے نڈھال کیا جا رہا ہے درانحال کہ اگر مجھے فلکیات اور ادویہ کا شغل کرنے دیا جائے تو اس سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مجھے پتا نہیں کہ اس نے اس میں کا کتنا حصہ سنا۔ اس نے پیسوں سے بھری جو تھیلی مجھے دی اس کا بڑا حصہ چوکیداروں نے دھر والیا۔

Scanned with CamScanner

ہفتہ بھر بعد ایک افسر رات کے وقت میری کوٹھڑی میں آیا اور یہ قسم لے لینے کے بعد کہ میں فرار نہیں ہوں گا، میری زنجیریں علاحدہ کر دیں۔ مجھے دوبارہ باہر کام پر لے جایا جانے لگا، لیکن اب غلاموں کے کاموں کے نگراں میرے ساتھ ترجیحی برتاؤ کرنے لگے۔ تین دن بعد افسر میرے واسطے نئے کپڑے لایا اور مجھے احساس ہوا کہ اب میں پاشا کی امان میں ہوں۔

اب بھی مجھے مختلف حویلیوں میں رات کے وقت بلا بھیجا جاتا تھا۔ میں بحری قزاقوں کی، جو گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہوتے، دوادارو کرتا، اور پیٹ کے درد کے شاکی نوجوان فوجیوں کی۔ خارش زدوں کی فصد کھولتا، یا ان کی جن کا رنگ اُڑ گیا ہوتا یا جو سر درد میں مبتلا ہوتے۔ ایک بار، ایک خادم کے ہکلاتے بیٹے کو دوائی شربت پلایا تو ہفتے بھر بعد وہ صحت یاب ہو گیا اور مجھ پر نظم لکھ کر سنائی۔

سردیاں اسی طرح گزر گئیں۔ بہار کی آمد پر میں نے سنا کہ پاشا، جس نے ایک مہینے تک مجھے نہیں پوچھا تھا، جنگی بیڑے کے ساتھ بحیرۂ روم پر گیا ہوا ہے۔ گرما کے کھولتے ہوئے دنوں میں جب لوگوں نے مجھے نامراد و مایوس دیکھا تو کہا کہ شکایت کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں، کیونکہ بحیثیت ڈاکٹر میری اچھی خاصی کمائی ہو جاتی ہے۔ ایک سابقہ غلام نے جو کافی سالوں پہلے مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا مجھے یہ نصیحت کی کہ فرار نہ ہوں۔ یہ لوگ ہمیشہ ہی ایک ایسے غلام رکھنے کے عادی تھے، جیسے کہ انھوں نے مجھے رکھا ہوا تھا، جو ان کے لیے کارآمد ہو، جسے وہ کبھی بھی اپنے ملک لوٹنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اگر میں اسلام لے آؤں، جیسے وہ لے آیا ہے، تو پھر میں آزادی ہو سکتا ہوں، اس سے بیش نہیں۔ چونکہ مجھے یہ خیال آیا کہ اس نے یہ بات میری ٹوہ لینے کی خاطر کہی ہو، میں نے اسے متنبہ کر دیا کہ میری بھاگنے کی بالکل کوئی نیت نہیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ مجھ میں خواہش کا فقدان تھا، بلکہ ہمت کا۔ وہ سب کے سب، جو مفرور ہوئے تھے، زیادہ دور نہیں جانے پائے تھے کہ دوبارہ پکڑ لیے گئے تھے۔ جب ان بدبختوں کی خوب زدوکوب ہو چکی تو میں نے ہی رات کو ان کی کوٹھڑیوں میں ان کے زخموں پر مرہم لگایا۔

خزاں کے قریب آتے آتے، پاشا بیڑے کے ساتھ لوٹا۔ اس نے توپوں کے گولوں سے سلطان کا خیر مقدم کیا، شہر کو شادماں کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ اس نے سال گزشتہ کیا تھا، لیکن یہ عیاں تھا کہ انھوں نے یہ موسم عافیت میں بالکل نہیں گزارا۔ وہ صرف چند ہی غلام جیل خانے میں لائے تھے۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اہل وینس نے چھ کشتیوں کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ کھری کی خبر حاصل کرنے کے

لیے میں غلاموں سے، جن میں زیادہ تر ہسپانوی تھے، گفتگو کرنے کے موقعے کی کھوج میں لگ گیا؛ لیکن وہ خاموش، بے خبر، ڈرپوک مخلوق ثابت ہوئے جنھیں سوائے مدد یا خوراک مانگنے کے علاوہ کوئی اور بات کرنے کی چنداں خواہش نہ تھی۔ ان میں صرف ایک ہی ایسا تھا جس میں مجھے دلچسپی پیدا ہو سکی: اس کا ایک بازو جاتا رہا تھا، لیکن اس نے رجائی انداز میں بتایا کہ اس کے پرکھوں میں سے ایک اسی قبیل کے سوئے اتفاق کے تجربے سے گزر کر اپنے باقی ماندہ ہاتھ سے شوالری کا رومانس رقم کرنے کے واسطے باقی بچ رہا تھا۔ اور خود اس کو یقین تھا کہ ایسا ہی کارنامہ سرانجام دینے کے لیے اس کی جاں بخشی بھی ہو جائے گی۔ آئندہ آنے والے برسوں میں، جب میں نے زندہ رہنے کے لیے کہانیاں تحریر کیں، میں نے اس آدمی کو یاد کیا جس نے کہانیاں لکھنے کی خاطر زندہ رہنے کا خواب دیکھا۔ اس کے کچھ ہی بعد جیل خانے میں چھوت کی بیماری پھیل گئی، ایک منحوس وبا جس کے گزرنے سے پہلے آدھے سے زیادہ غلام کھیت رہے، اور جس سے دامن بچانے کی خاطر میں نے چوکیداروں کو رشوتوں سے لاد دیا۔

جو زندہ بچ رہے تھے انھیں نئے منصوبوں پر کام کرنے لیجایا گیا۔ میں نہیں گیا۔ شام کو وہ بتاتے کہ کس طرح وہ گولڈن ہورن کے بالکل سرے تک گئے، جہاں بڑھئیوں، گاہکوں، پینٹرز کی نگرانی میں انھیں مختلف کاموں پر لگایا گیا۔ وہ کاغذ کی لگدی [papier mâché] کے ماڈل —— جہاز، قلعے، برج —— بنا رہے تھے۔ بعدازاں، ہمیں اس کا سبب معلوم ہوا: پاشا کا بیٹا وزیر اعلیٰ کی بیٹی سے شادی کرنے والا تھا اور وہ ایک بڑی دیدنی تقریبِ شادی کا اہتمام کر رہا تھا۔

ایک صبح مجھے پاشا کی حویلی بلایا گیا، میں گیا، یہ سوچتے ہوئے کہ اس کی پرانی ہانپنے کی بیماری لوٹ آئی ہے۔ پاشا مصروف تھا، اور مجھے ایک کمرے میں انتظار کرنے کے لیے بھیج دیا گیا، میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد ایک اور دروازہ کھلا اور کوئی شخص، مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال بڑا، اندر آیا۔ میں نے اوپر اس کے چہرے پر اچنبھے کے عالم میں دیکھا —— حیرت کے مارے فوراً میری سٹی گم ہو گئی۔

۲

میرے اور کمرے میں داخل ہونے والے شخص کے درمیان حیرت انگیز مشابہت تھی! یہ میں ہوں... اس ثانیے میں نے یہی خیال کیا تھا۔ یوں محسوس ہوا گویا کوئی میرے ساتھ چال چل رہا ہو اور

جس دروازے سے میں پہلے داخل ہوا تھا، اس کے مقابل دروازے سے مجھے دوبارہ اندر لایا ہو، یہ کہتے ہوئے کہ دیکھو تمھیں حقیقت میں ایسا ہی ہونا چاہیے، تمھیں دروازے سے اس طرح اندر داخل ہونا چاہیے، اپنے ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کرنا چاہیے، کمرے میں بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی کو تمھیں اس طرح دیکھنا چاہیے۔ آنکھیں چار ہوتے ہی ہم نے ایک دوسرے کو سلام علیک کی۔ لیکن وہ متحیر نہیں نظر آ رہا تھا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھ سے بہت زیادہ مشابہت نہیں رکھتا ہے، اس کے داڑھی تھی؛ اور مجھے لگا کہ میں خود اپنے چہرے کے خد و خال بھول گیا ہوں۔ جب وہ میرے مقابل بیٹھ رہا تھا، مجھے احساس ہوا کہ آئینے میں آخری بار اپنا چہرہ دیکھے مجھے ایک سال ہو گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دروازہ کھلا جس سے میں داخل ہوا تھا اور اسے اندر بلایا گیا۔ انتظار کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہ سب میرے پراگندہ ذہن کی کارستانی تھی نہ کہ ہوشیاری سے تیار کیا ہوا کوئی مذاق۔ کیونکہ میں اس زمانے میں ہمیشہ یہی خیالی پلاؤ پکاتا رہتا تھا کہ میں گھر واپس جاؤں گا، سب میرا استقبال کریں گے، کہ وہ مجھے فوراً رہا کردیں گے، کہ فی الواقع میں اپنے جہاز کی کیبن میں ہنوز محو خواب ہوں، یہ سب بس ایک خواب ہے۔ ایک طرح کے دل کو دلاسا دینے والے خیالی منظر۔ میں یہ نتیجہ نکالنے ہی والا تھا کہ یہ بھی انھیں جیسا دن سپنا ہے، لیکن وہ جو حقیقت میں تبدیل ہو گیا ہو، یا یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہر چیز آناً فاناً بدل جائے گی اور اپنی پرانی حالت پر پہنچ جائے گی، ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا اور مجھے اندر آنے کی اجازت ملی۔

پاشا ایستادہ تھا، میرے ہم شبیہ کے ذرا پیچھے۔ اس نے مجھے اپنی عبا کے کنارے پر بوسہ دینے دیا، اور میں نے یہ قصد کیا کہ جب وہ میری خیر خیریت پوچھے گا، میں اپنی کوٹھڑی کی صعوبتوں کا حال بتا دوں گا، کہوں گا کہ میں اپنے وطن لوٹنا چاہتا ہوں، لیکن وہ تو سن ہی نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا پاشا کو یاد تھا کہ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں سائنس، فلکیات، انجینئری کا علم رکھتا ہوں — تو کیا آسمان پر اچھالی جانے والی آتش بازیوں کے بارے میں بھی مجھے کچھ آتا ہے، بارود کے بارے میں؟ میں نے فوراً کہہ دیا کہ ہاں، لیکن جس لمحے میری آنکھیں دوسرے آدمی کی آنکھوں سے چار ہوئیں مجھے شک گزرا کہ یہ لوگ میرے واسطے کہیں کوئی دام نہ بچھا رہے ہوں۔

پاشا بتا رہا تھا کہ شادی کی تقریب کا جو منصوبہ بنا رہا ہے، وہ لاثانی ہوگا، اور آتش بازی کا تماشا

Scanned with CamScanner

کروائے گا، لیکن ایسا کہ بے نظیر ہو۔ میرے ہم شبیہ نے، جسے پاشا "خوجہ،" یعنی "آقا،" کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، ماضی میں، سلطان کی ولادت کے موقعے پر، آتش خوروں کے ایک تماشے پر کام کیا تھا جس کا اہتمام مالٹا کے ایک باشندے نے کیا تھا جو اب مر چکا ہے، چنانچہ اسے ان چیزوں کے بارے میں تھوڑا بہت علم ہے، لیکن پاشا کا خیال تھا کہ میں اس کا معاون بن سکوں گا — ہم ایک دوسرے کی تکمیل کر سکیں گے۔ اگر ہم نے اچھا تماشا پیش کیا تو پاشا ہمیں انعام دے گا۔ جب، یہ سوچ کر کہ مناسب وقت آ گیا ہے، میں نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ میری تو بس گھر لوٹنے کی خواہش ہے، پاشا نے مجھ سے پوچھا کہ یہاں آنے کے بعد سے چکلے کی زیارت بھی کی ہے، اور میرا جواب سن کر کہا کہ اگر مجھے عورت کی خواہش نہیں تو آزادی حاصل کر کے میرا کیا بھلا ہوگا؟ وہ چوکیداروں کی سی غیر شائستہ زبان استعمال کر رہا تھا اور میں ضرور ہکا بکا نظر آ رہا ہوں گا، کیونکہ اس نے خوب دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ پھر وہ اس بھوت کی طرف متوجہ ہوا جسے "خوجہ" کہہ کر پکارتا تھا: ساری ذمےداری اس کی تھی۔ ہم لوٹ گئے۔

صبح کو جب میں اپنے ہم شبیہ کی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا مجھے خیال آیا کہ میرے پاس اسے سکھانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کا علم بھی میرے علم سے زیادہ نہیں تھا۔ مزید برآں، ہم اس بات پر متفق تھے: سارا مسئلہ صحیح کافوری مرکب کی دریافت کا ہے۔ چنانچہ ہمارا کام یہ ہوگا کہ ناپ تول کر احتیاط سے تجرباتی مرکب تیار کریں، رات کو شہر کے پاس شہر کی بلند فصیلوں کے سائے میں انھیں داغیں، اور جو مشاہدے میں آئے اس سے نتیجے اخذ کریں۔ بچے ہیبت زدہ ہو کر ہمارے کارندوں کو وہ راکٹ چھوڑتے ہوئے دیکھتے جو ہم نے تیار کیے ہوتے، اور ہم تاریکی میں ڈوبے درختوں کے نیچے کھڑے تشویش کے ساتھ نتیجے کا انتظار کرتے، جیسا کہ ہم برسوں بعد دن کے اجالے میں اُس ناقابلِ یقین ہتھیار کی آزمائش کے وقت کرنے والے تھے۔ ان تجربوں کے بعد، کبھی چاندنی میں، کبھی گھور اندھیرے میں، میں اپنے مشاہدات کو ایک چھوٹی سی نوٹ بک میں رقم کرنے کی کوشش کرتا۔ رات کو جدا ہونے سے پہلے ہم خوجہ کے مکان لوٹتے، جس سے گولڈن ہورن کا منظر دکھائی دیتا تھا، اور بڑی تفصیل سے ان پر بحث کرتے۔

اس کا گھر چھوٹا، دل گھبرا دینے والا، اور دلکشی سے محروم تھا۔ داخلے کا دروازہ ایک بڑی ٹیڑھی میڑھی سڑک پر تھا جو کسی غلیظ چشمے کے بہاؤ سے گدلائی ہوئی تھی، اس چشمے کے مبدأ کا پتا مجھے کبھی نہیں

Scanned with CamScanner

چل سکا۔ اندر، تقریباً کوئی فرنیچر نہیں تھا، اس کے باوجود میں جب بھی اندر آیا، خستگی کے عجیب سے احساس کا دباؤ اور غلبہ ہوا۔ شاید اس کا مرجع اس آدمی کی ذات تھی جو، چونکہ اسے پسند نہیں تھا کہ اس کے دادا کے نام پر اس کا نام رکھا جائے، چاہتا تھا کہ میں اسے "خوجہ" کہہ کر پکاروں: وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ سیکھنے کا خواہش مند ہو، لیکن کیا چیز؟ اس کے بارے میں ابھی تک ڈھل مل یقینی کی کیفیت میں تھا۔ چونکہ میں پستہ قد دیوانوں پر بیٹھنے کا عادی نہ ہو سکا تھا جو دیوار کے سہارے سہارے آراستہ تھے، میں کھڑے کھڑے ہی ہمارے تجربات سے متعلق گفتگو کرتا، بعض اوقات کمرے میں ادھر سے اُدھر تشنج کے عالم میں ٹہلنے لگتا۔ میرا خیال ہے خوجہ کو اس میں لطف آتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے دل بھر کر مجھے دیکھ سکتا تھا، ہر چند کہ لیمپ کی مدھم روشنی ہی میں۔

اس کی نگاہوں کو اپنا تعاقب کرتا دیکھ کر مجھے اس بات سے اور زیادہ بے چینی محسوس ہوتی کہ اس نے ہماری مشابہت پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ایک دو بار مجھے خیال گزرا کہ وہ اس سے واقف ہے لیکن ناواقفیت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ لگتا تھا جیسے مجھ سے اپنا دل بہلا رہا ہو، مجھے کسی چھوٹے موٹے تجربے کا ہدف بنائے ہوئے ہو، وہ معلومات حاصل کر رہا ہو جس سے میں واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان اولین دنوں میں وہ مسلسل میری جانچ پڑتال کرتا، گویا کچھ سیکھ رہا ہو، اور جس قدر زیادہ سیکھتا اسی قدر اس کے تجسس میں اضافہ ہوتا۔ لیکن وہ کچھ اور آگے قدم بڑھا کر اس عجیب و غریب علم کی تہہ میں اتر جانے سے ہچکچاتا ہوا نظر آتا۔ اس کی یہی غیر نتیجہ خیزی تھی جو مجھے کوفت میں مبتلا کر دیتی، جو اس گھر کو اتنا دم گھونٹتا ہوا بنا دیتی: یہ درست ہے کہ اس کی ہچکچاہٹ سے مجھے کسی قدر جرأتمندی حاصل ہوئی، لیکن اس سے میرا تردد دور نہیں ہوا۔ ایک بار، جب ہم اپنے تجربات پر بات کر رہے تھے، اور ایک دوسری بار، جب اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں ابھی تک مسلمان کیوں نہیں ہو، مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے کسی بحث میں خفیہ طور پر الجھانے کی کوشش کر رہا ہو اور اسی لیے میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے میرے گریز کا احساس کر لیا: مجھے لگا کہ اس کی وجہ سے اس کی نظروں میں میری وقعت گھٹ گئی ہے، اور اس سے مجھے غصہ آیا۔ ان دنوں شاید ہمارے پاس ایک دوسرے کو سمجھنے کا یہی طریقہ تھا: ہم میں سے ہر ایک، دوسرے کو کمتر خیال کرتا۔ میں خود کو قابو میں رکھتا، اس خیال سے کہ اگر ہم بغیر کسی سوء اتفاق کے آتش بازی کا تماشا کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ مجھے گھر لوٹنے کی اجازت دے دیں گے۔

Scanned with CamScanner

ایک رات، ایک راکٹ کے غیر معمولی بلندی تک پہنچنے پر شاداں، خوجہ نے کہا کہ وہ ایک دن ایسا راکٹ بنا سکے گا جو چاند تک بلند ہو سکے؛ سارا مسئلہ بارود کی صحیح مقدار کی دریافت کا تھا اور ایسے خانے کی ایجاد کا جو اس مرکب کو برداشت کرنے کا متحمل ہو سکے۔ میں نے توجہ دلائی کہ چاند بہت دوری پر واقع ہے، لیکن اس نے میری بات کاٹ کر کہا کہ یہ بات اسے بھی اتنی ہی معلوم ہے جتنی مجھے، لیکن کیا یہ زمین سے قریب ترین سیارہ نہیں تھا؟ جب میں نے اس کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا تو میری توقع کے خلاف اس سے اس کی تالیفِ قلبی نہ ہوئی بلکہ کچھ اور مضطرب ہو گیا، تاہم مزید کچھ نہیں بولا۔

دو دن بعد، آدھی رات کے وقت، اس نے دوبارہ سوال اٹھایا: مجھے چاند کے قریب ترین سیارہ ہونے پر آخر کیوں اتنا یقین ہے؟ ہو سکتا ہے ہم اپنے فریبِ نظر کا شکار ہوں۔ تبھی میں نے اس سے پہلی بار اپنے فلکیات کے مطالعے کا ذکر کیا اور بطلیموس [ٹولے می] کی عالمِ سماوی کی ہیئت [کاسموگرافی] کے بنیادی اصولوں کی بھی مختصراً تشریح کر دی۔ میں نے دیکھا کہ وہ توجہ سے سن رہا ہے، لیکن کچھ کہنے سے ہچکچا رہا ہے جو اس کے تجسس کی غمازی کرے۔ کچھ دیر بعد، جب میں خاموش ہو گیا، اس نے کہا کہ وہ خود بھی بطلیموس کا علم رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا یہ شک کہ چاند کے مقابلے میں کوئی اور سیارہ زمین سے نزدیک تر ہو سکتا ہے، رفع نہیں ہو جاتا۔ صبح ہونے تک وہ اس سیارے کے بارے میں یوں گفتگو کر رہا تھا گویا اس نے اس کے وجود کا ثبوت فراہم کر لیا ہو۔

اگلے روز اس نے ایک بڑا ناقص ترجمہ کیا ہوا مخطوطہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ترکی زبان میں اپنی واجبی استعداد کے باوصف میں اسے پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا خیال ہے یہ ''المجسطی'' [Almageist] کا بالواسطہ [سیکنڈ ہینڈ] خلاصہ تھا، جو اصل نہیں بلکہ کسی اور خلاصے کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا' میری دلچسپی صرف سیاروں کے عربی ناموں میں تھی، اور میں اس وقت اس سے جوش میں آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جب خوجہ نے دیکھا کہ میں متاثر نہیں ہوا ہوں اور کتاب ایک طرف ڈال دی ہے، تو وہ برہم ہو گیا۔ اس نے یہ کتاب سات طلائی سکوں کے عوض مول لی تھی، اور مناسب یہ تھا کہ میں اپنی خودسری سے پہلوتہی کروں اور صفحے الٹ کر اس کا جائزہ لوں۔ کسی اطاعت گذار طالب علم کی طرح، میں نے کتاب دوبارہ کھولی اور ورق گردانی کرتے ہوئے ایک قدیم ہندی رسمے [ڈایاگرام] سے دوچار ہوا۔ بڑی بھدی نقشہ کشی میں سیاروں کو کرّوں کی صورت میں دکھایا گیا تھا اور انھیں زمین کی

Scanned with CamScanner

نسبت سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اگرچہ کروں کا محل وقوع درست تھا، نقشہ ساز کو ان کے اور زمین کے درمیانی فاصلے کا کوئی علم نہیں تھا۔ پھر میری نظر ایک چھوٹے سے سیارے پر جا پڑی جو چاند اور زمین کے درمیان تھا؛ قدرے غائر نظر سے دیکھنے پر مجھے روشنائی کی نسبتاً تازگی سے اندازہ ہو گیا کہ مخطوطے میں اس کا اضافہ بعد میں کیا گیا تھا۔ میں نے کتاب پوری دیکھ کر خوجہ کو لوٹا دی۔ اس نے کہا کہ وہ اس سیارے کو کھوج کر رہے گا وہ مذاق کرتا ہوا بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے کچھ نہ کہا، اور ایسا سکوت چھا گیا جس نے نہ صرف اس کے بلکہ میرے ہاتھ پاؤں بھی پھیلا دیے۔ چونکہ ہم کسی راکٹ کو اتنی بلندی پر نہ بھیج سکے جو فلکیات پر دوبارہ گفتگو کرنے کے لیے کافی ہوتا، یہ موضوع دوبارہ نہیں چھیڑا گیا۔ ہماری معمولی سی کامیابی محض ایک اتفاق رہی جس کا اسرار کبھی ہمارے ہاتھ نہ آ سکا۔

لیکن روشنی اور لو کی شدت اور تابانی کی بابت ہمیں اچھے نتائج حاصل ہوئے، اور ہمیں اپنی کامیابی کا راز معلوم ہوا جڑی بوٹیاں فروخت کرنے والوں کی ایک ایک دکان چھان مارنے کے بعد خوجہ کو ایک دکان میں ایک ایسا سفوف ہاتھ لگا جس کے نام کا خود دکاندار کو بھی علم نہیں تھا؛ ہم نے فیصلہ کر ڈالا کہ یہ زردی مائل سفوف، جو بڑی شاندار درخشندگی پیدا کرنے کا اہل تھا، دراصل گندھک اور تانبے کے سلفیٹ کا مرکب تھا۔ بعد میں ہم نے اس اثر کو چمک دمک دینے کے لیے ہر اس مادے کو جس کا خیال آیا اس کے ساتھ مرکب کیا، لیکن ہم قہوہ رنگ کتھئی اور سبزی مائل پیلے رنگ سے زیادہ، جن میں بمشکل ہی تمیز کی جا سکتی تھی، کچھ اور نہیں حاصل کر سکے۔ لیکن اتنا بھی، بقول خوجہ، ہر اس چیز کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھا جو استنبول نے کبھی مشاہدہ کی تھی۔

اور جشن کی دوسری رات ایسا ہی ہوا: پیش کیا ہوا تماشا ثابت ہوا، جیسا کہ ہر شخص نے کہا حتیٰ کہ ہمارے حریفوں نے بھی، جنھوں نے ہماری پیٹھ پیچھے خفیہ سازشیں کیں۔ جب ہم سے کہا گیا کہ سلطان گولڈن ہورن کے دوسرے کنارے سے تماشا دیکھنے آیا ہے تو میری حالت خاصی غیر ہو گئی، یہ سوچ کر کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے اور مجھے اپنے وطن لوٹنے میں برسوں لگ جائیں، مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی۔ جب ہمیں مظاہرہ شروع کرنے کا حکم ہوا، تو میں نے دعا مانگی۔ پہلے پہل، مہمانوں کو خوش آمدید کہنے اور تماشے کی ابتدا کرنے کے لیے، ہم نے آسمان میں بے رنگے راکٹ چھوڑے، فوراً بعد ہی خالی گھیرے کا تماشا دکھایا جسے خوجہ اور میں نے "چکی" کا نام دیا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر آسمان سرخ،

پیلا، اور سبز ہو گیا، اور اوسان خطا کر دینے والے دھماکوں سے گونج اٹھا۔ یہ منظر ہمارے گمان سے بھی زیادہ دیدہ زیب نکلا، جوں جوں راکٹ خالی گھیرے کو اٹھائے اٹھائے تیز رفتاری سے بلند ہوئے، خوب خوب چکر پہ چکر کھائے اور، اچانک، سارے گرد و نواح کے رقبے کو گلنار کرتے ہوئے ہوا میں بے حرکت معلق ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال گزرا کہ میں پھر سے وینس میں ہوں، ایک ہشت سالہ بچہ جو پہلی بار آتش بازی کا تماشا دیکھ رہا ہے اور مجھ جتنا ہی ناخوش کہ کپڑوں کا سرخ جوڑا وہ نہیں بلکہ اس کا بڑا بھائی پہنے ہوئے ہے جس نے گزشتہ دن جھگڑے میں اپنے کپڑے پھاڑ دیے تھے۔ دمکتے ہوئے راکٹ اتنے ہی سرخ رنگ تھے جتنے چمکیلے بٹنوں والا کپڑوں کا سرخ جوڑا جو میں اس شب نہیں پہن سکا تھا اور قسم کھائی تھی کہ اب کبھی نہیں پہنوں گا، ایسا ہی سرخ جیسے جوڑے پر مرمل بٹن جو میرے بھائی پر بہت تنگ آتا تھا۔

پھر وہ تماشا دکھایا جسے ہم نے ''فوارہ'' نام دیا تھا۔ پانچ آدمیوں جتنی بلند مچان کے منھ سے شعلے برسنے لگے؛ دوسرے کنارے کے تماش بینوں کو نیچے کے رخ لپکتے شعلوں کا منظر بہتر طور پر نظر آیا ہوگا، ''فوارہ'' کے منھ سے چھٹتے ہوئے راکٹوں سے وہ بھی اتنے ہی جوش میں آگئے ہوں گے جتنے ہم، اور ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا جوش و خروش سرد پڑ جائے: گولڈن ہورن کی سطح پر ہلکی پھلکی کایاک حرکت میں آگئیں۔ پہلے تو کاغذ کی لگدی سے ڈھلے ہوئے برجوں اور فوجی قلعوں نے، ان کے پاس سے گزرتے وقت اپنی برجیوں سے راکٹ داغے، آگ پکڑی اور شعلوں میں بھک سے اڑ گئے — یہ سب گزشتہ سالوں کی فتوحات کی علامت کے طور پر تھا۔ جب انھوں نے وہ کشتیاں چھوڑیں جو اُس سال کی کشتیوں کی نمائندگی کر رہی تھیں جب میں اسیر ہوا تھا، دوسری کشتیاں ہماری کشتی پر راکٹوں کے دھماکوں کے ساتھ حملہ آور ہوئیں: اس طرح میں نے اُس دن کو دہرایا جب غلام بنا تھا۔ جب کشتیاں جلنے اور ڈوبنے لگیں، دونوں کناروں سے ''خدا، او خدا!'' کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ پھر، یکے بعد دیگرے، ہم نے اپنے اژدہے چھوڑے' ان کے بڑے بڑے نتھنوں، پھناس کھلے دہنوں اور نوکیلے کانوں سے شعلے برسنے لگے۔ ہم نے انھیں یک دوسرے سے لڑایا؛ منصوبے کے مطابق پہلے پہل کوئی بھی دوسرے کو ہرا نہیں سکتا تھا۔ ساحل سے چھوڑے ہوئے راکٹوں سے ہم نے آسمان کو اور زیادہ سرخ کر دیا، اور جب وہ قدرے سیہ پڑ چکا، ہمارے آدمیوں نے جو کایاکوں پر سوار تھے گھرنیاں گھمائیں، اور اژدہے آہستہ

آہستہ آسمان میں بلند ہونا شروع ہوئے؛ اب ہر شخص ہیبت کے مارے چیخنے چلانے لگا' جوں جوں اژدہے بڑے غل غپاڑے کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے، کایا کوں پر رکھے ہوئے تمام راکٹ ایک ساتھ داغ دیے گئے؛ فتیلے جو ہم نے اس مخلوق کے دہانوں میں رکھ دیے تھے شاید عین وقت پر آتش گیر ہو گئے، کیونکہ پورا منظر، ٹھیک ہمارے منصوبے کے مطابق، ایک بھڑکتے ہوئے جہنم میں تبدیل ہو گیا۔ جب میں نے قریب ہی کسی بچے کے رونے چیخنے کی آواز سنی، مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم کامیاب رہے ہیں' بچے کا باپ اسے بھول بھال کر منہ کھولے اس ہیبت ناک آسمان کو تک رہا تھا۔ "آخر کار مجھے اب گھر لوٹنے کی اجازت مل جائے گی، میں نے سوچا۔ ٹھیک اسی وقت، وہ مخلوق جسے میں نے ''ابلیس'' کا نام دیا تھا، ایک چھوٹی سی غیر مرئی سیاہ کایک پر سوار، بڑی سبک رفتاری سے اس جہنم میں داخل ہوا' ہم نے اتنے بہت سے راکٹ اس پر باندھے تھے کہ ڈر لگا کہیں ساری کایا کیں، ہمارے کارندوں سمیت، دھماکے سے نہ اڑ جائیں، لیکن ہر چیز منصوبے کے مطابق رہی: ایک دوسرے سے برسرِ پیکار اژدہے چنگاریاں برساتے ہوئے آسمان میں تحلیل ہو گئے؛ ''ابلیس'' اور اس کے راکٹ، جو ایک ساتھ آتش گیر ہوئے، ایک ہی ہلے میں عالمِ بالا کی طرف روانہ ہو گئے، اس حال میں کہ ''ابلیس'' کے جسم کے ہر حصے سے منتشر ہوتے ہوئے گولے ایک قیامت خیز گونج کے ساتھ ہوا میں پھٹنے لگے۔ اس خیال سے کہ محض ایک ہی لمحے میں ہم نے پورے استنبول کے مارے دہشت کے اوسان خطا کر دیے ہیں میں نہال نہال ہو گیا۔ لیکن میں خوفزدہ بھی تھا، صرف اس لیے کہ میں نے، یوں تک رہا تھا، آخر کار میں نے وہ سب کرنے کی جرأت پائی تھی جو زندگی میں کرنا چاہتا تھا۔ میں کس شہر میں ہوں، اس کی اب موجودہ میں کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کو وہ ابلیس وہاں یوں ہی معلق رہے، اژدحامِ خلق پر تمام رات چنگاریاں برساتا رہے۔ دائیں بائیں تھوڑا سا جھوم جھام کر، دونوں کناروں سے اٹھتے ہوئے وجد آمیز شور و غوغا کے درمیان وہ پھڑ پھڑاتا ہوا گولڈن ہورن پر گر پڑا لیکن کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ پانی میں غرق ہونے تک اس کے بائی حصے سے آتش فشانی ہو رہی تھی۔

اگلی صبح پاشا نے سونے سے بھری ہوئی تھیلی خوجہ کو بھجوائی، عین مین پریوں کی کہانیوں کی طرح۔ اس نے کہلوایا تھا کہ وہ مظاہرے سے بہت خوش ہوا ہے لیکن ''ابلیس'' کی ظفر مندی پر اسے ضرور تعجب ہے۔ ہم مزید دس راتوں تک آتش بازی کا کرتب دکھاتے رہے۔ ان کے وقت جلے ہوئے ڈھانچوں

Scanned with CamScanner

کی مرمت کرتے، نت نئے کرتبوں کے منصوبے بناتے اور راکٹوں کو آتش گیر مادے سے بھرنے کے لیے قیدیوں کو محبس سے بلواتے۔ ایک غلام بینائی سے جاتا رہا، جب بارود کی دس تھیلیاں ٹھیک اس کے چہرے کے پاس پھٹ پڑیں۔

شادی کا جشن ختم ہونے کے بعد میں نے خوجہ کو اور نہیں دیکھا۔ میں اس متجسس آدمی کی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے جو مجھے ہر وقت گھورتا رہتا دور رہنے میں زیادہ آرام محسوس کرتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میرا ذہن گاہے گاہے ان فرحت بخش دنوں کی طرف نہیں بھٹکتا تھا جو ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گزارے تھے۔ میں جب واپس گھر جاؤں گا تو سب کو اس شخص کے بارے میں بتاؤں گا جس کی شکل مجھ سے اس قدر ملتی جلتی ہے لیکن جس نے ذہن میں بار بار آنے والی اس مشابہت کی طرف کبھی ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ میں پنی کوٹھڑی میں بیٹھتا اور وقت گزاری کے لیے مریضوں کی تشخیص کرتا: جب مجھے بتایا گیا کہ پاشا نے بلا بھیجا ہے تو بڑا اہتزاز محسوس کیا، تقریباً خوشی، اور جانے کے لیے دوڑ پڑا۔ پہلے تو اس نے سرسری طور پر میری تعریف کی، ہر شخص آتش بازی سے مطمئن تھا، مہمانوں کو مسرت ہوئی تھی، میں کافی طباع تھا، وغیرہ وغیرہ۔ ناگہانی وہ بولا کہ اگر اسلام لے آؤں تو وہ مجھے فوراً آزاد کر دے گا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ بالکل مبہوت۔ میں نے کہا کہ گھر لوٹنا چاہتا ہوں، اپنی حماقت میں میں اپنی ماں اور اپنی منگیتر کے بارے میں دو چار جملے تک بول بیٹھا۔ پاشا نے اپنا کلام دہرایا، یوں جیسے اس نے میری بات سرے سے سنی ہی نہ ہو۔ میں کچھ دیر خاموش رہا۔ جانے کیوں میں ان کاہل اور نکمے لڑکوں کے بارے میں سوچنے لگا جن سے اپنے بچپن میں واقف تھا؛ اس قسم کے بدمعاش لونڈے جو اپنے باپوں کے خلاف ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جب میں نے کہا کہ میں اپنا مذہب نہیں ترک کروں گا تو پاشا طیش میں آ گیا۔ میں اپنی کال کوٹھڑی میں لوٹ آیا۔

تین دن بعد پاشا نے مجھے پھر بلوایا۔ اس بار وہ اچھے موڈ میں تھا۔ میں فیصلہ کرنے میں ناکام رہا تھا، یہی کہ تبدیلیٔ مذہب سے مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد ملے گی بھی یا نہیں۔ پاشا نے مجھ سے میرا عندیہ معلوم کیا اور کہا کہ وہ یہاں ایک خوبصورت لڑکی سے میری شادی کا خود انتظام کرے گا۔ جرأت کے ایک ناگہانی لمحے میں میں نے کہہ دیا کہ مذہب تو نہیں بدلوں گا، اور پاشا نے، جو ششدر رہ گیا تھا، مجھے بے وقوف کہا۔ ظاہر ہے، وہاں تھا ہی کون جس سے یہ اقرار کرتے ہوئے کہ مسلمان ہو گیا ہوں مجھے

Scanned with CamScanner

شرم آئے گی۔ بعد میں وہ کچھ دیر تک شعائرِ اسلام کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی، مجھے دوبارہ کال کوٹھڑی بھجوا دیا۔

جب میں وہاں تیسری بار گیا تو پاشا کے حضور میں مجھے پیش نہیں کیا گیا، بلکہ ایک داروغہ نے مجھ سے میرے فیصلے کے بارے میں دریافت کیا۔ شاید میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہوتا، لیکن اس لیے نہیں کہ ایک داروغہ نے مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا! میں نے کہہ دیا کہ ہنوز اپنا مذہب ترک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ داروغہ نے میرا بازو پکڑا اور زیریں منزل میں لے چلا، جہاں مجھے کسی دوسرے کے حوالے کر دیا۔ یہ ایک بلند قامت آدمی تھا، ان لوگوں کی طرح دبلا پتلا جو میرے خوابوں میں نظر آتے تھے۔ اس نے بھی مجھے میرے بازو سے پکڑا، اور جب وہ مجھے باغ کے ایک کونے کی طرف لے جا رہا تھا، اس الطاف و مہربانی کے ساتھ جیسے کسی صاحبِ فراش اپاہج کی مدد کر رہا ہو، ایک اور شخص ہمارے پاس وارد ہوا، اور یہ اتنا حقیقی تھا کہ خواب میں اس کا گزر ممکن نہیں تھا، ایک گرانڈیل آدمی۔ دونوں آدمی، جن میں سے ایک کے ہاتھ میں چھوٹی سی کلھاڑی تھی، ایک دیوار کے پاس آ کر رک گئے اور میرے ہاتھ باندھ دیے۔ انھوں نے کہا کہ پاشا کا حکم ہے کہ اگر میں اسلام نہیں لے آتا تو میرا سر فوراً قلم کر دیا جائے۔ میں سکتے میں آ گیا۔

اتنی جلدی کیا ہے، میں نے سوچا۔ وہ میری طرف رحیم نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ کم سے کم انھیں دوبارہ اپنے سے پوچھنے نہ دینا، میں خود سے کہہ رہا تھا، لیکن ایک لمحے کے بعد وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔ پلک جھپکتے میں میرا مذہب ایک ایسی شے بن گیا جس کی خاطر مرنا آسان ہو گیا۔ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوا، اور، دوسری طرف، میں نے خود کو اتنا ہی قابلِ رحم سمجھا جتنا وہ دونوں سمجھ رہے تھے، وہ دونوں جنھوں نے پیہم استفسار سے میرے لیے اپنا مذہب ترک کرنا مشکل تر کر دیا تھا۔ جب میں نے اپنی توجہ کسی دوسری طرف منعطف کرنی چاہی، تو ہمارے گھر کے پچھواڑے سے باغ کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے نظر آنے والا منظر میری آنکھوں کے سامنے جی اٹھا: میز پر قوسِ قزح رنگ صدف سے مرصع طشت پر رکھے ہوئے آڑو اور چیریاں، میز کے عقب میں ایک دیوان تھا جس کی پوشش [اپ ہولسٹری] پھونس کی موونج سے بنی ہوئی تھی اور جس کے گدے پروں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کا رنگ کھڑکی کے چوکھٹے جیسا سبز تھا۔ خروٹ کی ایک بلند سی شاخ سے بندھا جھولا مشکل سے

محسوس کی جانے والی ہوا میں ہولے ہولے ڈول رہا تھا۔ جب انھوں نے دوبارہ مجھ سے پوچھا، میں نے کہہ دیا کہ مذہب نہیں تبدیل کروں گا۔ انھوں نے ایک ٹھنٹھ کی طرف اشارہ کیا، مجھے گھٹنوں کے بل بٹھایا اور اس پر میرا سر رکھ دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، لیکن پھر دوبارہ کھول دیں۔ ان میں سے ایک نے کلہاڑی ہوا میں بلند کی۔ دوسرے نے کہا کہ شاید میں اپنے فیصلے پر نادم ہو گیا ہوں انھوں نے مجھے کھڑا کر دیا۔ مجھے اس پر کچھ دیر سوچ لینا چاہیے۔

مجھے مزید غور و خوض کرنے کے لیے چھوڑ کر وہ ٹھنٹھ کے برابر کی زمین کھودنے لگے۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید وہ مجھے یہاں ابھی ابھی دفن کر دیں گے، اور موت کے خوف کے ساتھ ساتھ اب مجھے زندہ دفن کیے جانے کے ڈر نے بھی آ لیا۔ میں اپنے سے ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ جب تک وہ قبر کھود لیں گے میں فیصلہ کر چکا ہوں گا کہ وہ میری طرف بڑھے، صرف ایک اتھلا سا گڑھا کھودنے کے بعد۔ اسی سمے میں نے سوچا کہ یہاں مرنا کس قدر احمقانہ بات ہوگی۔ محسوس کیا کہ میں مسلمان ہو سکتا ہوں، لیکن عزم صمیم کا وقت نہیں تھا۔ گر میں واپس خسمس جا سکتا، اپنی پیاری کوٹھڑی میں جس کا میں بالآخر عادی ہو گیا تھا، تو پوری رات بیٹھ کر مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کر سکتا تھا، لیکن اس طرح نہیں، پلک جھپکتے میں نہیں۔

ناگہانی انھوں نے مجھ دبوچ لیا، اور مجھے دھکا دے کر گھٹنوں کے بل بٹھانے لگے۔ ٹھنٹھ پر سر رکھنے سے ذرا پہلے میں کسی کو درختوں کے درمیان حرکت کرتا دیکھ کر، جیسے پرواز کر رہا ہو، ششدر رہ گیا۔ یہ میں تھا، لیکن لمبی سی داڑھی میں، ہوا میں بلا آواز چلتا ہوا۔ میں نے چاہا کہ درختوں میں اپنے بھوت کو آواز دوں، لیکن ٹھنٹھ پر سر دبے ہونے کے باعث بول نہ سکا۔ یہ نیند سے مختلف نہیں ہوگا، میں نے سوچا، اور میں نے خود کو قسمت کے حوالے کر دیا، منتظر۔ مجھے اپنی پیٹھ اور گردن کے عقب میں تھرتھری محسوس ہوئی، میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا، لیکن گردن کے پاس ٹھنڈک کے احساس نے مجھے مجبور کر دیا۔ انھوں نے مجھے کھڑا کیا، اور غرا کر بولے کہ پاشا برافروختہ ہوگا۔ میرے ہاتھ آزاد کرتے وقت انھوں نے ملامت کی میں خدا اور محمد کا دشمن ہوں۔۔ وہ مجھے حویلی لائے۔

مجھے اپنی عبا کا حاشیہ چومنے دینے کے بعد پاشا نے میرے ساتھ نرمی کا سلوک کیا، بولا کہ اسے یہ بات اچھی لگی ہے کہ میں نے جان کی خاطر اپنا مذہب نہیں ترک کیا، لیکن ایک لمحے بعد ہی وہ بڑبڑانے لگا، کہا کہ میں بلاوجہ ہٹ دھرمی کر رہا ہوں، اسلام ایک برتر مذہب ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے جس قدر

Scanned with CamScanner

میری نمائش کی، اسی قدر اور غصے میں آ گیا، اس نے مجھے سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے وضاحتاً کہا کہ وہ کسی کو زبان دے چکا ہے، میں سمجھ گیا کہ اس کے وعدے نے مجھے ان تکلیفوں کو جھیلنے سے بچا لیا ہے جو مجھے بصورت دیگر جھیلنی پڑتیں، اور بالآخر مجھے احساس ہو گیا کہ جس شخص کو اس نے قول دیا ہے، اس کے بتانے سے یہ شخص کھب ڈب ہی معلوم ہوتا تھا، خوجہ ہے۔ پھر پاشا نے یکلخت کہا کہ اس نے مجھے خوجہ کو تحفتاً دے دیا ہے۔ میں نے اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا، پاشا نے وضاحت کی کہ آج سے میں خوجہ کا غلام ہوں، اس نے خوجہ کو ایک دستاویزی شہادت نامہ دیا ہے، مجھے آزاد کرنے یا نہ کرنے کا اختیار اب اسی کو ہے، آج کے بعد سے وہ جو چاہے گا میرے ساتھ کرے گا۔ پاشا کمرے سے چلا گیا۔

مجھے بتایا گیا کہ خوجہ بھی حویلی میں موجود تھا، زیریں منزل پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ خوجہ ہی ہے جسے میں نے باغ میں درختوں کے پار دیکھا تھا۔ ہم پیدل چلتے ہوئے اس کے گھر آئے۔ اس نے کہا کہ اسے تمام وقت یہ معلوم رہا تھا کہ میں اپنا مذہب نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے تو یہاں تک کیا تھا کہ اپنے گھر میں میرے واسطے ایک کمرہ تیار کر دیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا مجھے بھوک لگی ہے۔ موت کا خوف ہنوز مجھے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا، اور میں اس حالت میں نہیں تھا کہ کچھ کھا پی سکوں۔ تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح روٹی اور دہی کے چند نوالے، جو اس نے میرے سامنے لا کر رکھ دیے تھے، زہر مار کر ہی لیے۔ خوجہ خوشی خوشی مجھے لقمے چباتے دیکھتا رہا۔ وہ مجھے طمانیت سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی دیہاتی ابھی ابھی بازار سے بڑا نفیس گھوڑا خرید لایا ہو اور اسے چارا کھلاتے ہوئے دیکھتا ہو، اس خیال میں مگن کہ مستقبل میں وہ اس سے کیا کیا کام لے گا۔ ان دنوں تک جب اس نے مجھے فراموش کر دیا، کیونکہ وہ علم ہیئت سماوی کے نظریے کی تفاصیل اور اس گھڑی کے خاکوں میں غرق تھا جسے وہ پاشا کو تحفے کے طور پر پیش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مجھے اس نگاہ کو یاد کرنے کے بارہا موقعے ملے۔

بعد میں اس نے کہا کہ میں اسے سب کچھ سکھاؤں، اسی لیے اس نے پاشا سے مجھے مانگا تھا، اور صرف اس کے بعد ہی وہ مجھے آزادی بخشے گا۔ یہ "سب کچھ" کیا تھا اس سے واقف ہونے میں مجھے مہینوں لگ گئے۔ "سب کچھ" کا مطلب تھا ہر چیز جو میں نے ابتدائی اور ثانوی اسکول میں سیکھی تھی؛ ساری فلکیات، طب، انجینئری، ہر وہ علم جس کی تعلیم میرے ملک میں دی جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ

Scanned with CamScanner

سب کچھ جو میری کال کوٹھڑی میں پڑی ہوئی کتابوں میں لکھا تھا، جنھیں اگلے ہی دن اس نے ملازم کو بھیج کر اپنے یہاں منتقل کرا لیا؛ سب کچھ جو میں نے سنا یا دیکھا تھا، سب کچھ جو میں دریاؤں، پلوں، جھیلوں، غاروں اور بادلوں اور سمندروں کے بارے میں کہہ سکتا تھا، اور زلزلوں اور رعد کے اسباب کے بارے میں... آدھی رات کو اس نے یہ اضافہ کیا کہ یہ ستارے اور سیارے تھے جن سے اسے سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے چاندنی کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ ہمیں کم از کم چاند اور زمین کے درمیان والے اس سیارے کے وجود یا عدم وجود کا حتمی ثبوت ضرور فراہم کر لینا چاہیے۔ اس آدمی کی تاراج آنکھوں سے جس نے دن موت کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے میں گزارا ہو، میں ایک بار پھر ہماری ہوش ربا مشابہت پر توجہ دیے بغیر نہ رہ سکا جب خوجہ نے بتدریج ''سیکھنے'' کے لفظ کا استعمال ترک کر دیا: ہم مل کر کھوج لگانے والے تھے، حل کر دریافت کرنے والے تھے، ساتھ ساتھ ترقی کرنے والے تھے۔

چنانچہ، دو فرض شناس طالب علموں کی طرح جو ایمانداری کے ساتھ اپنا سبق تیار کرتے ہوں حتیٰ کہ اس وقت بھی جب بالغین دروازے کی درازوں سے کان لگائے سننے کے لیے گھر میں موجود نہ ہوں، دو اطاعت گزار بھائیوں کی طرح، ہم کام کرنے بیٹھ گئے۔ شروع شروع میں تو مجھے یوں زیادہ لگا جیسے میں نہایت خوامشتند بڑا بھائی ہوں جو اپنے پرانے سبقوں پر نظر ڈالنے کے لیے اس لیے راضی ہو گیا ہے کہ اپنے کاہل برادرِ خورد کو اپنے برابر پہنچنے میں مدد دے سکے، اور خوجہ کا انداز کسی ہوشیار لڑکے کا سا تھا جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ باتیں جو اس کا بڑا دریافت کرتا ہے واقعتاً اتنی اہم نہیں ہیں۔ بقول اس کے، اس کے اور میرے علم کے درمیان فرق ان کتابوں کی تعداد سے زیادہ نہیں تھا جو وہ میری کوٹھڑی سے اٹھوا لایا تھا اور یک شیلف پر ان کی قطار لگا دی تھی اور وہ کتابیں جن کے مشمولات مجھے یاد تھے۔ اپنی غیر معمولی تندہی اور ضرورت کے سبب چھ ماہ کے اندر اندر اس نے اطالوی زبان کی بنیادی فہمید حاصل کر لی تھی جس کو وہ آئندہ نکھارنے والا تھا، میری ساری کتابیں چاٹ کیا تھا، اور اس وقت جب اس نے مجھ سے ہر اس چیز کو دہرانے کے لیے کہا جو مجھے یاد تھی، میری اس پر برتری کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ اس کے باوجود، اس کا طرزِ عمل کچھ یوں تھا جیسے اسے ایک ایسے علم تک بھی رسائی حاصل تھی جو کتابوں کے ماورا تھا — خود اس کا اتفاق تھا کہ ان میں سے بیشتر بالکل بے وقعت تھیں — یک علم جو ان تمام چیزوں سے جنھیں جانا جا سکتا ہے زیادہ فطری اور زیادہ گہرا تھا۔ چھ مہینوں کے اختتام پر

Scanned with CamScanner

ہم اب وہ رفیق نہیں رہے تھے جو ساتھ بیٹھ کر پڑھ رہے ہوں، ساتھ ساتھ ترقی کر رہے ہوں۔ یہ وہ تھا جو نئے نئے خیالات لاتا تھا، اور میں اسے صرف چند تفصیل کی یاددہانی کرتا کہ آگے بڑھنے میں اس کی مدد کر سکوں یا اس پر نظرِ ثانی کروں جو وہ پہلے ہی سے جانتا ہے۔

زیادہ تر ان "خیالات" تک، جن میں سے بیشتر میں بھول گیا ہوں، اس کی رسائی رات کے وقت ہوتی تھی، ہمارے ارتجالاً تیار کیے ہوئے کھانے سے فارغ ہونے کے بڑی دیر بعد، اور جب پاس پڑوس کے تمام مکانوں میں روشنیاں گل ہو چکی ہوتیں اور ہمارے چاروں طرف ہر شے خاموشی کے لبادے میں لپٹی ہوتی۔ صبح کو وہ مسجد کا ابتدائی اسکول پڑھانے جاتا جو چند محلوں آگے تھی، اور ہفتے میں دو دن وہ کسی دور دراز علاقے میں جاتا جہاں میں نے کبھی قدم نہیں دھرا تھا اور ایک مسجد کے احاطے اساتذہ |وہ کمرہ جہاں نماز کے اوقات کا حساب لگایا جاتا ہو| میں جاتا۔ ہمارا بقیہ وقت یا تو رات کے "خیالات" کی تیاری میں گزرتا یا ان کے تعاقب میں۔ اس وقت تک بھی مجھے امید تھی، مجھے اس بات پر یقین تھا کہ جلد ہی ہماری دوربین ہوگی، اور چونکہ مجھے احساس تھا کہ اس کے "خیالات" کی جزئیات پر بحث و تمحیص، جنھیں میں بس دبی دلچسپی سے سنتا تھا، محض میری دوربین میں تاخیر کا باعث ہوئی، میں نے کبھی خوشی سے مداخلت نہیں کی۔

تو ہم نے اسی طرح خفیت میں غرق، اس مفروضہ سیارے کے وجود یا عدم وجود کے ثبوت کی تلاش کی جدوجہد میں، پہلا سال گزار دیا، تو جب وہ دوربینوں کی وضع پر کام کرتا رہا جن کے واسطے عدسے اس نے بھاری قیمت دے کر قندھار سے برآمد کیے تھے، آلے بنایا کرتا رہا اور پیمانے بناتا رہا، خوبی سیارے کا سوال بھول گیا وہ ایک اور ہی عمیق مسئلے میں الجھ گیا تھا۔ وہ بطلیموس کے نظام سے اختلاف کرنے کا، وہ کہتا، لیکن ہم نے کبھی بحث نہیں کی، وہ بولتا اور میں صرف سنتا: اس نے کہا یہ خیال کرنا کہ سیارے شفاف کُروں سے معلق ہیں نری حماقت ہے، وہاں کوئی اور چیز بھی تھی جو انھیں اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے تھی، ایک غیرمرئی طاقت، طاقتِ کشش شاید۔ پھر اس نے یہ تجویز پیش کی کہ زمین بھی، سورج کی طرح، کسی اور چیز کے گرد گھوم رہی ہو، شاید سارے ستارے کسی اور سماوی مرکز کے گرد چکر کاٹ رہے ہوں جس کے وجود کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہ ہو۔ بعدازاں، اس دعوے کے ساتھ کہ اس کے خیالات بطلیموس سے زیادہ بسیط ہوں گے، اس نے بہت سے نئے سیارے ایک زیادہ وسیع

Scanned with CamScanner

کوسموگرافی کے حصوں کے لیے اپنے مشاہدے میں شامل کر لیے اور ایک نئے نظام سے متعلق نظریات وضع کیے؛ ہو سکتا تھا کہ چاند زمین کے گرد گھوم رہا ہو، اور زمین سورج کے گرد، شاید محور زہرہ ہو۔ لیکن جلد ہی ان نظریات سے کٹ گیا۔ وہ بس یہ کہنے تک پہنچ گیا تھا کہ اب مسئلہ ان نئے نظریات کو تجویز کرنے کا نہیں بلکہ یہاں کے لوگوں کو ستاروں اور ان کی حرکات سے متعارف کرانے کا ہے — اور وہ یہ کام صادق پاشا سے شروع کرے گا — لیکن اسے پتا چلا کہ اس عرصے میں پاشا کو ایرزروم جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ لگتا ہے وہ ایک سازش ناکام میں ملوث تھا۔

ان برسوں میں جب ہم پاشا کے جلاوطنی سے لوٹنے کے منتظر تھے، ہم نے ایک رسالے کی بابت تحقیق کی جو خوجہ باسفورس کی رووں کے بارے میں قلمبند کرنے والا تھا۔ ہم نے مہینوں جوار بھاٹوں کے مشاہدے میں گزارے، ہماری ہڈیاں تک منجمد کر دینے والی ہوا میں آبنائے کے رخ ڈھالو چٹانوں میں سرگرداں رہے، اور ان برتنوں کے ساتھ وادیوں میں اترے جو آبنائے میں آ کر خالی ہونے والے دریاؤں کے بہاؤ کی رفتار اور درجۂ حرارت کی پیمائش کرنے کے لیے ہم لیے لیے پھرتے تھے۔

جب ہم گیبزے میں تھے، ایک شہر جو استنبول سے بہت زیادہ دور نہیں تھا اور جہاں ہم پاشا کی فرمائش پر تین ماہ کے لیے اس کے کسی کام کاج کی دیکھ ریکھ کے لیے آئے ہوئے تھے، تو وہاں کی مسجدوں میں اوقاتِ صلوٰۃ کے تفاوت سے ایک بالکل نیا خیال خوجہ کے ذہن میں آیا: وہ ایک ایسی گھڑی بنائے گا جو بے عیب صحت سے اوقاتِ نماز کی نشاندہی کرے گی۔ اسی وقت میں نے اسے بتایا تھا کہ میز کیا ہوتی ہے۔ جب میں فرنیچر کے اس عدد کو لے کر گھر آیا جو میں نے ایک بڑھئی سے خاص طور پر نقشہ دے کر اپنی فرمائش کے مطابق بنوایا تھا، خوجہ کو اس سے کوئی مسرت نہ ہوئی۔ اس نے اسے ایک چہار پایہ تابوت سے تشبیہ دی، اور کہا کہ یہ بدشگون ہے، لیکن بعد میں وہ میز اور کرسیاں دونوں ہی کا عادی ہو گیا، اس نے اعلان کیا کہ اس طرح بیٹھ کر وہ بہتر طور پر سوچ اور لکھ سکتا ہے۔ ہمیں نماز کی گھڑیوں کے واسطے پیتلوی گراریوں کو ڈھلوانے کے لیے استنبول جانا پڑا جو غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی قوس سے مطابقت رکھتی ہوں۔ واپسی کے سفر میں ہماری میز، اس حال میں کہ اس کی ٹانگوں کا رخ ستاروں کی طرف تھا، ہمارے پیچھے پیچھے ٹٹو کی کمر پر آ رہی تھی۔

ان اولین ماہ میں، میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے، خوجہ نے شمالی ملکوں میں

Scanned with CamScanner

نماز اور روزے کے اوقات کا حساب لگانے کی کوشش کی، وہ شمالی ملک جہاں رات اور دن کی مدت میں بڑا فرق تھا اور جہاں آدمی کو برسوں تک سورج نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ آیا روئے زمین پر کوئی مقام ایسا بھی ہے جہاں لوگ جس طرف بھی رخ کریں وہ مکے ہی کی طرف ہو۔ جوں جوں اسے یہ احساس زیادہ ہوا کہ میں ان مسائل سے لاتعلق ہوں، اتنا ہی زیادہ وہ میرے ساتھ نفرت و ملامت کا برتاؤ کرنے لگا، لیکن اس وقت میں نے یہی سوچا کہ اسے میری "برتری اور فرق" کا ادراک ہو گیا ہے، اور شاید وہ اس بات پر جھنجھلا رہا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ مجھے بھی اس بات کا احساس ہے۔ وہ ذہانت کے بارے میں بھی اتنی ہی گفتگو کرتا جتنی سائنس کے بارے میں: جب پاشا لوٹ آئے گا، اسے اپنے منصوبوں کے بدلے الطاف و اکرام سے نوازے گا، کوسموگرافی سے متعلق اس کے نظریات کے بدلے جنھیں وہ مزید آگے بڑھائے گا اور ایک موڈل کے ذریعے، ایک نئی گھڑی کے ذریعے، ان کا مظاہرہ کرے گا؛ وہ ہمیں اس تجسس اور اشتیاق میں مبتلا کر دے گا جو خود اس میں مشتعل ہے، وہ ایک احیائے نو کا پیش رو ہوگا۔ دونوں، وہ اور میں، منتظر تھے۔

۳

ان دنوں میں وہ ایسی گھڑی بنانے کی فکر میں تھا جس کی مشین میں بڑی کراری استعمال ہو جس سے ہفتے کے بجائے مہینے میں ایک بار وقت درست کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس قسم کے گراری والے آلے کو صورت دینے کے بعد، اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب ایک ایسی گھڑی بنانی چاہیے جسے سال میں ایک بار ہی چھیڑنے کی ضرورت پڑے۔ آخرکار اس کے حل کے طور پر اس نے اعلان کیا کہ اس گرانڈیل گھڑی کے دندانے دار پہیوں کو چلانے کے لیے حسب ضرورت توانائی مہیا کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ سیٹنگز کے درمیانی وقت کے حساب سے ان کی تعداد اور اوزان میں اضافہ کیا جائے۔ یہ وہ دن تھا جب مسجد کے اطاق الساعۃ میں اس نے اپنے دوستوں سے سنا کہ پاشا ایرزروم سے ایک برتر عہدہ سنبھالنے کے لیے لوٹ آیا ہے۔

اگلی صبح خوجہ مبارکباد دینے اس کے پاس گیا۔ ملاقاتیوں کے ہجوم میں پاشا نے اسے چن لیا، اس نے اس کی دریافتوں میں دلچسپی کا اظہار کیا، اور حتیٰ کہ میرے بارے میں بھی پوچھا۔ اس رات ہم نے گھڑی کو

Scanned with CamScanner

پرزہ پرزہ الگ کیا اور بار بار دوبارہ بنایا، کائنات کے موڈل میں یہاں وہاں کچھ چیزوں کا اضافہ کیا، اور اپنے موقلموں سے سیاروں کی رنگ کشی کی۔ خوجہ نے مجھے اپنی تقریر کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو اس نے بڑی محنت سے تیار کی تھی اور پھر ازبر کر لی تھی، جس سے اس کی نیت اپنے سامعین کو محض شائستہ زبانی اور شاعرانہ زینت کے زور سے متاثر کرنے کی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے، اپنے اعصاب کو آسودہ کرنے کی خاطر، اس نے ایک بار پھر اس خطیبانہ ٹکڑے کی قرأت کی جو سیاروں کے گردش کرنے کی منطق کے بارے میں تھا، لیکن اس مرتبہ اس نے اسے منقلب طور پر پڑھا، کسی جنتر منتر کی طرح۔ ایک گاڑی پر جو وہ کہیں سے مانگ لایا تھا ہمارے آلات لاد کر وہ پاشا کی حویلی کا عازم ہوا۔ میں یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ جس گھڑی اور موڈل نے مہینوں تک پورے گھر کو بھرا رکھا تھا اب یک اسی گاڑی پر اس قدر چھوٹے سے نظر آ رہے تھے۔ اس شام وہ بہت دیر سے لوٹا۔

جب اس نے حویلی کے باغ میں آلات گاڑی سے اتارے اور پاشا نے ان بے ربط اشیا کا معائنہ ایک بدمزاج بوڑھے کی سخت مزاجی سے کیا جو اس قسم کی تفریح بازی کے موڈ میں بالکل نہ ہو، تو خوجہ نے جھٹ اپنی رٹی رٹائی تقریر داغ دی۔ پاشا نے، میری طرف اشارہ کرتے ہوئے، کہا، جیسا کہ خود سلطان برسوں بعد کہنے والا تھا: ''تو کیا یہ سب اسی نے تم کو سکھایا ہے؟'' بس اولاً اس کا تاثر یہی تھا۔ خوجہ کے جواب نے پاشا کو اور ہکا بکا کر دیا۔ ''کون؟'' اس نے پوچھا، لیکن پھر سمجھ گیا کہ پاشا کا اشارہ میری طرف ہے۔ خوجہ نے اس سے کہا کہ میں بڑا پڑھا لکھا بے وقوف ہوں۔ یہ بیان کرتے وقت اس نے میرا بالکل خیال نہیں کیا، اس کا ذہن تو ابھی تک پاشا کی حویلی میں جو در پیش آیا تھا اسی پر اٹکا ہوا تھا۔ اس نے اس پر اصرار کیا کہ ہر چیز خود اس کی دریافت ہے، لیکن پاشا نے اس پر یقین نہیں کیا، وہ قصوروار ٹھہرانے کے لیے کسی اور کا متلاشی تھا کیونکہ وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ اس کا پیارا خوجہ ہی گناہگار نکلے۔

تو یوں وہ دونوں میرے بارے میں، چہ جائیکہ ستاروں کے بارے میں، گفتگو کرنے لگے۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس موضوع پر بحث کرنے سے خوجہ خوش نہیں۔ خاموشی چھا گئی، جبکہ پاشا کی توجہ اپنے ارد گرد دوسرے مہمانوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ رات کے طعام کے وقت، جب خوجہ نے فلکیات اور اپنی دریافتوں کے اعادے کی یک اور کوشش کی، پاشا نے کہا کہ وہ میرا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے،

لیکن اس کے بجائے خوجہ کا چہرا سامنے آ گیا ہے۔ میز پر دوسرے لوگ بھی موجود تھے، اس موضوع پر کہ کس طرح بنی نوع آدم کی تخلیق جوڑوں کی شکل میں ہوئی ہے بک بک شروع ہو گئی، اس سے متعلق مبالغہ آمیز مثالیں پیش کی گئیں: توام جن کی مائیں تک انھیں الگ الگ نہ پہچان سکتی ہوں؛ ہم شبیہ جو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے خوفزدہ ہوں لیکن اس کے باوجود، ایک دوسرے سے بھی جدا ہونے کے قابل بھی نہ ہوں، گویا کسی جادو کے غلبے میں ہوں؛ ڈکیت جو معصوموں کے نام اختیار کر کے ان کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ جب کھانا ختم ہوا اور مہمان رخصت ہونے لگے، پاشا نے خوجہ سے توقف کرنے کے لیے کہا۔

جب خوجہ نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا، تو شروع میں پاشا اس سے بالکل محظوظ ہوتا ہوا نہیں لگا، بلکہ اس بات سے ناخوش ہوا کہ گڑبڑ باتوں سے، جو بالکل ناقابل فہم تھیں، اس کا اچھا بھلا موڈ دوبارہ خراب کر دیا گیا ہے۔ لیکن بعد میں، تیسری بار خوجہ سے اس کی تقریر منھ زبانی سننے کے بعد، اور ہمارے نظام شمسی کے موڈل کے زمین اور ستاروں کو گھومتے، اپنی آنکھوں کے سامنے چکر لگاتے دیکھ کر، اس نے ایک دو باتیں ذہن نشین کر لی تھیں، کم از کم اب وہ کسی قدر توجہ کے ساتھ خوجہ کی بات سن رہا تھا، اور بس تھوڑے سے ہی تجسس کا اظہار کر رہا تھا۔ ٹھیک اس نقطے پر خوجہ نے بڑے شدید اصرار کے ساتھ کہا کہ ستارے ویسے نہیں ہیں جیسے لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ وہ اس طرح گردش کرتے ہیں۔ ''اچھا بھئی،'' پاشا نے آخرکار کہا، ''میں سمجھ گیا، یہ بھی ممکن ہے، کیوں نہیں، بہرحال۔'' جواب میں خوجہ نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے تصور کیا کہ لمبی خاموشی چھا گئی ہو گی۔ خوجہ دریچے سے گولڈن ہورن پر چھائی ہوئی تاریکی میں دیکھتے ہوئے بولتا رہا۔ ''وہ اس نقطے پر آ کر کیوں ٹھہر گیا، وہ آگے کیوں نہیں بڑھا؟'' اگر یہ سوال تھا تو اس کا جواب مجھے خوجہ کے جواب سے بہتر نہیں معلوم تھا۔ میرا خیال ہے کہ پاشا نے کیا کہا ہوتا اس کے بارے میں خوجہ کی ایک رائے ہو گی، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ لگتا تھا وہ اس بات پر برہم ہے کہ دوسرے اس کے خوابوں میں اس کے شریک نہیں۔ پاشا کو بعد میں گھڑی سے دلچسپی پیدا ہو گئی، اس نے خوجہ سے اسے کھولنے اور کراریوں، اس کی میکانکی ساخت، اور اس کے پاسنگوں کا مقصد بتانے کی فرمائش کی۔ پھر، جیسے کسی تاریک اور نفرت انگیز سانپ کے بل کی طرف بڑھ رہا ہو، اس نے ٹک ٹک کرتے ہوئے آلے میں اپنی انگلی ڈالی تھی اور پھر کھینچ لی تھی۔ خوجہ گھنٹہ گھروں کا ذکر کر رہا تھا، اس نمارکی

Scanned with CamScanner

قدرت کی تعریف کر رہا تھا جسے سب لوگ ٹھیک ایک ہی لمحے ادا کریں، کہ اچانک پاشا چیخ پڑا: "اسے نکال دو!" وہ بولا۔ "جی چاہے تو زہر دے دو، اور جی چاہے تو آزاد کر دو۔ اس سے تمھاری زندگی آسودہ ہو جائے گی۔" میں نے خوجہ کی طرف شاید ایک لمحے کے لیے امید و بیم کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے اس وقت تک آزاد نہیں کرے گا جب تک کہ "انھیں" احساس نہیں ہو جاتا۔

"انھیں" کس بات کا احساس ہونا چاہیے، یہ میں نے نہیں پوچھا۔ اور شاید مجھے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ نہ جان جاؤں کہ یہ بات تو خود خوجہ کو بھی نہیں معلوم تھی۔ بعد میں انھوں نے دوسری چیزوں کے بارے میں گفتگو کی، پاشا اپنے سامنے پڑے آلات پر ناک بھوں چڑھا رہا تھا اور نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ خوجہ رات کے پچھلے پہر تک حویلی میں رہا، اس پر امید انتظار میں کہ پاشا کی دلچسپی عود کر آئے گی، گو اسے معلوم تھا کہ اب اور اس کی پذیرائی نہیں ہوگی۔ آخر کار اس نے اپنے آلات گاڑی پر لادے۔ میں نے ایک واپسی کی تاریک اور پرسکوت سڑک کے ایک مکان میں کسی آدمی کا تصور کیا جو اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا لیکن سونے سے عاجز تھا پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے درمیان گرانڈیل گھڑی کے ٹک ٹک کرنے کی آواز پر متحیر۔

خوجہ دن نکلنے تک جاگتا رہا۔ میں ختم ہوتی ہوئی موم بتی کو بدلنا چاہتا تھا، لیکن اس نے مجھے روک دیا۔ چونکہ مجھے پتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ سننے کا خواہشمند ہے، میں نے کہا: "پاشا کی سمجھ میں آ جائے گا۔" یہ کہتے وقت ابھی تک اندھیرا تھا، شاید وہ جانتا تھا، جیسا کہ میں بھی جانتا تھا، کہ مجھے اس پر یقین نہیں تھا، لیکن ایک لمحے کے بعد وہ بولا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ شاید سارا مسئلہ اس لمحے کے اسرار کو حل کرنے کا تھا جب پاشا بولتے بولتے رک گیا تھا۔

اس راز کو پا لینے کے لیے، پہلا موقع ملتے ہی وہ پاشا سے ملنے گیا۔ اس بار اس نے خوش طبعی سے خوجہ کا استقبال کیا۔ بولا کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ کیا ہوا تھا، یا جو مدعا رہا تھا، اور خوجہ کے جذبات کو تسلی پہنچانے کے بعد اسے ایک ہتھیار پر کام کرنے کے لیے کہا۔ "دنیا کو ہمارے دشمنوں کے واسطے ایک خس بس بنانے والا ہتھیار!" یہ اس نے کہا تھا، لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ہتھیار کیا چیز ہونا چاہیے۔ اگر خوجہ سائنس سے اپنے جنون کو اس طرف مائل کر سکے، تو پاشا اس کی اعانت کرے گا۔ ظاہر ہے اس نے اس وقف کے بارے میں کچھ نہیں کہا جس کی ہم آس لگائے بیٹھے تھے۔ اس نے تو بس چاندی کے

Scanned with CamScanner

سکوں سے بھری ایک تھیلی ہی خوجہ کو پکڑا دی تھی۔ ہم نے اسے گھر پر کھولا اور سکے گننے لگے کل سترہ نکلے۔ ایک عجیب تعداد! تھیلی دینے کے بعد ہی اس نے کہا تھا وہ نوجوان سلطان کو اس بات پر راضی کرلے گا کہ خوجہ کو باریابی کا شرف بخشے۔ اس نے وضاحت کی کہ طفل کو "اس قسم کی چیزوں" سے دلچسپی تھی۔ نہ میں نے اور نہ خوجہ نے، جو مقابلتاً زیادہ تیزی سے جوش میں آجاتا تھا، اس کے وعدے کو زیادہ سنجیدگی سے برتا، لیکن ہفتے کے اندر اندر خبر ملی۔ پاشا نہیں، ہاں، مجھے بھی، سلطان کی خدمت میں پیش کرنے والا ہے، شام کی افطار کے بعد۔

تیاری میں خوجہ نے اپنی تقریر پر جو اس نے پاشا کو سنائی تھی نظرِثانی کی اور دوبارہ اسے ازبر کیا، اس میں اس لحاظ سے ردوبدل کیا کہ ایک نو سال کا بچہ اسے سمجھ سکے۔ کسی وجہ سے اس کا ذہن پاشا پر لگا ہوا تھا، سلطان پر نہیں، وہ ابھی تک اسی سوچ میں غرق تھا کہ پاشا کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ ایک دن اس کا بھید بھی اس پر منکشف ہونے والا تھا۔ یہ ہتھیار جو پاشا بنوانا چاہتا تھا، اسے کیا چیز ہونا چاہیے تھا؟ میرے کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا؛ خوجہ اب اکیلا کام کر رہا تھا۔ جہاں وہ آدھی رات تک اپنے کمرے میں مقفل ہو کر بیٹھتا، میں اپنے دریچے کے پاس خالی الذہن بیٹھا رہتا، یہ تک نہیں سوچتا کہ گھر کب واپسی ہوگی، بس کسی گاؤدی لڑکے کی طرح دن سپنے دیکھتا یہ خوجہ نہیں بلکہ میں میز کے برابر بیٹھا کام کر رہا تھا، جسے کہیں بھی، کبھی بھی، جہاں چاہوں جانے کی مکمل آزادی تھی!

پھر ایک شام ہم نے اپنے آلات گاڑی پر لادے اور محل کی طرف چل دیے۔ استنبول کی سڑکوں پر چلنے سے مجھے شغف پیدا ہو گیا تھا، اور میں نے اپنے کو وہ غیر مرئی آدمی محسوس کیا جو کسی بھوت کی طرح باغوں میں، دیوقامت چناروں، چیسٹ نٹ اور ارغوان کے درختوں کے درمیان حرکت کر رہا ہو۔ ہم نے خدمتگاروں کی مدد سے آلات کو دوسرے صحن میں اس جگہ جمایا جو ہمیں بتائی گئی تھی۔

حاکم ایک پیارا سا سرخ رخسار بچہ تھا جس کی قامت اس کی عمر سے متناسب تھی۔ اس نے آلات کو یوں چھوا جیسے وہ اس کے کھلونے ہوں۔ کیا میں اب اس وقت کا خیال کر رہا تھا جب میں اس کا ہمراز دوست ہونا چاہتا تھا، یا، بہت بعد میں، پندرہ سال بعد، اس زمانے کا جب ہم دوبارہ ایک دوسرے سے ملے؟ میں نہیں کہہ سکتا، لیکن میں نے فوراً یہ محسوس کیا کہ مجھے اس کو کوئی ضرر نہیں پہنچانا چاہیے۔ خوجہ پر ہیبت طاری تھی، وہ کانپ رہا تھا اور حالانکہ سلطان کے مصاحبین انتظار کرتے رہے، تجسس کے

مارے ادھر اُدھر بھیڑ بھاڑ کرنے لگے۔ آخر کار خوجہ نے ابتدا کی: اس نے اپنی کہانی میں نئی چیزوں کا اضافہ کیا: اس نے ستاروں کا یوں ذکر کیا جیسے وہ کوئی ذی عقل اور ذی روح وجود ہوں، انھیں پر کشش، پراسرار مخلوق سے تشبیہ دی جنھیں علم حساب اور ہندسہ [جیومیٹری] آتے ہوں، اور جو اپنے علم کے مطابق گردش کرتے ہوں۔ یہ دیکھ کر کہ طفل پر اثر ہو رہا ہے اور وہ گاہے گاہے اپنا سر اٹھا کر تعجب سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے، خوجہ اور زیادہ جوش میں آ گیا۔ دیکھو، گھومتے ہوئے شفاف کروں پر ٹنگے سیارے یہاں ماڈل پر دکھائے گئے ہیں، وہ رہی زہرہ، اور وہ اس طرح گردش کرتی ہے، اور وہ اس طرف معلق بڑا سا گولا، وہ چاند ہے اور یہ، آپ سمجھے، ایک مختلف راستے پر گردش کرتا ہے۔ جب خوجہ نے ستاروں کو گھمایا، ماڈل سے لگی ہوئی گھنٹی بڑی شیریں آواز پیدا کرتے ہوئے بجنے لگی اور ننھا منا سلطان، خوفزدہ ہو کر، ایک قدم پیچھے ہٹا، پھر، ہمت پکڑ کر، سمجھنے کی کوشش کی اور بجتی ہوئی مشین کی طرف بڑھا جیسے وہ کوئی سحر زدہ خزانے سے بھرا صندوق ہو۔

اب، جیسے جیسے میں اپنی یادوں کو دہراتا ہوں اور اپنے واسطے ایک ماضی کے ابداع کی کوشش کرتا ہوں، تو مجھے یہ ایک شادمانی کی تصویر نظر آتا ہے جو ان کہانیوں کے قابل ہو جو میں اپنے بچپن میں سنا کرتا تھا، ہو بہو اسی طرح جیسے ان پریوں کی کہانیوں والی کتابوں کے مصور دکھانا چاہتے تھے۔ بس اتنا ہی چاہیے کہ استنبول کی سرخ، زنجبیر بریڈ چھتوں کو ان شیشے کے کروں میں محصور کر دیا جائے جنھیں اگر جنبش دی جائے تو برف کے گالوں کی طرح چکرانے لگیں۔ بچے نے خوجہ سے سوال کرنے شروع کر دیے تھے، اور اس نے ان کے جواب ڈھونڈ نکالے۔

ستارے فضا میں کیسے رہتے ہیں؟ وہ شفاف کروں سے لٹکے ہوتے ہیں! کرّے کس چیز کے بنے ہوتے ہیں؟ ایک دکھائی نہ دینے والے مادے کے، اسی لیے وہ خود بھی نظر نہیں آتے! ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں؟ نہ، ہر ایک کا اپنا منطقہ ہوتا ہے، تہ دار، جیسا کہ ماڈل میں دکھایا گیا ہے! اتنے بہت سے ستارے ہیں، اتنے ہی کرّے کیوں نہیں؟ کیونکہ وہ بہت دور ہیں! کتنی دور؟ بہت، بہت! کیا دوسرے ستاروں کی بھی گھنٹیاں ہیں جو ان کی گردش کے ساتھ بج اٹھتی ہیں؟ نہیں، ہم نے گھنٹیاں ایک گردش کے ختم ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے لگائی ہیں! کیا رعد کا اس سے کوئی تعلق ہے؟ کوئی نہیں! تو پھر کس سے ہے؟ بارش سے! کیا کل بارش ہونے والی ہے؟ آسمان کے مشاہدے سے تو

معلوم ہوتا ہے کہ نہیں! سلطان کے بیمار شیر کے بارے میں آسمان کیا ظاہر کرتا ہے؟ کہ وہ اچھا ہو جائے گا، لیکن آدمی کو صبر سے کام لینا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔

جب وہ بیمار شیر کے بارے میں اپنی رائے دے رہا تھا، خوجہ مسلسل آسمان کی طرف دیکھتا رہا، جیسے ستاروں کے بارے میں گفتگو کرتے وقت دیکھا تھا۔ گھر لوٹنے پر اس نے اس تفصیل کا ذکر کیا، اور کہا کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ اہم نہیں ہے کہ بچہ سائنس اور سوفسطائیت میں تمیز کرے، اہم یہ ہے کہ اسے چند چیزوں کا ''احساس'' ہو۔ وہ پھر وہی لفظ استعمال کر رہا تھا، گویا مجھے معلوم ہو کہ اسے کس چیز کا احساس ہونا چاہیے، جبکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے مسلمان ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ محل سے لوٹتے وقت جو تھیلی انھوں نے ہمیں دی اس میں ٹھیک پانچ طلائی سکے تھے۔ خوجہ بولا کہ سلطان کی گرفت میں یہ بات آ گئی ہے کہ ستاروں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے ایک منطق کارفرما ہے۔ اوہ میرے سلطان! بعد میں، بہت بعد میں کہیں جا کر میں نے اسے جانا' مجھے اس پر تعجب ہوتا کہ وہی چاند ہمارے دریچے سے اندر آتا تھا، میں بچہ بن جانا چاہتا تھا! خوجہ، اپنے کو روکنے کے ناقابل، اسی موضوع کی طرف لوٹ پڑا؛ شیر والا سوال اہم نہیں ہے، بچے کو جانوروں سے محبت ہے، بس، بات اتنی ہی ہے۔

اگلے روز وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا۔ چند دن بعد اس نے گھڑی اور نجوم کو پھر گاڑی پر لادا اور، کھڑکیوں کے پیچھے کی ان متجسس نگاہوں کے نیچے، اس بار ابتدائی اسکول کی طرف نکل پڑا۔ جب وہ شام کے وقت لوٹا تو کافی پژمردہ نظر آ رہا تھا، لیکن اب اتنا بھی نہیں کہ خاموش رہتا۔ ''میرا خیال تھا کہ بچے بھی سلطان کی طرح سمجھ لیں گے، لیکن میں غلطی پر تھا،'' وہ بولا۔ وہ بس خوفزدہ ہو گئے۔ جب لیکچر دینے کے بعد خوجہ نے سوال کیے، ایک بچے نے جواب دیا کہ جہنم آسمان کے دوسری طرف ہے، اور رونے لگا۔

اگلا ہفتہ اس نے حاکم کی ذہانت کے بارے میں اپنے اعتماد کو سہارا دینے میں لگایا' اس نے میرے ساتھ ہر وہ لمحہ، جو ہم نے دوسرے صحن میں گزارا تھا دہرایا، اپنی توجیہات کے لیے میری مدد چاہی۔ بچہ ہوشیار تھا، ٹھیک ہے نا' یا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ کس طرح غور و فکر کرنا چاہیے، ٹھیک' وہ اتنی اخلاقی قوت کا مالک تھا کہ دربار میں اپنے آس پاس کے لوگوں کے دباؤ کے خلاف ڈٹا رہے، ٹھیک! چنانچہ اس سے بہت پہلے کہ سلطان ہمارے خواب دیکھے، جیسا کہ وہ آنے والے سالوں میں کرنے والا تھا، ہم نے

Scanned with CamScanner

اس کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ ان دنوں خوجہ گھڑی پر بھی کام کر رہا تھا، لیکن مجھے خیال ہوا کہ وہ ساتھ ساتھ تھوڑا بہت ہتھیار کی بابت بھی سوچ رہا ہے، کیونکہ جب پاشا نے اسے بلا بھیجا تو اس نے یہ اقرار کیا۔ لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ اسے پاشا سے کوئی امید نہیں رہی تھی۔ ''وہ دوسروں جیسا ہو گیا ہے،'' اس نے کہا۔ ''وہ مزید یہ نہیں جاننا چاہتا کہ وہ نہیں جانتا۔'' ہفتہ بھر بعد حاکم نے خوجہ کو بار دگر بلا بھیجا، اور وہ گیا۔

سلطان نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ خوجہ کی آؤ بھگت کی۔ ''میرے شیر کی طبیعت اب بہتر ہے،'' وہ بولا۔ ''بالکل ویسی ہی جیسی تم نے پیش گوئی کی تھی۔'' بعد میں وہ اس کے مصاحبین کے ساتھ صحن میں گئے۔ جوہڑ میں اپنی مچھلیوں کو دکھاتے ہوئے حاکم نے پوچھا کہ ان کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔ ''وہ سرخ ہیں،'' خوجہ نے مجھے بات کرتے وقت بتایا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کیا کہوں۔'' پھر اس کی توجہ مچھلیوں کے حرکت کرنے کے انداز پر گئی: لگتا تھا جیسے وہ خود بھی اس انداز کے بارے میں باہم گفتگو کر رہی ہوں، تاکہ اسے درجۂ کمال کو پہنچا سکیں۔ خوجہ نے کہا کہ اسے مچھلیوں میں ذہانت نظر آتی ہے۔ جب ایک بونا، جو حرم کے ایک خواجہ سرا کے برابر کھڑا تھا جو حاکم کو مسلسل اس کی والدہ کی تنبیہات یاد دلا رہا تھا، اس پر ہنس پڑا، تو سلطان نے اسے کافی ڈانٹا ڈپٹا۔ سزا کے طور پر اس نے سرخ سر بونے کو گاڑی پر چڑھتے وقت اپنے برابر نہیں بیٹھنے دیا۔

وہ گاڑی پر سوار ہو کر وحش گھر گئے تھے، شیر کے گھر۔ وہ شیر، چیتے اور تیندوے جو سلطان نے خوجہ کو دکھائے ایک قدیم گرجے کے ستون سے اپنی زنجیروں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ اس شیر کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے جس کے صحت یاب ہو جانے کی پیش گوئی خوجہ نے کی تھی، بچہ اس سے بولا، خوجہ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے۔ اس کے بعد وہ ایک اور شیر کے پاس گئے جو کونے میں پسرا ہوا تھا، یہ جانور، جو دوسروں کی طرح بدبودار نہیں تھا، حاملہ تھا۔ حاکم نے، اس حال میں کہ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، پوچھا، ''یہ کتنے بچوں کو جنم دے گی، کتنے نر ہوں گے، کتنے مادہ؟''

ششدر، خوجہ نے کچھ کہا جسے بعد میں اس نے مجھے اپنی ''فاش غلطی'' بتایا۔ اس نے سلطان سے کہا کہ اسے فلکیات کا علم تو ہے لیکن وہ نجومی نہیں۔ ''لیکن تم شاہی نجومی حسین افندی سے زیادہ علم رکھتے ہو!'' بچے نے کہا تھا۔ خوجہ نے جواب نہیں دیا، اس ڈر سے کہ قریب میں کوئی سن نہ لے اور حسین افندی سے جا کر لگا دے۔ بے صبرے سلطان نے اصرار کیا یہ خوجہ تو کچھ بھی نہیں جانتا، کیا اس نے بے

Scanned with CamScanner

سو اس نے ستاروں کا مشاہدہ کیا ہے؟

جواب میں خوجہ ان باتوں کے فوراً کہنے پر مجبور ہو گیا جنھیں وہ بہت بعد میں ہی کہنا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ اس نے ستاروں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ سیکھا ہے اس سے بہت کارآمد نتائج برآمد کیے ہیں۔ حاکم کی خاموشی کا اچھا مطلب نکالتے ہوئے، جو وہ چمکیلی ہوئی آنکھوں سے سن رہا تھا، اس نے کہا کہ ستاروں کے مشاہدے کے لیے ایک رصدگاہ کی تعمیر ناگزیر ہے: ویسی ہی رصدگاہ جو اس کے دادا احمد اول کے دادا مرحوم نے تقی الدین افندی کے واسطے نوے سال پہلے تعمیر کروائی تھی، اور جو بعد ازاں بے توجہی کے ہاتھوں کھنڈر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بلکہ، اس سے بھی زیادہ کھلی ہوئی کوئی شے ایک سائنس گھر جہاں محقق نہ صرف ستاروں بلکہ پوری دنیا کا، اپنے دریاؤں اور سمندروں، بادلوں اور پہاڑوں، پھولوں اور درختوں اور، ہاں بے شک، اپنے وحوش کے ساتھ مشاہدہ کر سکیں، اور پھر اطمینان سے ان مشاہدات پر بحث و تمحیص کے لیے جمع ہو سکیں اور خرد کے بڑھاوے کے لیے پیش رفت کر سکیں۔

سلطان نے خوجہ کو اس منصوبے کے بارے میں، جس سے میں بھی پہلی بار متعارف ہو رہا تھا، بات کرتے ہوئے اس طرح سنا جیسے کوئی خوشگوار حکایت ہو۔ جب وہ اپنی سواریوں میں محل لوٹ رہے تھے، اس نے ایک بار پھر استفسار کیا: "شیرنی کیسے بچے جنم دے گی کیا خیال ہے تمھارا؟" خوجہ نے اس کے بارے میں پہلے ہی خوب غور کر لیا تھا، چنانچہ اس بار یہ جواب دیا: "نر اور مادہ بچوں کی مساوی تعداد پیدا ہو گی۔" گھر پر اس نے مجھے بتایا کہ یہ کہنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا "وہ بے وقوف طفل میری مٹھی میں آ جائے گا:" اس نے کہا۔ "میں شاہی منجم حسین افندی سے زیادہ عاقل ہوں!" حاکم کے بارے میں اس لفظ کے استعمال پر مجھے، جو چونکا کہ، پتا نہیں کیوں میرے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ میں ان دنوں اکتاہٹ کے مارے گھریلو کاموں سے اپنے کو مشغول رکھے ہوئے تھا۔

بعد میں وہ یہ لفظ بجا اس طرح استعمال کرنے لگا گویا کوئی طلسمی کنجی ہو جو ہر دروازے کو کھولنے پر قدرت رکھتی ہو: کیونکہ وہ "بے وقوف" تھے، انھوں نے اپنے سر سے اوپر حرکت کرتے ستاروں کو نہیں دیکھا اور نہ اس پر غور کیا، کیونکہ وہ "بے وقوف" تھے اس لیے انھوں نے پہلے یہ پوچھا کہ اس چیز میں، جو وہ بس معلوم کرنے ہی والے ہیں، کیا اچھائی ہے، کیونکہ وہ "بے وقوف" تھے انھیں تفصیلات سے نہیں بلکہ خاصوں سے دلچسپی تھی، کیونکہ وہ "بے وقوف" تھے اس لیے ایک جیسے تھے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے

Scanned with CamScanner

کہ مجھے بھی لوگوں کی اس طرح نکتہ چینی کرنے کا شوق تھا، بہت سالوں پہلے نہیں، جب میں ابھی اپنے وطن میں مقیم تھا، میں خوجہ کے جواب میں کچھ نہ کہتا۔ بہرکیف اس وقت اس کی ساری توجہ پر بے وقوف مسلط تھے، میں نہیں۔ بظاہر میری نادانی دوسری قسم کی تھی۔ ان دنوں میں اپنی بداحتیاطی کی بنا پر میں نے اس سے اپنے ایک خواب کا ذکر کر دیا تھا وہ میری بجائے میرے ملک گیا ہوا ہے، میری منگیتر سے شادی رچا رہا ہے، شادی میں کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ میں نہیں ہوں، اور خوش خرمیوں کے دوران، جو میں ایک ترک کا لباس پہنے ایک کونے میں کھڑا دیکھ رہا ہوں، میں اپنی ماں اور اپنی منگیتر سے جا ملتا ہوں، جو دونوں مجھے پہچانے بغیر میری طرف اپنی پیٹھ موڑ لیتی ہیں، ان آنسوؤں کے باوجود جنھوں نے مجھے خواب سے بیدار کر دیا۔

اسی زمانے کے آس پاس وہ پاشا کی حویلی میں دو بار گیا۔ میرا خیال ہے پاشا اس پر ناخوش تھا کہ خوجہ اس کی نگراں نگاہوں سے دور حاکم سے تعلق پیدا کر رہا ہے: اس نے اس سے پوچھ گچھ کی؛ اس نے میرے بارے میں استفسار کیا، وہ میری تفتیش کر رہا تھا، لیکن بہت بعد ہی میں جا کر، جب پاشا کو استنبول بدر کر دیا گیا تھا، کہیں خوجہ نے مجھ پر یہ کھولا: اسے خدشہ تھا کہ اگر مجھے پتا چل گیا ہوتا تو شاید زہر دے دیے جانے کی دہشت میں میرے دن گزرتے۔ تاہم میں دیکھ سکتا تھا کہ پاشا کو خوجہ کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ دلچسپی تھی؛ اس سے میرے احساسِ فخر کو تقویت پہنچی کہ خوجہ اور میرے درمیان پائی جانے والی مشابہت مجھ سے زیادہ خود پاشا کے لیے پریشان کن تھی۔ ان دنوں ایسا لگتا تھا کہ یہ مشابہت وہ راز ہے جو خوجہ کبھی جاننے کا خواہشمند نہیں تھا اور جس کے وجود نے مجھے ایک عجیب سی ہمت بخش دی تھی: کبھی کبھی میں سوچتا کہ محض اس مشابہت کی بنا پر جب تک خوجہ زندہ ہے مجھے کوئی گزند نہیں پہنچنے والی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب خوجہ کہتا کہ پاشا بھی انھیں جیسا ایک بے وقوف ہے، تو میں اس کی تردید کرتا، وہ اس پر پیٹ بھر کر جز بز ہوتا۔ اس نے مجھے ایسی گستاخی پر اکسایا جس کا میں عادی نہیں تھا، میں چاہتا تھا کہ اس کے لیے اپنی ضرورت اور اپنے سامنے اس کی ندامت دونوں ہی محسوس کروں۔ میں اس سے پاشا کے بارے میں تابڑتوڑ سوال کرتا، اس کے بارے میں جو اس نے ہم دونوں کے بارے میں کہا ہو، خوجہ کو ایسے دم گھونٹتے ہوئے طیش میں ڈال کر جس کا سبب، میرا خیال ہے، خود اس کے اوپر بھی واضح نہیں تھا۔ پھر وہ بڑی اکڑ کے ساتھ دہراتا کہ وہ پاشا کا بھی صفایا کر دیں گے، جلد ہی ینی چری [ترکی کا

ہی دستاویزات جلد ہی کچھ کر گزرنے والے ہیں، اسے محل کے اندر سازشوں کی سن گن ہو رہی ہے۔ اسی کے باعث، اگر وہ پاشا کی ایما پر ایک ہتھیار پر کام کرنے ہی والا ہے، تو یا اسے کسی وزیر کے لیے نہیں بنانا چاہیے، کیونکہ وزیر آتے جاتے رہتے ہیں، بلکہ خود سلطان کے لیے۔

کچھ وقت کے لیے مجھے خیال ہوا کہ وہ ہتھیار کے اس مبہم سے تصور میں پوری طرح ڈوبا ہوا ہے، منصوبہ بنا رہا ہے لیکن کہیں رسائی نہیں ہو رہی، میں نے اپنے سے کہا۔ کیونکہ اگر اس معاملے میں اس نے کوئی پیش رفت کی ہوتی، تو مجھے یقین ہے اس نے اس میں مجھے شریک کیا ہوتا، خواہ اس بیان سے اس کا مقصد میری ہتک کرنے کی کوشش ہی ہوتا۔ اس نے مجھے اپنے نمونوں کے بارے میں بتایا ہوتا تاکہ میری رائے معلوم کر سکے۔ ایک شام ہم اکسرائے میں اس مکان سے لوٹ رہے تھے جہاں ہم موسیقی سنتے اور طوائفوں کے ساتھ پڑے رہتے، جیسا کہ ہم ہر دوسرے تیسرے ہفتے کرنے کے عادی تھے۔ خوجہ نے کہا کہ وہ صبح تک کام کرنے کا ارادہ باندھ رہا ہے، پھر مجھ سے عورتوں کے بارے میں پوچھا — ہم نے عورتوں کے بارے میں کبھی گفتگو نہیں کی تھی — اور ناگہانی بولا، "میں سوچ رہا ہوں۔" لیکن جیسے ہی ہم گھر میں داخل ہوئے وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا، بغیر یہ بتائے کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ میں اپنی کتابوں کے ساتھ رہ گیا جن کی محض ورق گردانی کی بھی مجھے اب کوئی خواہش نہیں رہی تھی، اور اس کے بارے میں سوچا اس کی بابت کہ اس کا منصوبہ یا تصور، خواہ یہ کچھ بھی ہو، مجھے یقین ہے کہ وہ آگے نہیں بڑھا سکے گا، اس کی بابت کہ وہ کمرے میں بند میز کے پاس بیٹھا ہے جس سے وہ ہنوز پوری طرح مانوس نہیں ہو سکا ہے، اپنے سامنے خالی صفحوں کو گھور رہا ہے، گھنٹوں تک میز کے پاس شرم اور طیش کے عالم میں بیٹھا ہے

نصف شب کے بہت بعد کہیں وہ اپنے کمرے سے برآمد ہوا اور وہ بھی کسی شرمسار طالب علم کی طرح جسے گرفت میں نہ آنے والے کسی معمولی سے نکتے کو حل کرنے کے لیے مدد کی ضرورت ہو، اور مجھے کھسیانے انداز میں اندر میز کے پاس آنے کے لیے کہا۔ "میری مدد کرو،" اس نے ناگہانی کہا۔ "چلو ساتھ ساتھ ان کے بارے میں سوچیں، میں اکیلا آگے نہیں بڑھ سکتا۔" میں کچھ دیر خاموش رہا، سوچتا رہا کہ اس کا تعلق عورتوں سے ہو۔ مجھے خالی خالی دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا، "میں بے وقوفوں کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ وہ اس قدر احمق کیوں ہوتے ہیں؟" پھر، جیسے جانتا ہو کہ میرا جواب کیا ہوگا،

Scanned with CamScanner

اس نے اضافہ کیا: ”اچھا ٹھیک ہے، وہ احمق نہیں ہیں، تاہم کچھ نہ کچھ ان کے دماغ سے ضرور غائب ہوتا ہے۔“ میں نے نہیں پوچھا کہ ”ان“ سے اس کی مراد کون ہیں۔ ”کیا ان کے سروں کے اندر کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جہاں علم کی ذخیرہ اندوزی کی جا سکے؟“ اس نے کہا، اور ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے صحیح لفظ کی تلاش میں ہو۔ ”ان کو چاہیے کہ سروں کے اندر ایک خانہ رکھیں، اس لماری کی درازوں جیسا کوئی خانہ، ایک ٹھکانا جہاں وہ متفرق چیزیں رکھ سکیں، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایسی کوئی جگہ نہیں۔ تم سمجھے؟“ میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ ایک آدھ بات سمجھا ہوں، لیکن اس میں ٹھیک سے کامیابی نہیں ہوئی۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ ”بہر کیف، کون جان سکتا ہے کہ ایک آدمی کیوں ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ہے؟“ اس نے آخرکار کہا۔ ”آہ، کاش تم واقعی طبیب ہوتے اور مجھے سکھاتے؛“ اس نے بیان جاری رکھا، ”ہمارے جسموں کے بارے میں اور ہمارے سروں کے بارے میں۔“ وہ کچھ شرمسار لگ رہا تھا۔ شگفتہ خاطری کی ادا سے، جو میرے خیال میں اس نے محض خالی خولی اپنے پر اس لیے طاری کی کہ کہیں مجھے خوفزدہ نہ کر دے، اس نے اعلان کیا کہ وہ اس سے ہاتھ کھینچنے والا نہیں، وہ انجام تک جائے گا، نہ صرف اس لیے کہ اسے کیا ہوگا کا تجسس ہے بلکہ اس لیے بھی کہ کچھ کرنے کے لیے نہیں ہے۔ میری سمجھ میں خاک نہ آیا، لیکن مجھے اس بات سے طمانیت ہوئی کہ یہ سب اس نے مجھی سے سیکھا ہے۔

بعد میں اس نے اکثر یہی بات دہرائی، گویا ہم دونوں ہی اس کا مطلب جانتے ہوں۔ لیکن تیقن کا سوانگ رچانے کے باوجود، اس کے انداز میں دن سپنے دیکھنے والے طالب علم کے سوال پوچھنے کی ادا تھی؛ ہر بار وہ یہی کہتا کہ انجام تک جائے گا اور مجھے یہ محسوس ہوتا کہ کسی بدقسمت عاشق کے افسردہ اور برہم نالے سن رہا ہوں جو یہ پوچھ رہا ہو کہ یہ آزار اسے کیوں اور کیسے لاحق ہوا۔ ان دنوں میں وہ یہ بات بار بار کہتا: یہ اس نے اس وقت بھی کہا جب اسے علم ہوا کہ ینی چیری ایک بغاوت کی گٹھ جوڑ کر رہے ہیں، اور تب بھی جب اس نے بتایا کہ ابتدائی اسکول کے طالب علموں کو ستاروں سے زیادہ فرشتوں سے دلچسپی تھی، اور اس کے بعد جب ایک اور قلمی نسخہ جس کی اس نے اچھی خاصی قیمت ادا کی تھا طیش میں ایک طرف پھینک دیا گیا تھا جب کہ ابھی اس نے اسے نصف کے قریب ہی پڑھا تھا: مسجد کے اطاق السعد میں اپنے دوستوں سے جدا ہونے کے بعد جن سے اب وہ محض ایک عادت کے طور پر ملتا تھا، ناقص طور

پر گرم کیے ہوئے حماموں میں ٹھٹھرنے کے بعد، بستر پر پھولدار توشک پر بکھری ہوئی اپنی محبوب کتابوں کے درمیان پسرنے کے بعد، مسجد کے صحن میں وضو کرنے والوں کی احمقانہ بک بک سننے کے بعد، یہ جاننے کے بعد کہ بیڑے کو ہل وینس نے شکست دے دی ہے، بڑے تحمل سے پڑوسیوں کو سننے کے بعد جو یہ کہنے کے لیے آتے ہوتے کہ اس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے اور اسے شادی کر لینی چاہیے، اس نے پھر سے بات دہرائی: وہ انتہا تک جائے گا۔

اب میں تعجب کرنے لگتا ہوں کون، ایک بار جو میں نے تحریر کیا ہے اسے آخر تک پڑھ لینے کے بعد، جو ہوا، یا جو میں نے تصور کیا کہ ہوا، اس کا جس قدر بھی میں بیان کر سکا ہوں، صبر و سکون سے سمجھ لینے کے بعد، کون قاری کہہ سکتا ہے کہ خوجہ نے جو وعدہ کیا تھا اسے وفا نہ کیا؟

۴

گرما کے اختتام کے قریب ایک دن یہ سنا گیا کہ شاہی نجومی حسین افندی کا مردہ جسم استیفے کے ساحل کے قریب بہتا ہوا پایا گیا ہے۔ آخر کار پاشا نے اس کی موت کا پروانہ حاصل کر لیا تھا، اور نجومی نے، جو خاموش نہ رہ سکا، اپنی جائے پناہ کی چغلی دور و قریب خط بھیج کر کھا دی جن میں صادق پاشا کے جلد اپنی موت سے ہمکنار ہونے کی پیشین گوئی تھی، یہ ستاروں میں لکھا ہوا تھا۔ جب اس نے انا طولیہ فرار ہونے کی کوشش کی تو جلادوں نے اس کی کشتی کو جا لیا اور اس کا گلا گھونٹ دیا۔ جیسے ہی خوجہ کو پتا چلا کہ مرنے والے کی ملکیت قبضے میں لے لی گئی ہے، تو وہ اڑ کر اس کے کاغذات اور کتابوں پر قبضہ جمانے پہنچ گیا؛ اس پر اسے اپنا سارا اندوختہ رشوتوں کی نذر کرنا پڑا۔ ایک شام وہ ایک بڑا سا صندوق گھر لایا جو ہزاروں صفحات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور محض ہفتے کے اندر اندر انھیں ہڑپ کرنے کے بعد بڑی سے بولا کہ اس سے بہتر تو وہ کر سکتا ہے۔

اپنے قول کو نبھانے پر اس کی کاوش میں میں نے اس کی اعانت کی۔ ان دو رسالوں کے واسطے، بعنوان "جانوروں کے عجیب طور و طریق" اور "مخلوقِ خدا کے حیرت انگیز عجائب"، جنھیں اس نے حاکم کے لیے مدون کرنے کا فیصلہ کیا تھا، میں نے نفیس گھوڑوں اور گدھوں، خرگوشوں، اور چھپکلیوں کا نقشہ بیان کیا جنھیں میں نے ایمپولی (Empoli) میں ہماری اراضی کے وسیع و عریض باغات اور مرغزاروں

میں مشاہدہ کیا تھا۔ جب خوجہ نے کہا کہ میری قوتِ متخیلہ بے حد محدود ہے، تو مجھے اپنے کنول کے تالاب کے فرانسیسی مونچھ دار کچھوے یاد آئے، نیلے توتے جو کسی کے لہجے میں گفتگو کرتے تھے، اور گلہریاں جو جفت سے پہلے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھی، چونچ سے اپنے سموروں کو نک سکھ سے درست کر رہی ہوتیں۔ ہم نے چیونٹیوں کے طرزِ عمل سے متعلق باب پر کافی توجہ اور وقت صرف کیا، وہ موضوع جس نے سلطان کا دل لبھایا تو لیکن جس کے بارے میں وہ زیادہ معلوم نہ کر سکا کیونکہ پہلے متن کو مستقل جھاڑ دی جا رہی تھی۔

جب خوجہ چیونٹیوں کی باقاعدہ اور منطقی زندگی کے بارے میں اپنے خیالات قلمبند کر رہا تھا، اس نے اس خواب کی بھی پرورش کی کہ ہمیں نوجوان سلطان کو تربیت بہم پہنچانی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اپنی مقامی سیاہ چیونٹیوں کو ناکافی پا کر، اس نے سرخ امریکی چیونٹیوں کا طرزِ عمل بیان کیا۔ اس سے اسے ستّ الوجود قدیم باشندوں کے بارے میں، جو اس سانپوں سے اٹے ہوئے ملک میں جسے امریکا کہا جاتا ہے، رہتے تھے اور اپنے اطوار کبھی نہیں بدلے تھے، ایک ایسی کتاب لکھنے کا خیال آیا جو دل بہلانے والی اور معلوماتی دونوں ہی ہو: میرا خیال ہے یہ کتاب اس نے کبھی مکمل کرنے کی جرأت نہیں کی جس میں اس نے کہا تھا، جیسا کہ اس نے میرے لیے تفصیل سے بیان کیا، کہ وہ یہ بھی لکھے گا کہ کس طرح ایک طفل بادشاہ کو جو جانوروں اور شکار کا شوقین تھا ہسپانوی کفار نے سولی پر چار چوب کر دیا تھا کیونکہ اس نے سائنس کی طرف سے غفلت برتی تھی۔ پروں والی بھینسوں، شش پایہ بیلوں، اور دوسرے سانچوں کے جو خاکے ہم نے ایک منی ایچرسٹ سے انھیں جیتی جاگتی شکل دینے کے لیے بنوائے تھے، ان سے ہم دونوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ ''ہو سکتا ہے حقیقت پرانے وقتوں میں اتنی ہی سپاٹ رہی ہو،'' خوجہ نے کہا۔ ''لیکن آج ہر شے سہ بُعدی ہے، حقیقت کی پرچھائیاں ہیں، تم دیکھتے ہو: حتیٰ کہ ادنیٰ ترین چیونٹی یک توام کی طرح اپنی پرچھائیں کو بڑے صبر و تحمل سے اپنی پیٹھ پر لادے پھرتی ہے۔''

سلطان کی جانب سے خوجہ کو کوئی سندیسہ نہیں آیا، چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ پاشا سے کہے کہ وہ رسائل اس کی جانب سے پیش کر دے، لیکن بعد میں اس پر پچھتایا۔ پاشا نے اسے اچھا خاصا وعظ سنا دیا، یہ کہا کہ علمِ نجوم سوفسطائیت ہے، کہ سیاست میں ملوث ہو کر شاہی نجومی حسین افندی [کا دماغ چل گیا تھا] اور کہ اسے گمان تھا کہ اب خوجہ کی آنکھیں اس کے خالی کردہ عہدے پر جمی ہوئی ہیں، کہ وہ خود اس چیز

Scanned with CamScanner

میں جسے سائنس کہتے ہیں اعتقاد رکھتا ہے لیکن معاملہ تصویروں کا تھا، ستاروں کا نہیں، کہ شاہی نجومی کا عہدہ بڑا منحوس ہے جیسا کہ اس بات سے واضح ہے کہ جو بھی اس پر فائز ہوئے جلد یا بدیر قتل کر دیے گئے، یا بدتر یہ کہ، ہوائے رقیق میں تحلیل ہو گئے، اور چنانچہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کا پیارا خوجہ، جس کی سائنس پر وہ اعتماد کرتا ہے، اس کا عہدہ سنبھالے، اور کہ، ہو نہ ہو، نیا شاہی نجومی صدقی افندی ہوگا، جو اس قدر سادہ لوح اور احمق ہے کہ یہ کام کر سکے، کہ اس نے سنا ہے خوجہ نے سابق نجومی کی کتابیں حاصل کر لی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ خوجہ مزید اس معاملے سے سروکار نہ رکھے۔ خوجہ نے جواب میں کہا کہ اس کا سروکار تو بس سائنس ہی سے ہے اور پاشا کو وہ رسائل پکڑا دیے جنھیں وہ سلطان کو پہنچوانا چاہتا تھا۔ اس شام گھر پر اس نے کہا کہ بے شک اس کا سارا سروکار سائنس سے ہی ہے، لیکن ہر وہ چیز جو اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہوا کرے گا؛ اور آغاز کے طور پر، پاشا پر نفرین بھیجی۔

اگلے ماہ کے دوران ہم نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ بچے پر ہمارے رنگ برنگے تخیّلی جانوروں کا کیا ردعمل ہوا، اور خوجہ اس تمام عرصے میں اس تخمین و ظن میں رہا کہ اسے ابھی تک محل کیوں نہیں بلایا گیا ہے۔ آخرکار ہماری شکار پر طلبی ہوئی۔ ہم دریائے رت خانے کے کنارے پر مراہتو محل پہنچے، وہ حاکم کے پہلو میں کھڑے ہونے، اور میں دور سے دیکھنے کے لیے۔ کافی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شاہی داروغہ شکار نے اچھا انتظام کیا تھا: خرگوش اور لومڑیاں چھوڑی گئی تھیں اور ان کے تعاقب میں گرے ہاؤنڈ کتے، ہم دیکھتے رہے جبکہ دوسری تمام نگاہیں اس خرگوش پر لگی ہوئی تھیں جو اپنی جماعت سے بچھڑ کر دریا میں کود پڑا تھا؛ جب، دیوانہ وار تیرتے ہوئے وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا، درندے وہاں بھی کتے چھوڑنا چاہتے تھے، لیکن اس فاصلے سے جہاں ہم ایستادہ تھے ہم سن سکتے تھے کہ حاکم نے اس حکم سے ساتھ منع کیا: "خرگوش کو آزاد رہنے دو۔" تاہم، خرگوش پھر پانی میں کود پڑا اور دوسرے کنارے کے ایک آوارہ کتے نے اس کا پیچھا کر کے دبوچ لیا، لیکن، درندے اسے کتے کے جبڑوں سے نجات دلانے کے لیے دوڑ پڑے اور اسے لیے ہوئے سلطان کے حضور میں پہنچے۔ بچے نے خرگوش کا فوراً معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر کہ زخم کاری نہیں ہے اطمینان کا سانس لیا، اس نے حکم دیا کہ خرگوش کو پہاڑی چوٹی پر لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔ بعد میں میں نے خوجہ اور اس سرخ سر بونے کو حاکم کے گرد جمع ہوتے دیکھا۔

Scanned with CamScanner

اس شام خوجہ نے بتایا کہ کیا ہوا تھا: سلطان نے پوچھا تھا کہ اس واقعے کی کیا تعبیر ہونی چاہیے۔ جب سب بول چکے اور خوجہ کی باری آئی تو وہ بولا کہ اس کا مطلب ہے سلطان کے دشمن ایسی کمین گاہوں سے آئیں گے جن کا اسے کمتر گمان ہوگا، لیکن وہ خطرے سے زندہ سلامت بچ نکلے گا۔ جب خوجہ کے حریفوں نے، جن میں نیا شاہی نجومی صدقی افندی بھی شامل تھا، اس تعبیر پر نکتہ چینی کی کہ اس میں موت کا ذکر چھیڑا گیا ہے — بلکہ یہاں تک کہ حاکم کو خرگوش سے تشبیہ دی ہے — سلطان نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ وہ خوجہ کے بیان کو اپنے کان کا آویزہ سمجھتا ہے۔ بعد میں، جب وہ ایک کالے شاہین کو، جس پر شکرے حملہ آور ہوئے تھے، اپنی جان کی خاطر برسرِ پیکار دیکھ رہے تھے، اور ایک لومڑی کی قابلِ رحم موت کا منظر بھی دیکھا جسے بھوکے کتوں نے بھنبھوڑ ڈالا تھا، سلطان نے بتایا کہ اس کی شیرنی نے دو بچے دیے ہیں، ایک نر، دوسرا مادہ، ایک مساوی تعداد، جیسا کہ خوجہ نے پیش گوئی کی تھی، کہ اسے خوجہ کی bestiary [اخلاقی تلقین پر مبنی قرونِ وسطیٰ کا مقالہ اصلی اور فرضی جانوروں کی بابت] سے الفت ہے، اور بیلوں کی بابت پوچھا جن کے نیلے پر ہوتے ہیں، اور گلابی بلیوں کی بابت جو دریاے نیل کے قریب مرغزاروں میں رہتی ہیں۔ فتحمندی اور خوف کے عجیب ملے جلے احساس سے خوجہ مدہوش ہو گیا۔

بہت بعد ہی میں ہمیں اس شیطنت کا پتا چلا جو جنگل میں واقع ہوئی: سلطان کی دادی کوسم سلطانہ نے ینی چیری آغاؤں کے ساتھ مل کر اسے اور اس کی والدہ کو مار ڈالنے اور اس کے بجاے اس کے بھائی شہزادہ سلیمان کو تخت نشین کرنے کی سازباز کی، لیکن سازش ناکام ہو گئی۔ پاداش میں دادی کا گلا اس بری طرح گھونٹ دیا گیا کہ منھ اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔ یہ سب خوجہ کو مسجد کے احاطے السلطنۃ میں ان احمقوں کی گپ شپ سے معلوم ہوا۔ وہ مکتب میں پڑھاتا رہا، لیکن اس کے علاوہ گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔

موسمِ خزاں میں کچھ عرصے کے لیے اس نے اپنے کو سموگرافیکل نظریات پر غور و فکر کرنے کا ارادہ کیا لیکن دوبارہ بے یقین ہو کر ہاتھ کھینچ لیا: اسے ایک رصدگاہ کی ضرورت تھی؛ بنابریں، یہاں کے احمقوں کو ستاروں سے اتنی ہی کم دلچسپی تھی جتنی خود ستاروں کو ان احمقوں سے۔ سردیاں آئیں، آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے، اور ایک دن ہمیں اطلاع ملی کہ پاشا کو اپنے عہدے سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ تجویز تو اس کا گلا گھونٹنے کی بھی تھی، لیکن سلطان کی والدہ نے اس کی اجازت نہیں دی، چنانچہ اس کے بجاے اسے ارزنجان شہر بدر کر دیا گیا اور اس کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ اس کے مرنے تک اس کی

Scanned with CamScanner

بابت مزید کوئی خبر نہیں ملی۔ خوجہ نے اعلان کیا کہ اب اسے کسی کا ڈر نہیں رہا، وہ کسی کا مقروض نہیں ہے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کہتے وقت اس نے اس بات کو کس قدر نظر میں رکھا تھا کہ اس نے مجھ سے کچھ سیکھا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اسے نہ طفل کا خوف تھا نہ طفل کی ماں کا۔ وہ موت اور نامردی سے جوا کھیلنے کے لیے تیار تھا، لیکن ہم گھر میں اپنی کتابوں کے درمیان بھیڑوں کی طرح خاموش بیٹھے رہے، سرخ امریکی چیونٹیوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور اس موضوع پر ایک نیا مقالہ لکھنے کا خواب دیکھتے رہے۔

وہ سردیاں، بہت سی گزشتہ اور آئندہ سردیوں کی طرح، ہم نے گھر ہی پر بتائیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کڑکڑاتی سرد راتوں میں جب بادشمالی چمنیوں اور دروازوں کے پیچھے سے در آتی، ہم زیریں منزل میں بیٹھے صبح ہونے تک باتیں کرتے رہتے۔ وہ اب مزید میری تحقیر نہیں کرتا تھا، اور اگر کرتا بھی ہو تو اس کے اظہار کی پروا نہیں رہی تھی۔ اس کے اس نئے نئے جذبۂ رفاقت کو میں نے اس حقیقت پر محمول کیا کہ اب کوئی اس کا طلبگار نہیں رہا ہے، نہ محل میں نہ محل سے متعلق حلقے میں۔ بعض اوقات مجھے خیال آتا کہ ہماری پراسرار مشابہت کا اسے بھی اتنا ہی احساس ہے جتنا مجھے، اور اس بات سے مجھے پریشانی ہوتی کہ اب جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو اسے وہ خود نظر آتا ہے وہ کیا سوچ رہا ہے؟ ہم نے جانوروں کی بابت ایک اور طویل مقالہ تمام دیا تھا، لیکن یہ پاشا کی جلاوطنی کے وقت سے میز پر پڑا ہوا تھا، اور خوجہ اس پر مصر تھا کہ وہ ان لوگوں کے نارخرے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں جن کی محل تک رسائی ہے۔ گاہے گاہے، بے کار پڑے پڑے، کیونکہ ایام کسی قابل ذکر واقعے کے بغیر گزر رہے تھے، میں مقالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بنفشئی ٹنڈوں اور اڑنے والی مچھیوں کو دیکھتا جن کی تصویریں خود میں نے بنائی تھیں، اور سوچتا کہ اگر سلطان پڑھتا تو کیا خیال کرتا۔

بہار کی آمد پر ہی کہیں جا کر خوجہ کو بلاوا آیا۔ اسے دیکھ کر بچے کو بڑی مسرت ہوئی تھی؛ بقول خوجہ، سلطان کی ہر جنبش، اس کے ہر لفظ سے عیاں تھا کہ وہ بڑی دیر سے اس کا منتظر تھا، لیکن اس کے احمق درباریوں نے اسے خوجہ کو بلا بھیجنے سے باز رکھا۔ حاکم نے اپنی دادی کی غداری کا ذکر کیا، بولا کہ خوجہ نے خطرے کی بو پہلے ہی سونگھ لی تھی اور یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ سلطان بغیر گزند پہنچے زندہ بچ نکلے گا۔ اس رات جب بچے نے ان لوگوں کی چیخ پکار سنی جو اسے قتل کرنے کی نیت سے آئے تھے، تو ذرہ برابر بھی

خوفزدہ نہیں ہوا، کیونکہ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ نابکار کتا اپنے جبڑوں میں آئے ہوئے خرگوش کو ایذا نہیں پہنچا سکا تھا۔ تحسین آفرینی کے ان الفاظ کے بعد اس نے حکم دیا کہ ایک مناسب قطعۂ ارض سے وصول ہونے والی آمدنی خوجہ کو وقف کر دی جائے۔ فلکیات کا موضوع چھیڑنے سے پہلے ہی خوجہ کو بتا دیا گیا؛ اس سے کہا گیا کہ گرما کے ختم پر عطیے کا متوقع رہے۔

انتظار کرتے ہوئے، زمین کی آمدنی کی توقع میں خوجہ نے باغ میں ایک چھوٹی سی رصدگاہ کی تعمیر کا منصوبہ بنا ڈالا۔ اس نے بنیادوں کی کھدائی کی حدود کا حساب لگایا اور ان آلات کی قیمت کا جو اسے درکار ہوں گے، لیکن اس بار وہ بہت جلد ہی اس میں اپنی دلچسپی کھو بیٹھا۔ اسی زمانے میں ایک بڑی بری طرح نقل کیا ہوا مخطوطہ پرانے کتاب بازار میں اس کے ہتھے چڑھا، جس میں تقی الدین کے مشاہدات کا اندراج تھا۔ اس نے ان مشاہدات کی صحت کی آزمائش میں دو مہینے لگائے، لیکن آخر بیزار ہو کر سلسلہ منقطع کر دیا، کیونکہ وہ اس کا تعین کرنے میں ناکام رہا تھا کہ کون سی تقصیر اس کے کمتر آلات کے باعث تھی، کون سی خود تقی الدین کی غلطیوں پر مبنی تھی، اور کون سی خطاط کی لاپروائی کا نتیجہ تھی۔ جس چیز نے اسے اور زیادہ برہم کیا وہ وہ اشعار تھے جو مخطوطے کے کسی سابق مالک نے مثلثات کی عمودی جدولوں [trigonometric columns]، جنھیں ساٹھ ڈگری پر تقسیم کیا گیا تھا، کے بیچ میں گھسیٹ دیے تھے۔ اس سابق مالک نے، حروفِ ابجدی کے حساب اور دوسرے طریقوں کے استعمال سے، دنیا کے مستقبل کے بارے میں اپنے ناچیز خیالات پیش کیے تھے: چار لڑکیوں کے بعد، بالآخر، اس کے یہاں ایک لڑکے کی ولادت ہوگی، ایک طاعون پھیلے گا جو معصوموں کو مجرموں سے ممیز کرے گا، اور اس کا پڑوسی بہاءالدین افندی موت سے ہم آغوش ہوگا۔ اگرچہ شروع میں خوجہ ان پیش گوئیوں سے محظوظ ہوا، لیکن بعد میں کافی متوحش ہو گیا۔ اب وہ ہمارے سروں کے اندر کے بارے میں ایک عجیب اور نامبارک اعتماد سے باتیں کرنے لگا تھا، یا ہمارے کمرے کی الماریوں کے بارے میں۔

سلطان نے جس عطا کا واعدہ کیا تھا گرمیوں کے ختم پر نہیں پہنچی، نہ سردیوں کی آمد پر۔ اگلے سال خوجہ کو بتایا گیا کہ ایک نیا کھاتا تیار کیا جا رہا ہے؛ اسے انتظار کرنا چاہیے۔ اس دوران اسے محل بلوایا گیا، لیکن اکثر نہیں، تاکہ اس قسم کے مظاہر کے بارے میں اپنی تعبیرات پیش کرے جیسے وہ آئینہ جس میں دراڑ پڑ گئی، بجلی کا سبز کوندا جو جزیرۂ یاسہ کے گرد سمندر پر گرا، چیری کے عرق سے لبریز بلوریں مینا جو

Scanned with CamScanner

اپنی جگہ پر کمڑے کمڑے پاش پاش ہوگئی، اور آخری مقالے میں جانوروں سے متعلق حاکم کے استفسارات کا جواب۔ جب وہ گھر لوٹتا تو کہتا کہ حاکم بلوغت میں داخل ہورہا ہے؛ یہ آدمی کی زندگی کا سب سے زیادہ اثر پذیر دور ہوتا ہے، کوئی دم جاتا ہے کہ طفل اس کی مٹھی میں ہوگا۔

اس مقصد کو ذہن میں رکھ کر اس نے ایک بالکل نئی کتاب کی تصنیف پر کام شروع کر دیا۔ اس نے مجھ سے ازٹیکس [Aztecs] کے زوال کے بارے میں سن رکھا تھا، اور اس سے بہت پہلے ہی اس کے ذہن میں ایک قابلِ رحم طفل بادشاہ کی کہانی تھی جسے سولی پر اس لیے چار چوب کر دیا گیا تھا کہ اس نے سائنس کی طرف سے غفلت برتی تھی۔ وہ اکثر ان بد اخلاق ذلیلوں کا ذکر کرتا جو اپنی توپوں اور جنگی مشینوں، اپنے پرفریب قصے کہانیوں اور ہتھیاروں کے ساتھ محوِ خواب شرفا پر شب خون مارتے اور انھیں اپنی اطاعت پر مجبور کر دیتے؛ لیکن ایک مدت تک اس نے جو وہ خود کو بند کیے ہوئے لکھ رہا تھا مجھ سے چھپائے رکھا۔ مجھے معلوم تھا وہ چاہتا ہے کہ پہلے میں دلچسپی کا اظہار کروں، لیکن اس زمانے میں شدید یادِ وطن نے، جو یکبارگی مجھے بڑی غیر معمولی افسردگی میں غرق کر دیتی، میری اس سے نفرت کو فزوں تر کر دیا تھا؛ میں اپنے تجسس کو دبا دیتا، یہ ظاہر کرتا کہ مجھے ان خاک آلود پھٹی جلدوں والی کتابوں سے ذرا دلچسپی نہیں ہے جنھیں وہ اس لیے پڑھتا ہے کیونکہ وہ اسے ارزاں قیمت پر مل گئی تھیں، اور ان نتائج پر حقارت کا اظہار کرتا جو اس کی تخلیقی عقل نے مجھ سے سیکھی ہوئی باتوں سے برآمد کیے تھے۔ روز بروز اس کا اعتماد گھٹنے لگا، پہلے خود اپنے پر، پھر اس پر جو وہ ضابطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، جبکہ میں اس مدت میں انتقامی تلذذ سے مشاہدہ کرتا رہا۔

وہ اوپر اس چھوٹے سے کمرے میں جاتا جسے اس نے اپنی ذاتی مطالعہ گاہ بنایا ہوا تھا، ہماری میز کے سامنے بیٹھتا جو میں نے بنوائی تھی، اور سوچتا، لیکن مجھے احساس تھا کہ وہ کچھ لکھ نہیں رہا، مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ نہیں لکھ سکتا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں اس بات کی جرأت نہیں کہ اپنے خیالات پر بغیر پہلے میری رائے معلوم کیے ہوئے کچھ تحریر کر سکے۔ اصل میں یہ میرے حقیر خیالات کی احتیاج نہیں تھی، جس پر وہ بناوٹی استہزا کا اظہار کرتا تھا، اور جو اس کے اپنے اوپر اعتماد کو متزلزل کر دیتی تھی، بلکہ وہ واقعی جس چیز کا حاجتمند تھا وہ یہ کہ "ان کا" کیا خیال تھا، ان کا جو میری طرح کے لوگ تھے، وہ "دوسرے" جنھوں نے مجھے وہ ساری سائنس سکھائی تھی، علم سے لبریز وہ خانے، وہ دراز یں میرے سر میں رکھ دی

تھیں۔ اگر وہ اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے تو کیا سوچتے؟ بس حقیقت میں یہی تھا جو وہ پوچھنے کے لیے مرا جا رہا تھا، لیکن پوچھنے پر اپنے کو آمادہ نہ کر سکا۔ میں نے اس بات کا کس قدر انتظار کیا کہ وہ اپنے گھمنڈ کو پی کر مجھ سے یہ سوال دریافت کرنے کی جرأت پیدا کر سکے! لیکن اس نے نہیں پوچھا۔ جلد ہی اس نے اپنی کتاب چھوڑ چھاڑ دی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اسے مکمل کر لیا تھا یا نہیں، لیکن اس نے "بے وقوفوں" سے متعلق اپنے اسی پرانے ٹیپ کے مصرعے کی گردان ازسرِنو شروع کر دی تھی۔ وہ اپنے یقین سے، کہ قابلِ عمل بنیادی سائنس وہی تھی جو ان کی حماقت کے سبب کا تجزیہ کرے، دست بردار ہونے والا تھا: یہ معلوم کرنے کی خواہش سے دست بردار ہونے والا تھا کہ ان کے سر اندر سے کیوں ایسے تھے جیسے کہ تھے، اور اس کی بابت مزید غور و فکر سے بھی! میرا خیال ہے یہ سوچ بچار اس کی مایوسی کا زائیدہ تھا کیونکہ الطاف و کرم کی وہ نشانیاں جن کا وہ محل کی جانب سے متوقع تھا سودار ہو کر نہ دیں۔ وقت بے سود ہی گزرتا رہا، حاکم کی بلوغت سے بہر حال بہت زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔

لیکن کپرُولُو محمد پاشا کے وزیر ہونے سے پہلے کی گرمیوں میں، خوجہ کو انجام کار اپنا عطیہ مل ہی گیا: اور یہ عطیہ بھی ایسا جو خود اس نے منتخب کیا ہو، اسے گبزے کے قریب دو چکیوں اور اس شہر سے گھنٹہ بھر کی مسافت پر دو گاؤں کی مجموعی آمدنی بخشی گئی تھی۔ فصل کٹنے کے وقت ہم گبزے گئے، اور اپنے پرانے گھر میں وارد ہوئے جو اتفاق سے خالی پڑا تھا، لیکن وہ ان مہینوں کو بھول بھال گیا تھا جو ہم نے وہاں گزارے تھے، وہ دن جب اس نے اس میز کی طرف جو میں بڑھئی سے بنوا کر لایا تھا بڑی ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ گھر کے ساتھ ہی ساتھ اس کی یادیں بوڑھی اور بدنما ہو چکی ہوں: کچھ بھی سہی، ایک بے صبری نے اسے اتنا مغلوب کر لیا تھا کہ ماضی کی کسی شے کے بارے میں پروا کرنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ چند موقعوں پر وہ گاؤں کے معائنے کے لیے گیا: اس نے اس آمدنی کا حساب لگایا جو گزشتہ برسوں میں ہوئی ہو گی، اور تَرہُونجو احمد پاشا کے زیرِ اثر، جس کے بارے میں اس نے اپنے مسجد کے اطاق السلطنۃ والے دوستوں کی گپ بازی کے دوران سنا تھا، یہ اعلان کیا کہ اس نے حساب کتاب کے دفتر کے واسطے ایک نیا نظام دریافت کیا ہے جو زیادہ آسان اور زیادہ قابلِ فہم طریقے پر یہ کام کر سکے گا۔

لیکن اس اختراع کی جدت طرازی اور فائدہ مندی، جس پر اسے خود یقین نہیں تھا، اس کے لیے کافی نہیں تھی: ان راتوں نے، جو اس نے پرانے گھر کے پائیں باغ میں بیٹھ کر آسمان کو تکنے میں

Scanned with CamScanner

برباد کیں، فلکیات میں اس کے جنون کو پھر جگا دیا۔ کچھ دیر تک تو میں نے اس کی ہمت افزائی کی، اس یقین پر کہ وہ اپنے نظریات کو ایک قدم آگے بڑھائے گا؛ لیکن اس کی نیت یہ کب تھی کہ مشاہدات کرے یا دماغ سے کام لے: اس نے ذہین ترین نوجوانوں کو جنھیں وہ گاؤں میں اور کھوے میں جانتا تھا گھر مدعو کیا، ان سے کہا کہ انھیں ارفع ترین سائنس کا درس دے گا، برج میں نظامِ شمسی کا وہ موڈل کھڑا کر دیا جسے لے آنے کے لیے اس نے مجھے استنبول بھیجا تھا، گھنٹیوں کی مرمت کی، تیل دیا، اور ایک شام، اس جوش وخروش اور اس توانائی کے ساتھ جو خدا جانے وہ کہاں سے لے آیا تھا، بڑی سرگرمی سے اس نظریے کو دہرایا، بغیر کسی غلطی یا بھول چوک کے، جس کی وہ برسوں پہلے پاشا اور پھر سلطان کے سامنے تشریح کر چکا تھا۔ لیکن اگلی صبح جب ہم نے بھیڑ کا دل اپنے دروازے کے قدمچے پر پڑا پایا، ہنوز گرم اور خون ریزاں، ایک ٹونکا اس پر لکھا ہوا، تو یہ آخرکار ان نوجوانوں پر جو آدھی رات کو بغیر ایک سوال کیے گھر سے رخصت ہوئے تھے اور فلکیات پر اس کی تمام تر آس مٹانے کے لیے بہت کافی تھا۔

لیکن اس پسپائی کو اس نے اپنے گلے کا ہار بھی نہیں بننے دیا ٹھیک ہے یہ وہ نہیں تھے جو زمین اور ستاروں کی گردش کو سمجھ سکیں: اس وقت یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اسے سمجھ ہی لیں، وہ جس کے واسطے سمجھنا ضروری تھا بس اب آغازِ شباب سے باہر قدم رکھنے والا تھا، اور ہو سکتا ہے کہ اس نے ہماری عدم موجودگی میں ہمیں طلب کیا ہو، ہم صرف چند دمڑیوں کی خاطر جو فصل کٹائی کے بعد ہمیں یہاں ملنے والی تھیں، اپنے موقعے کو ہاتھ سے جانے دے رہے تھے۔ ہم نے اپنے معاملات یکسو کیے، ان میں کے سب سے زیادہ ذہین نظر آنے والے نوجوان کو نگراں ملازم رکھا، اور استنبول مراجعت کی۔

اگلے تین سال ہمارے واسطے بدترین ثابت ہوئے۔ ہر دن، ہر مہینہ، اپنے گزشتہ کی طرح ہی نکلا، ہر موسم، کسی دوسرے موسم کا جس سے ہم گزر رہے تھے بیزار کن اور مضطرب اعصاب چربہ۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم ایک ہی اشیا کو نہایت تکلیف اور بے دلی سے بار بار ہوتا دیکھ رہے ہوں، کسی ایسی تباہی کے منتظر جسے ہم کوئی نام دینے سے عاجز ہوں۔ اسے اب بھی کبھی کبھار محل بلوایا جاتا، جہاں اس سے یہ توقع کی جاتی کہ اپنی بے ضرر تعبیرات پیش کرے، اور اب بھی اپنے دوستوں کے ساتھ جمعرات کی دوپہر کو مسجد کے احاطہ السعادہ میں اکٹھا ہوتا، اب بھی اپنے شاگردوں سے صبح ملتا اور ان کی مرمت کرتا، سابقہ باقاعدگی کے ساتھ نہ بھی سہی، اب بھی ان لوگوں کی مزاحمت کرتا جو کبھی کبھار گھر آ کر شادی کی

تجویزیں پیش کرتے، پہلے جیسے قطعی انداز میں نہ بھی سہی، اب بھی اس موسیقی کو سننے پر مجبور ہوتا جو عورتوں کے ساتھ ہم بستر ہونے کے لیے اسے سننی پڑتی اور جو اب اسے مزید نہیں بھاتی تھی، اب بھی اکثر اوقات اس نفرت سے اس کا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا جو اسے بے وقوفوں سے محسوس ہوتی تھی، اب بھی اپنے کو کمرے میں بند کر لیتا، اس بستر پر لیٹ جاتا جو اس نے بچھایا ہوتا، بر ہمی سے ان مخطوطوں اور کتابوں کی ورق گردانی کرتا جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوتیں اور انتظار کرتا، چھت کو مسلسل گھنٹوں تکتا رہتا۔

جس بات نے اس کی حالت اور بھی ابتر کر دی وہ کپر ولو محمد پاشا کی کامیابیاں تھیں جن کے بارے میں وہ اپنے مسجد کے اطاق السلطنۃ میں جمع ہونے والے دوستوں سے سنتا تھا۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ بیڑے نے اہل وینس میں بھگدڑ مچا دی تھی، یا کہ ٹینیدوس اور لمنوس کے جزیرے قبضے میں آ گئے ہیں، یا کہ باغی اباظہ حسن پاشا کچل دیا گیا ہے، تو وہ یہ اضافہ کرتا کہ یہ محض ایسی بچی کھچی کامیابیاں ہیں جو پلک جھپکتے میں گزر جاتی ہیں، ایک اپاہج کی کلبلاہٹ جو جلد ہی حماقت اور نا اہلی کی دلدل میں دفن ہو جانے والا ہے۔ وہ کسی تباہی کا منتظر نظر آتا جو ان دنوں کی یکسانیت اور یک رنگی کو بدل دے، جنھوں نے ہمیں یوں اور بھی مضمحل کر دیا تھا کہ یہ صرف ایک دوسرے کو دہرا رہے تھے۔ بدتر یہ کہ چونکہ اب اس کے پاس اس چیز پر جسے وہ بڑی ہٹ دھرمی سے ''سائنس'' کہتا تھا، ارتکاز کرنے کے لیے نہ صبر تھا نہ اعتماد، اس کے پاس اپنی توجہ بٹانے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ کسی نئے خیال کے لیے ہفتہ بھر سے زیادہ اپنا جوش و خروش قائم نہیں رکھ سکتا تھا، جلد ہی اسے اپنے احمق یاد آئے اور باقی سب کو فراموش کر دیا۔ کیا ان کے بارے میں جس قدر تفکر اس نے اب تک کیا تھا کافی نہیں تھا؟ کیا وہ اس قابل تھے کہ ان کے حوالے سے وہ اپنے کو اس قدر ہلکان کرے؟ اس قدر غصہ کرنے کے قابل؟ اور شاید، چونکہ اس نے حال ہی میں خود میں اور ان میں تفریق کرنا سیکھا تھا، اس سائنس کی تفصیلاً چھان بین کرنے کی اپنے میں طاقت پاتا تھا اور نہ خواہش۔ اس نے، بہر کیف، یہ سوچنا ضرور شروع کر دیا تھا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے۔

اس کا پسپا تاثر صرف و محض جھنجھلاہٹ کی پیداوار تھا۔ اب، چونکہ وہ کسی موضوع پر بھی زیادہ دیر تک ارتکاز کرنے سے قاصر تھا، اپنا وقت اس لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے اور احمق بچے کی طرح گزرتا

جسے اپنا دل بہلانے کی کوئی ترکیب نہ آتی ہو، گھر میں ایک کمرے سے دوسرے میں چکر لگاتے ہوئے، زینے سے ایک منزل سے دوسری منزل اوپر نیچے آتے جاتے ہوئے، خالی نظروں سے اس کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے یا اُس کھڑکی کے۔ اس غیر مختتم اور پاگل کر دینے والی آجا کے دوران جب وہ میرے پاس سے گزرتا، جس سے گھر کے چوبی فرش احتجاجاً کراہتے اور کھڑکھڑانے لگتے، مجھے پتا ہوتا کہ وہ اس بات کا متمنی ہے کہ میں کسی لطیفے سے، کسی انوکھے خیال یا ہمت افزائی کے کسی کلمے سے اس کی توجہ کو بھرا دوں۔ لیکن، اپنے احساسِ شکست کے باوجود، وہ غصہ اور تنفر جو میں اس کے لیے محسوس کرتا، ان کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، میں کوئی جواب نہ دیتا۔ اس وقت بھی، جب مجھ سے کسی قسم کا جواب اگلوانے کی خاطر، وہ اپنے گھمنڈ کو پی کر میری سرکشی کا مقابلہ انکساری سے کرتا، چند مہربان لفظوں کے ساتھ، میں وہ کہنے سے احتراز کرتا جسے سننے کا وہ آرزومند ہوتا: جب اس نے اعلان کیا کہ محل سے اطلاع ملی ہے جس کی خوشگوار تعبیر کی جاسکتی ہے، یا اسے ایک نیا خیال آیا ہے جو اگر وہ اس پر سر کھپائے اور اس کا تعاقب کرے تو سونے میں تولا جانے کے قابل ہے، میں یا تو اس کی بات نہ سننے کا رنگ بھرتا یا اس کے بیان میں سب سے پھیکی پھیکی چیز کو خصوصی طور پر نمایاں کر کے فوراً اس کے سارے جوش پر پانی ڈال دیتا۔ میں اسے اپنے ذہن کے خلا میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر محظوظ ہوتا۔

لیکن بعد میں ٹھیک اسی ویرانی میں اسے وہ خیال ہاتھ آ گیا جس کی اسے حاجت تھی: شاید اس لیے کہ اب وہ خود اپنے رحم و کرم پر تھا، شاید اس لیے کہ اس کا دماغ، نچلا بیٹھنے سے عاجز، اپنے بے لگام اتاولے پن سے امان نہیں پا سکتا تھا۔ ٹھیک اس وقت میں نے اسے جواب دیا — میں اس کی ہمت افزائی کرنا چاہتا تھا۔ جس سے خود میری دلچسپی جاگ اٹھی، شاید جب یہ سب ہو رہا تھا میں نے یہاں تک سوچا کہ وہ میری پیروی کرتا ہے۔ ایک شام جب خوجہ کے قدموں کی چرچراہٹ پورے گھر سے گزرتی ہوئی میرے کمرے تک بھی پہنچ گئی اور اس نے کہا، جیسے ادنیٰ ترین سوال کر رہا ہو، "میں کیوں وہ ہوں جو ہوں؟" تو میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور جواب دینے کی کوشش کی۔

میں نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کہ جو وہ ہے ویسا کیوں ہے۔ پھر یہ اضافہ کیا کہ یہ سوال "وہ" اکثر پوچھتے ہیں، اور ہر روز بیشتر پوچھتے ہیں۔ جب میں نے یہ کہا تو اس کی تصدیق کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، کوئی خاص نظریہ ذہن میں نہیں تھا، کچھ بھی تو نہیں، صرف یہ خواہش ہی تھی کہ اس کے

سوال کا جواب اس کے حسبِ منشا دوں، شاید اس لیے کہ مجھے جبلی طور پر یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس کھیل سے لطف اندوز ہوگا۔ لیکن اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھا، وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی بات جاری رکھوں؛ جب میں خاموش رہا تو وہ ضبط نہ کر سکا: وہ چاہتا تھا کہ جو کہہ چکا ہوں سے دہراؤں. ہاں، تو وہ یہ سوال کرتے ہیں؟ جب اس نے مجھے اقرار میں مسکراتا دیکھا تو فوراً برافروختہ ہو گیا. وہ یہ اس لیے نہیں پوچھ رہا کیونکہ اس کے خیال میں "انھوں نے" اسے پوچھا تھا، بلکہ اس نے یہ کن عندہ پوچھا ہے، بغیر یہ جانے ہوئے کہ انھوں نے اسے پوچھا تھا، اس کی بلا سے وہ چاہیں سو کریں۔ پھر، ایک عجیب سے لہجے میں، وہ بولا: "یوں لگتا ہے جیسے کوئی آواز میرے کانوں میں نغمہ سرا ہو۔" اس پراسرار آواز نے اسے اپنا باپ یاد دلا دیا تھا، اس نے بھی مرنے سے پہلے ایسی ہی آواز سنی تھی، لیکن اس کا گیت دوسرا تھا۔ "میری والی آواز وہی ٹیپ کا مصرع دہراتی رہتی ہے۔" اس نے کہا، اور تھوڑی سی خجالت سے معاً یہ اضافہ کیا، "میں جو ہوں وہی ہوں، میں جو ہوں وہی ہوں، آہ!"

میں تقریباً زور سے ہنس پڑا، لیکن اس لہر کو قابو میں رکھا۔ اگر یہ ایک بے ضرر سا مذاق تھا، تو ہنسنا اسے بھی چاہیے تھا؛ وہ ہنس نہیں رہا تھا؛ لیکن اس نے یہ ضرور محسوس کر لیا کہ مضحکہ خیز نظر آنے کے قریب تھا۔ مجھے یہ ظاہر کرنا پڑا کہ میں ٹیپ کے مصرعے کی مہملیت اور معنویت دونوں سے آگاہ ہوں؛ کیونکہ اس مرتبہ میں خود یہ چاہتا تھا کہ وہ جاری رہے۔ میں نے کہا کہ ٹیپ کا مصرع سنجیدگی سے برتے جانے کا متقضی ہے: اس میں کلام نہیں کہ جس نغمہ سرا کو اس نے سنا تھا، وہ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ شاید میری بات میں اسے تضحیک کا شائبہ نظر آیا ہو، کیونکہ وہ تاؤ میں آ گیا: اسے بھی یہ معلوم تھا، جس بات نے اسے چکرا دیا تھا وہ یہ تھی کہ آواز یہ ایک ہی فقرہ کیوں بار بار دہرائے جا رہی تھی!

وہ اس قدر مشتعل ہو گیا تھا کہ میں نے، ظاہر ہے، اسے نہیں بتایا، لیکن حقیقت یہ ہے جو میں سوچ رہا تھا وہ یہ تھا. مجھے معلوم تھا، نہ صرف ذاتی تجربے کی بنیاد پر، لیکن اپنے بھائی بہنوں کے تجربے کی بنیاد پر بھی، کہ وہ اکتاہٹ جو تُس جو بچے محسوس کرتے ہیں یا باثر نتائج پیدا کرتی ہے یا محض بکواس۔ میں نے کہا کہ قابلِ غور بات یہ نہیں تھی کہ اس نے ٹیپ کا مصرع کیوں سنا ہے، بلکہ اس کا مقصد کیا ہے۔ شاید اس وقت یہ خیال بھی مجھے آیا کہ کسی چیز پر اپنی توجہ منعطف نہ کرنے کی وجہ سے کہیں اس کا دماغ نہ چل جائے، اور کہ میں اس کا مشاہدہ کر کے خود اپنی مایوسی اور بزدلی کے پیدا کردہ جور و تعدی سے فرار حاصل

Scanned with CamScanner

کرسکتا ہوں۔ پھر یہ بھی کہ، شاید اس دفعہ میں اخلاص سے اس کی عزت کرنے کے قابل ہو جاؤں: اگر وہ ایسا کر سکے، تو ہو سکتا ہے کہ کوئی واقعی حقیقی چیز اب ہم دونوں کی زندگیوں میں رونما ہو۔ ''اچھا تو میں کیا کروں؟'' آخرکار اس نے کمال مجبوری سے پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ اس پر غور کرے کہ جیسا ہے ویسا کیوں ہے، اور یہ میں اسے کوئی نصیحت نہیں کر رہا ہوں، میں اس کی مدد نہیں کر سکتا، یہ تو اسے خود ہی کرنی پڑے گی۔ ''تو کیا کروں، آئینے میں دیکھوں؟'' اس نے طنزاً کہا۔ لیکن وہ کچھ کم برافروختہ نہیں نظر آ رہا تھا۔ میں کچھ نہ بولا، تاکہ اسے خود سوچنے کی مہلت دے سکوں۔ ''کیا میں آئینے میں دیکھوں؟'' اس نے دہرایا۔ اچانک مجھے غصہ آ گیا، مجھے لگا کہ خوجہ اپنے طور پر کبھی کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے اس بات کی آگہی ہو جائے، میں اس کے روبرو کہنا چاہتا تھا کہ میرے بغیر وہ سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن مجھے ہمت نہ پڑی: لاتعلقی کے انداز سے میں نے اس سے کہا کہ ہاں، جائیے اور آئینے میں دیکھیے۔ نہیں، مجھ میں ہمت کا فقدان نہیں تھا، بس میرا جی نہیں چاہا۔ وہ طیش میں آ گیا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا، اور جاتے جاتے چلایا، تم احمق ہو۔

تین دن بعد جب میں نے موضوع کو دوبارہ چھیڑا اور دیکھا کہ وہ ہنوز ''ان کے'' بارے ہی میں بات کرنا چاہتا ہے، تو کھیل جاری رکھنے سے مجھے فرحت ہوئی: نتیجہ کچھ بھی نکلے، صرف یہ دیکھنا کہ وہ کسی چیز میں مشغول ہو گیا ہے میری آس بڑھانے کے لیے بہت کافی تھا۔ میں نے کہا ''وہ'' آئینہ ضرور دیکھتے ہیں، اور حقیقت ہے کہ یہاں پر لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کثرت سے۔ نہ صرف بادشاہوں، شہزادوں، اور شرفا کے محل، بلکہ عام آدمیوں کی رہائش گاہیں بھی احتیاط سے فریم شدہ اور دیواروں پر آویزاں آئینوں سے اٹی پڑی ہوتی ہیں، صرف اس لیے نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ان کی اس اعتبار سے پیش رفت کا باعث ان کا اپنے بارے میں مسلسل غور و فکر کرنا ہے۔ ''کس اعتبار سے؟'' اس نے پوچھا، ایسے اشتیاق اور معصومیت سے جس نے مجھے تعجب میں ڈال دیا۔ مجھے لگا کہ وہ میری بات کے بارے میں سنجیدہ ہے، لیکن پھر اس نے دانت نکوسے ''تو تمھارا مطلب ہے وہ صبح سے رات تک آئینے میں تکتے رہتے ہیں!'' پہلی بار وہ میرے ملک کی اور جو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا اس کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ غصے میں آ کر میں کہنے کے لیے کوئی فقرہ ڈھونڈنے لگا جو اسے ٹھیس پہنچا سکے، اور، اچانک، بلا سوچے، بلا اس پر یقین کیے، میں نے اعلان کر دیا کہ صرف وہ خود ہی یہ دریافت کر سکتا ہے کہ وہ کون

Scanned with CamScanner

ہے، لیکن وہ اتنا مرد نہیں کہ اس کی کوشش کرے۔ اس کے چہرے کو اذیت سے مسخ ہوتے دیکھ کر مجھے لطف آیا۔

لیکن اس لطف کی مجھے بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس لیے نہیں کہ اس نے مجھے زہر دینے کی دھمکی دی: چند دن بعد، اس نے مطالبہ کیا کہ اس جرأت کا مظاہرہ کروں جس کی میں اس میں کمی کا دعویدار ہوں۔ پہلے تو میں نے اسے ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی: ظاہر ہے، نہ غور و فکر سے آدمی یہ دریافت کر سکتا ہے کہ کون ہے اور نہ آئینے میں دیکھ کر: یہ میں نے اسے بدمزہ کرنے کی خاطر غصے سے کہا تھا: لیکن ایسا لگا جیسے اسے مجھ پر یقین نہیں تھا۔ اس نے مجھے میری غذا میں تخفیف کرنے کی دھمکی دی، حتیٰ کہ اگر اپنی جرأت کا مظاہرہ نہ کیا تو کمرے میں بند کرنے کی بھی۔ میرے لیے یہ سوال کہ میں کون ہوں حل کرنا اور پھر اسے قلمبند کرنا ناگزیر ہے' وہ اس کا تجزیہ کرے گا، دیکھے گا مجھ میں کتنی جرأت ہے۔

۵

اول اول میں نے چند صفحات اپنے بھائی بہنوں، ماں اور نانی کے ساتھ ایمپولی میں ہماری مملوکہ اراضی پر اپنے پُر مسرت بچپن کے بارے میں رقم کیے۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے کیوں خاص طور پر ان یادوں کو یہ دریافت کرنے کے لیے کہ میں کیوں وہ ہوں جو ہوں قلمبند کیا' ہو سکتا ہے مجھے یہ تحریک اس آرزو کے باعث ہوئی ہو جس کا تعلق اس کھوئی ہوئی زندگی کی مسرت سے ہو: اور خوجہ نے میری اس غصے میں کہی ہوئی بات کے بعد مجھ پر اتنا دباؤ ڈالا تھا کہ میں مجبور ہو گیا تھا، جیسا کہ فی الوقت ہو گیا ہوں، کہ تصور میں کوئی ایسی چیز ایجاد کروں جو میرے قاری کے بے قابل یقین ہو اور اس کی تفاصیل کو پر لطف بناؤں۔ شروع میں جو میں نے لکھا خوجہ کو پسند نہیں آیا: ایسی باتیں تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے، اس نے کہا: اسے شک تھا کہ لوگ آئینے میں تکتے وقت یہی سب سوچتے ہیں، کیونکہ یہ وہ جرأت نہیں ہو سکتی جس کی میرے کہنے کے مطابق اس میں کمی تھی۔ اس کا ردعمل بالکل یہی اس وقت بھی ہوا جب اس نے پڑھا کہ اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ ایلپس میں ایک شکاری مہم کے دوران میں اچانک کیسے ایک ریچھ کے روبرو آ گیا تھا، کیسے ہم بڑی دیر تک ایک دوسرے کو کھڑے گھورتے رہے تھے، یا اپنے محبوب کو جوان کو بسترِ مرگ پر دیکھ کر میرے کیا محسوسات تھے جو ہماری نظروں کے سامنے خود اپنے ہی گھوڑوں کے پیروں

Scanned with CamScanner

کے نیچے کچلا گیا تھا ایسی باتیں تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔

اس پر میں نے جواب دیا کہ وہاں لوگ اس سے زیادہ نہیں کرتے تھے، جو میں نے پہلے کہا وہ مبالغہ آمیز تھا، میں غصے میں جو تھا، اور خوجہ اس سے زیادہ کی توقع مجھ سے نہ کرے۔ لیکن وہ سن کہاں رہا تھا: کمرے میں بند کر دیے جانے کے خیال سے مجھے خوف آتا، سو میں جو پیکر ذہن میں آتے لکھتا چلا گیا۔ اس طرح میں نے دو ماہ کبھی دکھ سے اور کبھی خوشی سے اس قسم کی بہت سی یادوں کے احیا اور بازخوانی میں گزارے جو زیادہ تر غیر اہم تھیں لیکن یاد کرنے میں خوشگوار۔ غلام بنائے جانے سے پہلے کے اچھے اور برے تجربات جو مجھے پیش آئے تھے انھیں تصور میں جگایا اور دہرایا، اور آخر میں محسوس کیا کہ اس مشق سے مجھے مزہ آرہا ہے۔ اب خوجہ کو مجھے لکھنے پر مجبور کرنے کی حاجت نہیں رہی تھی: جب بھی وہ کہتا کہ اسے اطمینان نہیں ہوا، میں کسی دوسری یاد کی طرف چل پڑتا، کسی دوسری کہانی کی طرف جس لکھنے کا انتخاب میں نے پیشگی کرلیا ہوتا۔

بہت بعد میں، جب میں نے دیکھا کہ خوجہ میرے لکھے ہوئے سے بھی لطف لیتا تھا، میں اسے اس کارروائی میں لگانے کا موقع تلاش کرنے لگا۔ زمین ہموار کرنے کے لیے میں نے بچپن کے چند تجربات کا ذکر کیا جو مجھے پیش آئے تھے میں نے اس سے ایک غیر مختتم، بے خواب رات کی دہشت کا ذکر کیا جو میرے قریب ترین دوست کی وفات کے بعد آئی تھی، وہ دوست جس کے ساتھ مجھے ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی، مجھے کتنا ڈر لگا تھا کہ مجھے مردہ تصور کرلیا جائے گا اور اس کے ساتھ زندہ دفن کر دیا جائے گا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ یوں اس پر فریفتہ ہو جائے گا! جلد ہی میں نے اس سے پنا ایک خواب بیان کرنے کی جرأت بھی کر ڈالی: میرا جسم مجھ سے جدا ہو گیا ہے، میرے ایک ہم شکل سے جوڑ دیا گیا ہے جس کا چہرہ سایوں میں پوشیدہ ہے، اور وہ دونوں مل کر میرے خلاف سازش کررہے ہیں۔ اس وقت خوجہ کہہ رہا تھا کہ وہی مضحکہ خیز ٹیپ کا مصرع اسے دوبارہ اور زیادہ شدت سے سنائی دے رہا ہے۔ جب میں نے دیکھا، جیسا کہ میری آرزو تھی، کہ خواب نے اسے متاثر کیا ہے، میں نے اصرار کیا کہ اس قسم کی نگارش ایسی چیز ہے جو اسے بھی آزمانی چاہیے۔ یہ اس لامتناہی اور آرزومندانہ انتظار سے اس کی توجہ پھیر سکے گی، اور وہ اس چیز کو دریافت کرسکے گا جو اسے اپنے احمقوں سے جدا کرتی ہے۔ گاہے گاہے اسے محل بلایا جاتا، لیکن وہاں امید افزا پیش رفت نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے

Scanned with CamScanner

مزاحمت کی، لیکن جب میں نے دباؤ ڈالا، تو متجسس ہوا، منفعل اور اٹکتا ہوا کہ بولا کوشش کرے گا۔ اسے اپنے مضحکہ خیز نظر آنے کا خوف تھا اور، یہاں تک کہ مجھ سے پوچھا: جیسے ہم ساتھ ساتھ لکھا کرتے تھے، اس طرح ساتھ ساتھ آئینے میں خود کو دیکھیں گے بھی؟

جب اس نے کہا اس کی خواہش ہے ہم ساتھ ساتھ بیٹھ کر لکھیں، مجھے گمان بھی نہ ہوا کہ اس کا منشا بھی ٹھیک یہی ہے کہ میز پر ساتھ ساتھ بیٹھیں۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ جب وہ لکھنا شروع کرے گا، مجھے ایک کاہل الوجود غلام کی فارغ البالی واپس مل جائے گی۔ میں غلطی پر تھا۔ اس نے کہا کہ ہم دونوں میز کے انتہائی سروں پر آمنے سامنے بیٹھ کر لکھیں: ہمارے ذہن، ان خطرناک موضوعات کا سامنا کرنے کے دوران بھٹکیں گے، فرار حاصل کرنے کی جستجو کریں گے، اور صرف اسی طرح ہم راہ پر گامزن ہو سکیں گے، صرف اسی طرح ہم نظم و ضبط کی روح سے ایک دوسرے کو مستحکم کر سکیں گے۔ لیکن یہ سب بہانے تھے، مجھے معلوم تھا کہ وہ اکیلے رہ جانے سے خوفزدہ ہے، غور و فکر کرتے وقت اپنی تنہائی کو محسوس کرنے سے ہراساں ہے۔ میرے واسطے اس بات کی توثیق اس طرح بھی ہوگئی کہ خالی صفحے کا سامنا کرتے وقت وہ بڑبڑانے لگتا، جو صرف اتنی بلند ہوتی کہ میں سن سکوں، وہ اس کا منتظر ہوتا کہ جو لکھنے والا ہے اس پر پہلے میری صوابدید حاصل کرلے۔ چند جملے گھسیٹنے کے بعد، وہ مجھے ایک بچے کی معصوم انکساری اور اشتیاق سے دکھاتا کیا یہ چیزیں لکھی جانے کے لائق ہیں، وہ حیرانی سے سوچتا۔ ظاہر ہے، میں اپنی منظوری دے دیتا۔

اس طرح دو مہینوں کے اندر اندر میں نے اس کی زندگی کے بارے میں گزشتہ گیارہ سالوں سے زیادہ جان لیا۔ اس کا خاندان 'یدرنہ' میں رہتا تھا، وہ شہر جس کی ہم نے بعد میں حاکم کے ساتھ زیارت کی۔ اس کا باپ کم عمری ہی میں مر گیا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس کا چہرہ بھی یاد ہو۔ اس کی ماں ایک محنت کش عورت تھی۔ اس نے اس کے باپ کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ پہلے شوہر سے اس کے دو بچے پیدا ہوئے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ دوسرے شوہر سے چار بیٹے۔ یہ شخص ایک رضائی بنانے والا تھا۔ بچوں میں پڑھنے لکھنے کی طرف سب سے زیادہ مائل ظاہر ہے وہی تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین، ہوشیار، محنتی، اور طاقتور بھی وہی تھا، اور سب سے زیادہ ایماندار بھی۔ وہ ان سبھوں کو نفرت کے ساتھ یاد کرتا، سوائے اپنی بہن کے، لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ یہ

سب تحریر میں لانے کے قابل باتیں ہیں۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی، شاید اس لیے کہ مجھے اسی وقت احساس ہو گیا تھا کہ آگے چل کر میں اس کے انداز اور اس کی زندگی کی حکایت کو اپنانے والا ہوں۔ اس کی زبان اور اس کی ذہنی ساخت میں کوئی چیز تھی جو مجھے بڑی دل آویز لگتی اور میں خود اس میں مہارت حاصل کرنا چاہتا۔ آدمی کو چاہیے کہ اس زندگی سے جو اس نے منتخب کی ہے اتنی محبت ضرور کرے کہ اختتام پر اسے اپنا کہہ سکے، اور میں اپنی زندگی سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں۔ ظاہر ہے، وہ اپنے سارے بھائیوں کو بے وقوف سمجھتا تھا، وہ صرف اس سے پیسے اینٹھنے کی خاطر ہی اسے ڈھونڈ نکالتے تھے؛ جبکہ اس نے خود کو مطالعے کے واسطے وقف کر دیا تھا۔ سلیمیہ مدرسے میں قبول کیے جانے کے بعد جب وہ فارغ التحصیل ہونے ہی والا تھا اس پر ایک جھوٹا الزام لگا دیا گیا۔ اس نے اس واقعے کا دوبارہ کبھی ذکر نہیں کیا، نہ کبھی عورتوں کا۔ بالکل آغاز میں اس نے رقم کیا کہ ایک موقعے پر وہ شادی کرنے کے بالکل قریب آ گیا تھا، پھر مارے غصے کے اس نے جو کچھ تحریر کیا تھا اسے پھاڑ ڈالا۔ اس رات ایک بڑی غیظ کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ بہت سی ہیبت ناک راتوں میں کی پہلی رات تھی جنھیں میں بعد میں جھیلنے والا تھا۔ اس نے میری بے عزتی کی، کہا کہ جو اس نے لکھا ہے سب جھوٹ ہے، اور دوبارہ شروع ہو گیا، اور چونکہ اس کا فرمان تھا کہ میں بھی روبرو بیٹھ کر لکھوں، مجھے دو دن بغیر سوئے ہوئے گزارنے پڑے۔ میں جو لکھتا اس پر اب وہ کوئی توجہ نہ دیتا، میں میز پر اپنے سرے پر بیٹھا رہتا، جو لکھا ہوتا اس کی نقل بناتا، اپنے تخیل سے کوئی کام لیے بغیر، اور اپنی آنکھ کے گوشے سے اسے دیکھتا رہتا۔

چند دن بعد، اس قیمتی، صاف، سفید، مشرق سے درآمدہ کاغذ پر، اس نے سرخی لگائی "میں کیوں وہ ہوں جو ہوں"، لیکن اس عنوان کے تحت، ہر صبح، اس نے اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے "وہ" اتنے کبیر اور احمق تھے۔ تاہم، مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ ماں کے انتقال کے بعد اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا، اپنے ورثے سے جس قدر پیسہ بازیاب کر سکا اسے لے کر استنبول چلا آیا، درویشوں کی ایک اقامت گاہ میں چند دن ٹھہرا لیکن یہ فیصلہ کر کے کہ وہاں کے سارے لوگ سفلے اور جعلی تھے اسے چھوڑ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ درویش گھر میں جو تجربات اسے پیش آئے تھے ان کے بارے میں کچھ اور معلوم کروں، میرا خیال تھا کہ ان سے علاحدگی اس کے واسطے حقیقی کامیابی ثابت ہوئی تھی، وہ اپنے کو ان سے جدا دیکھنے پر قادر ہوا تھا۔ میں نے جب اس کا ذکر کیا تو وہ غصے میں آ گیا، بولا کہ

Scanned with CamScanner

میں اس سے گھنونی باتیں سننا چاہتا ہوں تاکہ ایک روز انھیں اس کے خلاف استعمال کر سکوں: بہرکیف میں پہلے ہی اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہوں، مستزاد یہ کہ اسے شک ہو رہا ہے کہ میں اب وہ تفصیلات بھی جاننا چاہتا ہوں یہاں اس نے ایک ویسا جنسی فقرہ کہا جو ناشائستہ خیال کیے جاتے ہیں۔ پھر وہ بڑی دیر تک اپنی بہن سیرا کے بارے میں گفتگو کرتا رہا، کہ وہ کتنی پاکباز تھی اور اس کا شوہر کتنا بدمعاش، اس نے اتنے سالوں تک اسے نہ دیکھنے پر تأسف کا اظہار کیا، لیکن جب میں نے اس میں اپنی دلچسپی ظاہر کی تو ایک بار پھر شک وشبہ کرنے لگا، ور کسی دوسرے ہی موضوع کی طرف گریز کیا: تو جب اس نے پلّو میں جس قدر پیسے تھے کتابوں پر خرچ کر دیے، تو اس کے بعد سوائے ایک مدت مدید تک انھیں پڑھنے کے اس نے کچھ اور نہیں کیا، بعد میں جہاں تہاں منشی گیری کی — لیکن لوگ اتنے بے حیا تھے — اور پھر اسے صادق پاشا کا خیال آیا، جس کی موت کی خبر ایرزنجان سے ابھی آئی تھی۔ انھیں دنوں میں خوجہ کی اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، اور فوراً ہی سائنس سے اپنی محبت کے باعث اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ یہ پاشا ہی تھا جس نے خوجہ کو ابتدائی اسکول میں پڑھانے کی نوکری دلوائی تھی، لیکن وہ ایک اور احمق تھا۔ لکھنے کے اس دورے کے اختتام پر، جو مہینہ بھر قائم رہا، یک رات، نادم ہو کر، اس نے سارے لکھے کو چندی چندی کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ، اس کی جلد بازی میں گھسیٹی ہوئی تحریروں اور خود اپنے تجربات کو باردگر متشکل کرتے ہوئے، جس میں صرف اپنے تخیل پر اعتماد کرتا ہوں، مجھے ان تفصیل سے، جن میں مجھے اس قدر کشش نظر آتی ہے، اور زیادہ مغلوب ہو جانے سے خوف نہیں آتا۔ جوش کے ایک آخری طرارے میں اس نے چند صفحات لکھے جنھیں "حمق جن سے میں کما حقہ واقف تھا" کے تحت منضبط کیا گیا تھا، لیکن پھر بھڑک اٹھا: یہ سب لکھنا لکھانا، اس سے اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا ہے، اس نے کوئی نئی بات نہیں سیکھی ہے، اور اسے ابھی تک نہیں معلوم کہ وہ جیسا ہے ویسا کیوں ہے۔ میں نے اسے فریب دیا ہے، میں نے اسے خواہ مخواہ ان باتوں کو سوچنے پر لگایا ہے جنھیں وہ نہیں چاہتا کہ یاد کرے۔ وہ مجھے سزا دینے والا ہے۔

معلوم نہیں سزا دینے کا یہ خیال، جو ہمارے باہم گزارے ہوئے اولین دنوں کی یاد تازہ کر دیتا، کیوں اس قدر اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ یہ میری بزدلانہ اطاعت گذاری ہے جس نے اسے بے باک کر دیا ہے۔ لیکن جس لمحے اس نے سزا کی بات کی، میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا

Scanned with CamScanner

فیصلہ کرڈالا۔ جب خوجہ ماضی کے بارے میں لکھنے سے پوری طرح اکتا گیا، تو کچھ دیر تک گھر میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جب وہ دوبارہ میرے پاس آیا تو بولا کہ ہمیں چاہیے فی نفسہ خیال ہی کو لکھیں جیسے آدمی اپنے حلیے کو آئینے میں دیکھ سکتا ہے، اپنے جوہر کی خود اپنے خیالات میں جانچ پڑتال کرسکتا ہے۔

تمثیل کے چمکیلے تناسب نے مجھے بھی جوش دلا دیا۔ ہم فوراً میز پر آ بیٹھے۔ اس مرتبہ میں نے بھی، گو نیم طنزیہ طور پر، "میں جو ہوں کیوں ہوں" صفحے کے بالکل اوپر نقش کردیا۔ فوراً ہی، چونکہ بات ذہن میں اس چیز کی طرح آئی جو میری ذات کا تشخص کرتی ہو، میں نے اپنی کم آمیزی سے متعلق بچپن کی یادکو تحریر میں لانا شروع کیا۔ پھر، جب میں نے وہ پڑھا جو خوجہ دوسروں کی خباثت کے بارے میں لکھ رہا تھا، مجھے ایک خیال آیا جو اس وقت اہم معلوم ہوا، اور میں نے کہہ دیا۔ خوجہ کو اپنے معائب کی بابت بھی لکھنا چاہیے۔ میں نے جو لکھا تھا اسے پڑھنے کے بعد، اس نے اصرار کیا کہ وہ بزدل نہیں ہے۔ میں نے یہ استدلال پیش کیا کہ گرچہ وہ بزدل نہیں، دوسروں ہی کی طرح اس کے منفی پہلو بھی ہیں، اور اگر وہ ان کی تہہ میں جائے تو اپنی حقیقی ذات کو پاسکتا ہے۔ میں یہ کرچکا تھا، اور وہ مجھ جیسا ہونا چاہتا ہے، یہ مجھے اس میں صاف دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے جب یہ کہا تو دیکھا کہ وہ برہم ہونے لگا ہے، لیکن اس نے خود پر قابو پالیا، ہوشمندی برتنے کی کوشش کی، بولا کہ یہ دوسرے ہیں جو مذموم ہیں، یقیناً، ہر کوئی نہیں، لیکن چونکہ زیادہ تر لوگ نامکمل اور منفی ہیں، اسی لیے دنیا میں ہر چیز غلط ہورہی ہے۔ اس پر میں نے اختلاف کیا، یہ کہہ کر کہ خود اس میں بہت کچھ خباثت ہے، حتیٰ کہ کراہت انگیز، اور اسے یہ پہچاننا چاہیے۔ میں نے بےباکی سے یہ اضافہ بھی کردیا کہ وہ مجھ سے بدتر ہے۔

اس طرح شر کے ان مہمل اور ہیبت ناک دنوں کی ابتدا ہوئی۔ وہ مجھے میری میز کے پاس کرسی سے باندھ دیتا اور میرے روبرو بیٹھ جاتا، جو جی میں آتا لکھوانے کا حکم دیتا، لیکن کیا لکھوانا چاہتا ہے اس کا اسے اب علم نہیں تھا۔ اس تمثیل کے علاوہ اس کے دماغ میں کوئی اور چیز نہیں تھی جیسے ایک شخص آئینے میں اپنی ظاہری شکل دیکھ سکتا ہے، اس طرح وہ اپنے خیالات میں اپنے اندرونِ دماغ کا مشاہدہ بھی کرسکتا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے اس کی ترکیب معلوم ہے لیکن اس پر منکشف کرنے سے محترز ہوں۔ جب خوجہ میرے سامنے بیٹھتا، اس انتظار میں کہ میں اس کا اقرار لکھوں، میں صفحے کے صفحے خود اپنے معائب کی مبالغہ آمیز باتوں سے سیاہ کردیتا میں نے مزے لے لے کر اپنے بچپن کی چھوٹی چھوٹی چوریوں کے

بارے میں لکھا، حاسدانہ جھوٹ، وہ سازشیں جو میں اپنے کو تمام بھائی بہنوں سے زیادہ محبوب بنانے کے لیے کرتا، اپنی جوانی کی جنسی لغزشیں، اور جوں جوں بیان میں آگے بڑھتا گیا، سچ کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دیا۔ جس حریصانہ تجسس سے خوجہ نے ان کہانیوں کو پڑھا، ان سے عجیب لذت اٹھائی، اس پر مجھے دھچکا سا لگا۔ بعد میں وہ اور زیادہ غصے میں آ جاتا، اپنے ظالم برتاؤ میں زیادتی کرتا جو پہلے ہی ساری حدود سے آگے نکل چکا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ ایک ایسے ماضی کے گناہوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جس کے بارے میں اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اسے اپنانے والا ہے۔ اب وہ مجھے برملا زدوکوب کرنے لگا۔ میری کسی زیادتی کی بابت پڑھنے کے بعد، وہ چلاتا، "بدمعاش!" اور میری کمر پر ایک مکا رسید کر دیتا جس کی شدت نصف ہی مداقا ہوتی؛ ایک دو بار، بے قابو ہو کر، اس نے میرے منھ پر تھپڑ بھی مارا۔ اس طرزِ عمل کا سبب یہ رہا ہو کہ اب اسے تحمل سے کم سے کم بلاوا آتا، یا یہ رہا ہو کہ اس نے خود کو یقین دے لیا تھا کہ اپنی توجہ بٹانے کے لیے اب ہم دونوں کے سوا اسے کوئی اور چیز نہیں ملے گی، شاید یہ محض مایوسی کے باعث ہو۔ لیکن جتنا زیادہ اس نے میری معصیتوں کے بارے میں پڑھا اور اپنی گھٹیا، بچکانی عقوبتوں میں اضافہ کیا، اتنا ہی زیادہ میں سلامتی کے ایک مخصوص احساس میں لپٹتا چلا گیا: پہلی بار میں یہ سوچنے لگا کہ وہ اب میری مٹھی میں آ گیا ہے۔

ایک بار، جب مجھے بڑی بری طرح مجروح کر چکا، تو میں نے دیکھا کہ اسے مجھ پر رحم آ رہا ہے، لیکن یہ ایک مہلک جذبہ تھا جس میں اس کراہت کی چھوٹ بھی پڑ رہی تھی جو آدمی کسی ایسے کے لیے محسوس کرتا ہے جسے وہ کسی اعتبار سے بھی اپنا ہمسر نہ سمجھتا ہو: مجھے یہ اس انداز میں بھی محسوس ہوئی جب وہ آخرکار مجھے بغیر کسی تنفر کے دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ "چلو اب اور نہ لکھیں،" اس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم اب مزید لکھو۔" پھر اس نے اپنی تصحیح کی، کیونکہ ہفتوں گزر گئے تھے جن میں وہ مجھے اپنی خامیوں کے بارے میں لکھتے ہوئے محض دیکھتا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ہمیں یہ گھر، جو دن بدن افسردگی میں ڈوبتا جا رہا ہے، چھوڑ دینا چاہیے، کوئی تفریحی سفر کرنا چاہیے، شاید گھوڑے کا۔ وہ ایک بار پھر فلکیات سے متعلق اپنے کام کی طرف منعطف ہونے والا ہے، اور وہ چیونٹیوں کے طرزِ عمل پر ایک اور بلاکم و کاست مقالہ رقم کرنے کا سوچ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے نزدیک میری ساری عزت کھو جانے کے قریب ہے میرے کان کھڑے ہو گئے، چنانچہ اس کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے میں نے ایک اور کہانی گھڑی جو

میری بدمعاشی کو سخت ناخوشگوار روشنی میں پیش کرنے والی تھی۔ خوجہ نے اسے مزے لے لے کر پڑھا اور ذرا بھی غصہ نہ ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسے محض اس بات سے دلچسپی ہے کہ میں انتاپرلے درجے کا شرپسند آدمی ہوتا آخر کس طرح گوارا کرسکا ہوں۔ اور شاید، یہ بھی کہ اتنی رذالت کو دیکھتے ہوئے، وہ مزید میری نقالی نہیں کرنا چاہتا، آخر تک جو ہے وہی رہنے پر قانع ہے۔ یقیناً، اسے معلوم تھا کہ اس میں کسی نہ کسی کھیل کا عنصر موجود تھا۔ اس دن میں نے محل کے کسی چاپلوس کی طرح گفتگو کی جو جانتا ہے کہ اس کا حقیقی مردوں میں شمار نہیں ہوتا؛ میں نے اس کے تجسس کو اور زیادہ ابھارنے کی کوشش کی اس کا کیا بگڑے گا اگر، کیبز ے جانے سے قبل، وہ ایک آخری کوشش اور کرے — یہ جاننے کے لیے میں جیسا ہوں ویسا کیسے ہوسکتا ہوں۔ کہ خود اپنے نقائص کے بارے میں لکھے؟ ضروری نہیں جو وہ لکھے وہ برحق بھی ہو، اور نہ کسی کا اس پر یقین کرنا ہی ضروری ہے۔ اگر وہ یہ کرے تو میں اور مجھ جیسے اس کی سمجھ میں آسکتے ہیں، اور ایک روز یہ علم اس کے لیے کارآمد ثابت ہوگا؛ انجام کار، اپنے تجسس اور میری بڑبڑاہٹ کی تاب نہ لاکر، اس نے کہا کہ وہ روز آئندہ اس کی کوشش کرے گا۔ بے شک، وہ یہ اضافہ کرنا نہیں بھولا کہ وہ یہ صرف اس لیے کرے گا کہ خود یہ کرنا چاہتا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ میرے احمقانہ کھیل کے دام میں آگیا ہے۔

اگلا دن، غلامی میں گزارے ہوئے میرے سارے دنوں سے زیادہ فرحت بخش ثابت ہوا۔ اگرچہ اس نے مجھے کرسی کے ساتھ نہیں باندھا، میں نے سارا دن اس کے روبرو بیٹھے گزارا تاکہ اسے کوئی اور آدمی بنتے ہوئے دیکھنے کا لطف اٹھا سکوں۔ وہ جو کررہا تھا شروع میں اس پر اتنی شدت سے یقین کیا کہ صفحے کے اوپر اپنے اس احمقانہ عنوان کے ڈالنے کی پروا بھی نہیں رہی: ''میں جو ہوں، کیوں ہوں۔'' اس میں ایک شرارتی بچے کے اعتماد کی ادا تھی جو کسی پرفریب دروغ کا متلاشی ہو۔ میں ایک نظر ہی میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ ہنوز اپنے کنجِ عافیت میں محصور ہے۔ لیکن مامونیت کا یہ پھولا ہوا احساس زیادہ دیر قائم نہیں رہا، نہ ہی پشیمانی کا وہ سوانگ جو اس نے میری خاطر بھرا تھا۔ جلد ہی اس کی دکھاوے کی حقارت تشویش میں تبدیل ہوگئی، جیسے سچ مچ کا ہوگیا، اس خود ازرائی پر عمل پیرا ہونے سے، ہرچند کہ یہ خالی خولی ہی تھی، وہ متحیر اور خوفزدہ ہوگیا۔ جو کچھ تحریر کیا تھا، مجھے دکھائے بغیر، فوراً قلم زد کردیا۔ لیکن اس کے تجسس میں خرش آچکی تھی، اور مجھے گمان ہوا کہ وہ میرے سامنے خود کو شرمسار محسوس کررہا ہے، کیونکہ اس نے یہ عمل جاری رہنے دیا۔ تاہم اگر اس نے اپنی اولین تحریک کا تعاقب کیا ہوتا اور میز سے فوراً اٹھ گیا ہوتا، تو

Scanned with CamScanner

شاید اپنا ذہنی سکون برہم نہ ہونے دیتا۔

اگلی چند ساعتوں کے دوران میں نے اس کے اپنی کشمکش سے آہستہ آہستہ باہر نکلنے کا منظر دیکھا: وہ کچھ لکھتا جس میں اپنے بارے میں نکتہ چینی ہوتی اور مجھے دکھائے بغیر پھاڑ دیتا، اور ہر مرتبہ اپنی خود اعتمادی اور توقیرِ نفس کچھ اور کھو دیتا، لیکن پھر وہ دوبارہ لکھنا شروع کرتا، اس امید میں کہ جو ہاتھ سے جا تا رہا ہے اس کی بازیافت ہو سکے۔ بظاہر وہ اپنے اعترافات مجھے دکھانے والا تھا؛ رات آتے تک میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں دیکھا تھا جنھیں پڑھنے کو میں بے قرار تھا، اس نے سب پھاڑ ڈالے اور پھینک دیے تھے، اور اس کی طاقت بھی صرف ہو چکی تھی۔ جب وہ مجھے سب و شتم کرنے لگا، یہ کہہ کر کہ یہ سب ایک قابلِ نفرین کافر کا کھیل تماشا ہے، اس کی خود اعتمادی اس قدر پست ہو چکی تھی کہ میں نے شوخ چشمی سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ تاسف محسوس نہ کرنے کا، شر انگیز آدمی ہونے کا عادی ہو جائے گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھر سے باہر چلا گیا، شاید اس لیے کہ اپنا مشاہدہ کروانے کی تاب نہیں رہی تھی، اور جب وہ دیر سے لوٹا تو اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی عطریات کی مہک سے میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ، جیسا کہ میرا گمان تھا، طوائفوں کے یہاں گیا تھا۔

اگلی دوپہر، خوجہ کو کام جاری رکھنے کی تحریک دلانے کے لیے، میں نے کہا کہ وہ یقیناً اتنا مضبوط ضرور ہے کہ اس قسم کے بے ضرر کھیلوں سے منفی اثر نہ لے۔ بنابریں، یہ ہم کچھ سیکھنے کے لیے ہی کھیل رہے ہیں، محض وقت گزاری کے لیے نہیں، اور انجام کار وہ یہ جان سکے گا کہ جنھیں وہ احمق کہتا ہے، کیوں ایسے ہیں۔ کیا ایک دوسرے کو واقعی جان لینے کی توقع کافی پرکشش نہیں؟ آدمی جتنا کسی ڈراؤنے خواب سے سحر زدہ ہوتا ہے، اتنا ہی اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ کسی غیر کو اس کی روح کی ادنیٰ ترین باتوں کا علم ہے۔

یہ وہ نہیں تھا جو میں نے کہا تھا، جسے اس نے بس اتنی ہی سنجیدگی سے برتا جس سے وہ محل کے کسی بونے کی خوشامد کو برتتا تھا، بلکہ روزِ روشن کا اجالا تھا جس نے اسے دوبارہ میز کے آگے بیٹھ جانے کی تحریک دلائی۔ جب اس شام وہ میز سے اٹھا، اس کا خود پر اعتماد گزشتہ دن سے بھی کم ہو گیا تھا۔ اس رات جب میں نے اسے پھر طوائفوں کی طرف جاتے دیکھا تو اس کی حالت پر رحم آیا۔

القصہ، وہ ہر صبح میز کے پاس جا بیٹھتا، اس یقین کے ساتھ کہ اُس دن جن بدیوں کے بارے

Scanned with CamScanner

میں لکھنے والا ہے، ان کے ماورا جانے کا اہل ہے، اور اس امید میں کہ جو کل کھویا ہے آج دوبارہ پالے گا، پھر ہر شام اٹھ کھڑا ہوتا، اپنی رہی سہی خود اعتمادی کا کچھ حصہ میز پر چھوڑ کر۔ اب چونکہ وہ خود کو ناقابل لحاظ پانے لگا تھا، مزید مجھے ناقابل لحاظ نہیں سمجھ سکتا تھا: مجھے لگا کہ آخر کار اس مساوات کی میرے لیے تھوڑی بہت تصدیق ہوگئی ہے جو ہماری باہم زندگی کے اولین دنوں میں میں نے غلطی سے ہمارے درمیان تصور کر لی تھی؛ اس سے مجھے بڑی فرحت ہوئی۔ چونکہ وہ مجھ سے محتاط رہتا، بولا کہ میرے لیے اس کے ساتھ میز پر بیٹھنا ضروری نہیں۔ یہ بھی اچھی علامت تھی، لیکن میرے غصے نے، جو برسوں سے قوتِ ضرب جمع کرتا رہا تھا، فیصلہ کن قدم اٹھانے کا ارادہ کر ڈالا۔ میں انتقام لینا چاہتا تھا، حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی کی طرح، میں بھی اپنا توازن کھو چکا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر خوجہ کو اس کی ذات کے بارے میں کچھ اور شک میں مبتلا کر دوں، اگر اس کے نوشتہ اعترافات میں سے چند ہی پڑھ لوں، جنھیں وہ مجھ سے بڑی احتیاط کے ساتھ پوشیدہ رکھے ہوئے ہے، اور لطیف انداز میں اسے خفیف کروں، تو گھر کا غلام اور عاصی وہ ہوگا، میں نہیں۔ اور بہرکیف اس کی علامتیں پہلے ہی سے موجود تھیں: میں دیکھ سکتا تھا کہ اسے جب تب یہ جاننے کی ضرورت رہتی کہ میں اس کا تمسخر اڑا رہا ہوں یا نہیں۔ اسے مزید خود پر یقین نہیں رہا تھا، چنانچہ میری رضامندی کا جویا تھا۔ اب وہ روزمرہ کی ادنیٰ سے ادنیٰ باتوں کے متعلق میری رائے زیادہ سے زیادہ دریافت کرنے لگا تھا کیا اس کا لباس موزوں ہے، وہ جواب جو اس نے کسی کو دیا تھا ٹھیک ٹھاک ہے، کیا مجھے اس کا خط پسند ہے، میں کیا سوچ رہا ہوں؟ یہ نہ چاہتے ہوئے کہ وہ بالکلیہ مایوس ہو جائے اور کھیل کو بیچ ہی میں چھوڑ دے، میں بعض اوقات خود اپنی تنقید کرتا تا کہ اس کا حوصلہ بڑھے۔ وہ مجھے اسی نظر سے دیکھتا جیسے مجھے "بدمعاش" کہہ رہا ہو، لیکن اب مجھے مزید زدوکوب نہیں کرتا تھا: مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ خود کو بھی قابلِ زدوکوب سمجھنے لگا ہے۔

میں ان اعترافات کے بارے میں سخت متجسس تھا جنھوں نے اس میں اس قدر خود تنفری پیدا کر دی تھی۔ چونکہ میں اس کے ساتھ ایک کمتر کا برتاؤ کرنے کا عادی تھا، پوشیدہ طور پر ہی سہی، میرا خیال تھا یہ اعترافات چھوٹی موٹی بے اہمیت معصیتوں کے بارے میں ہوں گے۔ اب جبکہ میں اپنے ماضی کی حقیقت آفرینی کرتا ہوں، اور اپنے سے کہتا ہوں کہ ان اعترافات میں کے ایک دو کو تفصیل کے ساتھ تصور میں لاؤں جن کا ایک جملہ تک میں نے نہیں پڑھا تھا، مجھے ایک بھی ایسا گناہ نہیں ملتا جس کا خوجہ

Scanned with CamScanner

مرتکب ہوا ہو جو میرے قصے کے ربط واستواری اور اس زندگی کو جو میں نے اپنے لیے تصور کی ہے تباہ کر سکے۔ لیکن میرا گمان ہے کہ میری سی حالت والا کوئی شخص اپنے پر از سرِ نو بھروسا کرنا سیکھ سکتا ہے۔ مجھے کہنا ہی پڑے گا کہ میں نے خوجہ کو اس قابل کیا کہ وہ ایک دریافت کر سکے بغیر اس کا احساس کیے ہوئے، یہی کہ میں نے خود اپنی اور اپنے جیسے دوسروں کی خامیوں کو اس پر عیاں کیا ہے، مکمل اور قطعات بھی سہی میں نے غالباً یہ خیال کیا کہ وہ دن دور نہیں جب میں اسے اور دوسروں کو بتا سکوں گا کہ ان کے بارے میں میری کیا رائے ہے؛ میں انھیں ان کی خباثت کا ثبوت مہیا کر کے تباہ کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میری کہانی کے قارئین کو یہ احساس ہو گیا ہو گا کہ میں نے بھی خوجہ سے اتنا ہی سیکھا تھا جتنا اس نے مجھ سے! ہو سکتا ہے میں اب اس طرح صرف محسوس ہی کرتا ہوں کیونکہ جب ہماری عمر بڑھ جاتی ہے، ہم بھی زیادہ تناسب کے متلاشی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ان قصوں میں بھی جو پڑھتے ہیں۔ ہو نہ ہو میں ایک ناراضگی کے مارے، جو برسہا برس سے طاقت اکٹھا کر رہی تھی، ابل پڑا ہوں۔ جب خوجہ نے پیٹ بھر کے اپنی خفت کروالی ہوگی، میں اس سے اپنی برتری قبول کرواؤں گا، یا کم از کم اپنی خود مختاری، اور پھر استہزا کے ساتھ اپنی آزادی کا مطالبہ کروں گا۔ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے آزاد کر دے گا، حتیٰ کہ اس پر جھینپے گا بھی نہیں، سوچ رہا تھا کہ وطن لوٹنے پر ترکوں کے درمیان اپنی جوکھوں بھری مہم جوئیوں پر کتابیں لکھوں گا۔ تناسب کا جملہ احساس کھو دینا میرے لیے کتنا آسان تھا! ایک صبح جو خبر وہ لایا اس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

شہر میں طاعون پھیل گیا تھا! چونکہ اس نے اس کا ذکر کچھ اس طرح کیا جیسے کسی اور ہی، دور افتادہ، جگہ کی بات کر رہا ہو، استنبول کی نہیں، پہلے میں نے اس پر یقین نہیں کیا: میں نے پوچھا کہ اسے یہ خبر کیسے ملی، میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اچانک اموات کی تعداد بغیر کسی وجہ کے بڑھتی جا رہی تھی، شاید کسی بیماری کے باعث۔ میں نے پوچھا کہ بیماری کی کیا علامتیں تھیں ـــ شاید طاعون نہ رہا ہو۔ خوجہ مجھ پر ہنس پڑا: مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے، اگر مجھے یہ آ لگی تو بغیر کسی شک وشبے کے جان لوں گا، جان لینے کے لیے آدمی کے پاس بخار کے صرف تین ہی دن ہوتے ہیں۔ بعضوں کے کان کے عقب میں سوجن ہو جاتی ہے، بعضوں کو بغل میں، پیٹ پر، کبھی پھیپھڑوں سے خون آنے لگتا ہے، اور ایسے بھی تھے جو تپ دق کے مریضوں کی طرح شدت سے کھانستے کھانستے مر جاتے تھے۔ اس نے یہ

Scanned with CamScanner

بڑھادیا کہ ہر علاقے سے لوگ تین تین پانچ پانچ کی تعداد میں مر رہے ہیں۔ متوحش، میں نے ہمارے اپنے محلے کی بابت پوچھا۔ تو کیا میں نے نہیں سنا؟ ایک اینٹ چننے والا پڑوسی، جو تمام ہمسایوں سے اس بات پر جھگڑتا کہ ان کی مرغیاں اس کی دیوار سے اندر آجاتی تھیں، بخار میں ہذیان بکتے بکتے کوئی ہفتہ بھر پہلے ہی مرا تھا۔ صرف اب جا کر ہی کہیں لوگوں کو احساس ہوا ہے کہ وہ طاعون سے مرا تھا۔

لیکن میں اب بھی اس پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا' باہر سڑکوں پہ ہر شے بالکل معمول کے مطابق نظر آرہی تھی، کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے لوگ اس قدر پرسکون تھے، اگر طاعون پھیل گیا تھا تو مجھے اس کا یقین کرنے کے لیے کسی کو ڈھونڈ نکالنا ضروری تھا تا کہ اپنے خوف و ہراس میں اسے اپنا شریک کرسکوں۔ اگلی صبح، جب خوجہ اسکول چلا گیا، میں دوڑ کر سڑکوں پہ پہنچا۔ میں نے ان اطالویوں کو تلاش کیا جو مسلمان ہوگئے تھے اور جن سے میری یہاں گزشتہ گیارہ سالوں میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان میں کا ایک، جو اپنے نئے نام مصطفیٰ رئیس سے پہچانا جاتا تھا، جہازوں کی مرمت کی گودی پہنچنے کے لیے نکل چکا تھا' ایک دوسرا، عثمان افندی، اس نے پہلے تو مجھے گھر کے اندر آنے ہی نہیں دیا، حالانکہ میں اس کا دروازہ اس طرح پیٹتا رہا گویا اسے گرا کر ہی دم لوں گا۔ اس نے اپنے ملازم سے کہلوایا کہ گھر پر نہیں ہے لیکن آخر میں مزاحمت چھوڑ دی اور چلا یا، میں اب بھی کیسے یہ شک کرسکتا ہوں کہ بیماری حقیقی نہیں ہے' کیا میں نے وہ جنازے نہیں دیکھے جو سڑک پر جا رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ میں سراسیمہ ہوں، وہ یہ میرے چہرے پر صاف صاف دیکھ سکتا ہے، میری نئی اس لیے گم ہے کہ ہنوز عیسائیت پر قائم ہوں! اس نے مجھے سخت سست کہا: یہاں خوش رہنے کے لیے آدمی کا مسلمان ہونا ضروری ہے، لیکن اپنے گھر کے مرطوب اندھیرے میں لوٹتے وقت اس نے میرا ہاتھ ملانے سے غفلت برتی۔ مجھے بالکل نہیں چھوا۔ یہ نماز کا وقت تھا، اور جب میں نے مسجدوں کے صحنوں میں خلق کا ازدحام دیکھا، تو خوفزدہ ہو کر گھر لوٹ پڑا۔ میں اس ہڑبڑاہٹ سے مغلوب ہو گیا تھا جو تباہی کے وقت لوگوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ یہ ایسا تھا جیسے میرا ماضی مجھ سے گم ہو گیا ہو، جیسے میرا سارا حافظہ بہہ کر نکل گیا ہو۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ افراد کی ایک جماعت جنازہ اٹھائے ہماری محلے کی ایک سڑک پر چلی آرہی ہے، میرے اوسان بالکل ہی خطا ہو گئے۔

خوجہ اسکول سے واپس آچکا تھا، مجھے لگا کہ وہ میری حالت دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ میں نے

دیکھا کہ میرے خوف نے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ کر دیا ہے اور اس سے مجھے بے چینی ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی بے خوفی میں اپنے اس لاحاصل گھمنڈ سے پیچھا چھڑا لے۔ اپنے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش میں میں نے اپنا تمام تر طبی اور ادبی علم باہر انڈیل کر رکھ دیا؛ بقراط، تھوسیدیدیس [Thucydides] اور بکاچیو کے یہاں طاعون کے جو منظر مجھے یاد تھے وہ بیان کیے۔ کہا کہ بیماری کے متعدی ہونے کا عقیدہ رہا ہے، لیکن اس سے وہ کچھ اور زیادہ بدلحاظ ہو گیا — اسے طاعون کا کوئی ڈر ور نہیں تھا؛ بیماری خدا کے ارادے سے ہوتی ہے، اگر آدمی کی تقدیر میں مرنا لکھا ہے تو وہ مر کر رہے گا؛ چنانچہ اس قسم کی بزدلانہ بکواس جو میں کر رہا ہوں بے فائدہ ہے، یہی کہ آدمی اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے اور باہر سے تعلقات منقطع کر لے یا استنبول سے فرار ہونے کی تدبیر کرے۔ اگر یہی نوشتہ تھا، تو ہو کر رہے گا، موت ہمیں ڈھونڈ نکالے گی۔ میں ڈر کیوں رہا ہوں؟ ان معاصی کی بنا پر جو میں نے یوم بعد یوم رقم کیے تھے؟ وہ مسکرایا، اس کی آنکھیں نورِ یقین سے چمک رہی تھیں۔

اس دن تک جب ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے میں یہ کبھی معلوم نہیں کر سکا کہ جو اس نے کہا تھا اس پر اسے یقین بھی تھا۔ اسے اتنے مکمل طور پر بے خوف دیکھ کر مجھے ایک لمحے کے لیے ڈر لگا، لیکن پھر، جب مجھے میز کے گرد ہمارے بحث مباحثے یاد آئے، وہ ہیبت ناک کھیل جو ہم کھیلتے تھے، تو میں ڈانواڈول ہو گیا۔ وہ بس ایک دائرے میں گھوم رہا تھا، گفتگو کو ان معاصی کی طرف لے جا رہا تھا جو ہم دونوں نے مل کر تحریر کیے تھے، ایک ہی خیال کی ادائے فخر سے تکرار کر رہا تھا جس نے مجھے پاگل کر دیا گر میں موت سے اس قدر خوفزدہ ہوں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ میں نے اس خباثت پر اتنی مہارت حاصل کر لی ہو کہ اس کے بارے میں اتنی بے خوفی سے لکھتا ہوا نظر آؤں۔ وہ جرأت مندی جس کا مظاہرہ میں نے اپنے گناہوں کو اتنی فراوانی اور آزادی سے کہہ کر کیا تھا محض میری بے شرمی کا نتیجہ ہے! جبکہ خود اس کو اس وقت تامل ہوا تھا کیونکہ وہ اتنی عرق ریزی کے ساتھ اپنی کم ترین کوتاہیوں پر توجہ دے رہا تھا۔ لیکن اب وہ پرسکون تھا، اس گہرے یقین نے جو اس نے طاعون کے روبرو محسوس کیا تھا اس کے دل میں اس شک کا کوئی شائبہ تک باقی نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ یقیناً معصوم ہے۔

اس توجیہ سے مزاحم، جس پر میں نے حماقت میں یقین کر لیا تھا، میں نے اس سے حجت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سادہ لوحی سے تجویز پیش کی کہ اگر وہ پُراعتماد تھا تو اس لیے نہیں کہ اس کا ضمیر صاف

Scanned with CamScanner

ہے بلکہ اس لیے کہ اسے نہیں معلوم کہ موت کتنے قریب ہے۔ میں نے اس کی وضاحت کی کہ ہم موت کے خلاف اپنا تحفظ کر سکتے ہیں، کہ ہمیں چاہیے کہ ان لوگوں کو چھونے سے اجتناب کریں جنھیں طاعون لاحق ہو گیا ہے، کہ مردہ جسموں کو چونا پڑے گڑھوں میں دفن کیا جانا چاہیے، کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جس قدر کم ہو سکے ملنا جلنا چاہیے، اور کہ خوجہ کو پُر ہجوم اسکول نہیں جانا چاہیے۔

لگتا ہے کہ اس آخری بات نے اس کے دماغ میں وہ خیالات پیدا کیے جو خود طاعون سے زیادہ ہولناک تھے۔ اگلے دن ٹھیک بارہ بجے، یہ کہہ کر کہ اس نے اسکول میں ہر طالب علم کو باری باری چھوا ہے، اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ جب اس نے مجھے پس و پیش کرتے ہوئے دیکھا، کہ میں اسے چھونے سے خوفزدہ ہوں، وہ میرے قریب آیا اور بڑے سرور کے ساتھ مجھ سے بغلگیر ہوا؛ میں نے چلانا چاہا، لیکن کسی خواب دیکھتے آدمی کی طرح، میری آواز ہی نہ نکلی۔ جہاں تک خوجہ کا تعلق ہے، وہ بولا، ایک استہزا سے جسے سمجھنا میں نے بہت بعد ہی میں سیکھا، کہ وہ مجھے بے خوفی کا درس دے گا۔

۲

طاعون بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا، لیکن جانے کیا بات تھی میں وہ نہ سیکھ سکا جسے خوجہ بے خوفی کہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اتنا محتاط نہیں رہا تھا جتنا شروع میں تھا۔ کسی بیمار بڑھیا کی طرح میں ایک ہی کمرے میں مزید بند رہنا، دنوں تک کھڑکی کے باہر تکتے رہنا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ گاہے بگاہے کسی شرابی کی طرح یکبارگی سڑک پر آ دھمکتا، مارکیٹ میں عورتوں کو خرید فروخت کرتے، تاجروں کو اپنی دکانوں میں مصروف کار، لوگوں کو اپنے مردے دفنانے کے بعد قہوہ خانوں میں جمع ہوتے دیکھتا، اور طاعون کے باوصف زندہ رہنا سیکھتا، لیکن خوجہ بھلا کہاں مجھے چین سے بیٹھنے دینے والا تھا۔

ہر رات وہ میری طرف اپنے وہی ہاتھ بڑھاتا جن سے اپنے کہنے کے مطابق اس نے سارا دن مختلف لوگوں کو چھوا ہوتا۔ ایک عضلے کو بھی جنبش دیے بغیر میں انتظار کرتا رہتا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ کس طرح، بغیر پوری طرح بیدار ہوئے، آپ کو احساس ہوتا ہے کہ ایک بچھو آپ کے اوپر رینگ رہا ہے اور دم بخود رہ جاتے ہیں، ایک مجسمے کی طرح ساکت — تو بس اسی طرح۔ اس کی انگلیاں میری انگلیوں کے مماثل نہ تھیں؛ خوجہ انھیں میرے بدن پر لاتعلقی سے پھراتے ہوئے پوچھتا ''کیا تمھیں خوف آ رہا

Scanned with CamScanner

ہے؟" میں جنبش نہ کرتا۔ "تم خوفزدہ ہو۔ کس چیز سے ڈر رہے ہو؟" کبھی کبھی تو مجھ میں ایک لہر سی اٹھتی کہ اسے پرے دھکیل دوں اور لڑ پڑوں، لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس سے اس کا طیش اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ "میں بتاتا ہوں کہ تم کیوں خوفزدہ ہو۔ تم اس لیے خوفزدہ ہو کہ قصوروار ہو۔ تم خوفزدہ ہو کیونکہ گناہ میں غرق ہو۔ تم ڈرے ہوئے ہو کیونکہ تم مجھ پر اس سے زیادہ یقین رکھتے ہو جو میں تم پر رکھتا ہوں۔"

اور یہ وہی تھا جس نے اصرار کیا تھا کہ ہم میز کے دونوں انتہائی سروں پر بیٹھ کر ساتھ ساتھ لکھیں۔ اب جو ہم تھے کیوں تھے لکھنے کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن ایک بار پھر وہ سوائے اس کے کہ "دوسرے" کیوں ویسے ہی ہیں جیسے ہیں، کچھ اور لکھ لکھا کر نہ دیا۔ پہلی بار اس نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے اپنا لکھا دکھایا۔ جب مجھے خیال آیا کہ وہ کس طرح یہ توقع کیے بیٹھا ہے کہ جو میں پڑھ رہا ہوں وہ مجھے فروتن کر دے گا، میں اپنی کراہت چھپا نہ سکا اور کہہ دیا کہ وہ ان احمقوں سے مختلف نہیں جن کی بابت لکھ رہا ہے اور یہ کہ وہ مجھ سے پہلے مر جائے گا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میری یہ پیشین گوئی میرا سب سے کارگر ہتھیار ہے، اور اسے اس کی دہ سالہ عرق ریزی کی یاد دہانی کرائی، وہ سال جو اس نے کوسموگرافی کے نظریات پر لگائے تھے، اپنی بینائی کے صرفے پر آسمانوں کے مشاہدات پر، وہ تمام دن جب اس نے کتاب سے ناک نہیں اٹھائی تھی۔ تو پ اسے چمن سے بیٹھنے نہ دینے کی میری باری تھی' میں نے کہا کہ یہ کتنی احمقانہ بات ہوگی کہ وہ بے سود ہی جاں بحق ہو جبکہ طاعون سے بچنا اور جیے جانا بالکل ممکن ہے۔ ان باتوں سے نہ صرف میں نے اس کے شکوک میں اضافہ کیا بلکہ اپنی سزاؤں میں بھی۔ تب میں نے دیکھا، یوں لگ رہا تھا کہ میرے لکھے کو پڑھتے پڑھتے، میری وہ عزت جو اس نے کھو دی تھی اس کی بادل ناخواستہ بازیافت کر رہا ہو۔

تو ان دنوں اپنی بدقسمتی کو بھلا دینے کے لیے میں نے صفحے کے صفحے ان پُرمسرت خوابوں سے بھر دیے جو مجھے اکثر نظر آتے، رات ہی کو نہیں، بلکہ دوپہر کو قیلولے کے وقت بھی۔ سب کچھ فراموش کر دینے کی کوشش میں، آنکھ کھلتے ہی میں ان خوابوں کو رقم کرنے لگتا جن میں عمل اور معنی یکساں ہو گئے تھے، اور اپنے اسلوب کو شاعرانہ بنانے کے واسطے سخت محنت کرتا میں نے خواب دیکھا کہ ہمارے گھر کے قریب جنگل میں لوگ رہتے ہیں جنھوں نے ان اسرار کو حل کر لیا ہے جنھیں ہم سالوں تک سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور اگر آدمی اس جنگل کے اندھیرے میں داخل ہونے کی جرأت کرے تو ان

Scanned with CamScanner

کا دوست بن سکتا ہے، غروب آفتاب سے ہماری پرچھائیاں مٹ نہیں جاتیں، بلکہ اپنی ایک مستقل زندگی اختیار کر لیتی ہیں، ہزارہا چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنے قبضۂ قدرت میں لے آتی ہیں جن پر ہمیں اس تمام وقت میں قدرت حاصل کر لینی چاہیے تھی جو ہم نے اپنے صاف ستھرے اور فرحت بخش بستروں میں سکون کی نیند سونے میں گزارا تھا: ان شکیل، سہ بُعدی لوگوں نے جن کی تصویریں ہم نے اپنے خوابوں میں وضع کی تھی اپنے تصویری چوکھٹوں کے باہر قدم رکھا اور ہمارے ساتھ گھل مل گئے، میری ماں، میرے باپ اور میں نے اپنے پائیں باغ میں فولاد کی مشینیں نصب کیں جو ہمارے بجائے ہمارا کام کر سکیں...

خوجہ بے خبر نہیں تھا کہ یہ چپٹے وہ شیطانی دام ہیں جو اسے ایک مہلک سائنس کے اندھیرے میں گھسیٹ لائیں گے، اس کے باوجود بھی وہ مجھ سے برابر سوال کرتا رہا، اس سے پوری طرح آگاہ کہ ہر سوال کے ساتھ ہی وہ اپنی خوداعتمادی کا ایک اور ٹکڑا کھو رہا ہے۔ ان احمقانہ خوابوں کا مطلب کیا ہے، کیا میں نے واقعی انھیں دیکھا ہے؟ چنانچہ میں نے اسے بالکل اسی طرح اپنا تختۂ مشق بنایا جس طرح سالوں بعد ہم دونوں مل کر سلطان کو بنانے والے تھے: میں نے اپنے خوابوں سے ہم دونوں کے مستقبل کے بارے میں نتائج برآمد کیے۔ یہ ظاہری بات تھی کہ ایک بار آدمی سائنس کی کشش سے گھائل ہو جائے تو پھر اس سے گلوخلاصی اتنی ہی ناممکن ہے جتنی طاعون سے؛ یہ کہنا مشکل نہیں تھا کہ یہ لت خوجہ پر پوری طرح حاوی ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود میں خوجہ کے خوابوں کے بارے میں سوچتا رہا! وہ سنتا، کھلم کھلا میرا تمسخر اڑاتا، لیکن چونکہ اس نے اپنے گھمنڈ کو اس حد تک پی لیا تھا کہ مجھ سے سوال کرے، میری خفگی کو بہت زیادہ نہیں بھڑکا سکتا تھا؛ اور مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ میرے جوابات اس کے تجسس کو ابھار رہے ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ طاعون پھیلنے کی بابت خوجہ نے جس بے فکری کا مظاہرہ کیا تھا وہ مضطرب ہونے لگی ہے، خود میرے خوفِ مرگ میں تخفیف نہیں ہوئی، لیکن کم از کم یہ ضرور ہوا کہ اب اس خوف میں میں خود کو تنہا نہیں محسوس کر رہا تھا۔ ظاہر ہے، مجھے اس کے شبانہ عذابوں کی قیمت ادا کرنی پڑی، لیکن اب مجھے یہ احساس ہوا کہ میری جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ جب خوجہ نے اپنے ہاتھ میری جانب بڑھائے تو میں نے دوبارہ کہا کہ اسے مجھ سے پہلے موت آئے گی، اور یہ یاد دہانی کرائی کہ جو خوفزدہ نہیں ہیں لاعلم ہیں، کہ اس کی تحریریں ادھوری ہی رہ گئی ہیں، اور میرے وہ خواب جو اس دن اس نے پڑھے ہیں مسرت

سے لبریز ہیں۔

بہر کیف، یہ میرا کہا ہوا نہیں بلکہ کوئی اور ہی بات تھی جس نے معاملے کو فیصلہ کن حدود میں داخل کر دیا۔ ایک دن اس کے اسکول کے ایک بچے کا باپ گھر آیا۔ وہ بے ضرر، منکسر، معمولی سا آدمی لگ رہا تھا، بولا کہ ہمارے ہی پڑوس میں رہتا ہے۔ میں، کسی گھریلو اونگھتی ہوئی بلی کی طرح اپنے کونے میں سمٹا سمٹایا بیٹھا، اسے سنتا رہا، دراں حال کہ وہ دونوں دھر اُدھر کی باتوں میں مشغول رہے۔ پھر ہمارے مہمان نے اچانک وہ کہہ دیا جو کہنے کو بے قرار تھا: اس کی بنتِ عم گزشتہ گرمیوں میں بیوہ ہو گئی ہے، اس کا شوہر چھت بچھاتے ہوئے گر کر مر گیا تھا۔ کئی آدمی اس سے شادی کرنے کے طلب گار ہیں، لیکن ہمارے ملاقاتی کو خوجہ کا خیال آیا کیونکہ اسے پڑوسیوں سے معلوم ہوا ہے کہ ان دنوں شادی کے پیغام اس کے زیرِ غور ہیں۔ خوجہ کا ردِ عمل میری توقع سے کہیں زیادہ مخالفانہ ثابت ہوا بولا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا، اور اگر چاہتا بھی تو ایک بیوہ سے ہرگز نہیں۔ اس پر ہمارے مہمان نے ہمیں یاد دلایا کہ ہمارے پیغمبر محمد نے خدیجہ کی بیوگی کا خیال نہیں کیا تھا اور انھیں اپنی پہلی زوجہ بنا لیا تھا۔ خوجہ بولا کہ اس نے اس بیوہ کے بارے میں سنا ہے، وہ ولی صفت خدیجہ کی چھنگلی برابر بھی نہیں۔ اس پر ہمارے عجیب اور گھمنڈی ہمسائے نے خوجہ کو یہ باور کرانا چاہا کہ وہ خود بھی کوئی ایسی نعمتِ غیر مترقبہ نہیں، اور یہ بھی کہا کہ گو اسے خود تو یقین نہیں لیکن ہمسایوں کا خیال ہے کہ خوجہ کا دماغ بالکل چل گیا ہے، کوئی بھی شخص اس کی اختر شماریوں کو اچھی نشانی نہیں سمجھتا، یہ اس کا عدسوں سے کھیلنا کھالن اور عجیب و غریب گھڑیاں بنانا۔ کسی بیوپاری کی تنگ مزاجی سے، جو اس مال پر نکتہ چینی کر رہا ہو جسے خریدنے والا ہو، ہمارے مہمان نے یہ اضافہ بھی کیا کہ پڑوسی کہہ رہے تھے کہ خوجہ کفار کی طرح میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے، بجائے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے؛ کہ تھیلی کے بعد پیسوں کی تھیلی کے عوض کتابیں خریدتا ہے پھر انھیں فرش پر پھینک کر ان کے اوراق پیروں تلے روندتا ہے جن پر آنحضرت کا نام لکھا ہوتا ہے؛ کہ گھنٹوں آسمان کو گھور کر اپنے اندر کے شیطان کی تشفی کرنے میں ناکام رہنے کے بعد، اب اپنے بستر میں پڑا پڑا دن دہاڑے اپنی غلیظ سی چھت کو تکتا رہتا ہے، عورتوں کو چھوڑ کر صرف لونڈوں ہی سے متمتع ہوتا ہے، کہ میں اس کا توام بھائی ہوں، کہ اس نے رمضان بھر روزہ نہیں رکھا اور کہ طاعون صرف اس کی وجہ سے بھیجا گیا ہے۔

ملاقاتی سے پیچھا چھڑانے کے بعد خوجہ پر برہم مزاجی کا دورہ پڑا۔ میں نے طے کیا کہ دوسروں

Scanned with CamScanner

جیسے روپے رکھنے سے، یا کم از کم ان کا دکھاوا کرنے سے، جو آسودہ خاطری وہ اخذ کرتا تھا، اب اپنے خاتمے کو پہنچ گئی ہے۔ ایک آخری اور فیصلہ کن ضرب دینے کے لیے میں نے کہا کہ وہ جنھیں طاعون کا خوف نہیں، اتنے ہی احمق ہیں جتنا یہ شخص تھا۔ وہ ڈر گیا، لیکن زرد رو ہے کر بولا کہ وہ بھی طاعون سے خوفزدہ نہیں ہے۔ وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو، میں نے فیصلہ کیا کہ یہ بات اس نے اخلاص سے کہی ہے۔ اس کے اعصاب پر شدید تشنج طاری تھا، کوئی چیز نہیں مل رہی تھی کہ ہاتھوں کو مصروف رکھے، اور "احمقوں" کی وہی گردان کرتا رہا جو قریبی زمانے میں بھول بھال گیا تھا۔ رات پڑنے پر اس نے چراغ روشن کیا، میز کے بیچوں بیچ رکھا، اور بولا کہ اب ہم بیٹھیں گے۔ ہمیں لکھنا چاہیے۔

دو غیر شادی شدوں کی طرح جو سردیوں کی غیر مختتم راتوں میں وقت گزاری کی خاطر ایک دوسرے کی قسمت کا حال بتا رہے ہوں، ہم میز پر روبرو ہو کر بیٹھ گئے، اور اپنے سامنے کورے کاغذوں پر کچھ نہ کچھ گھسیٹنے لگے۔ کیا مہملیت تھی! جب صبح کو میں نے خوجہ کا نوشتہ خواب پڑھا، تو وہ مجھے اپنے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز نظر آیا۔ اس نے جو خواب رقم کیا تھا اس میں میری نقالی کی تھی، لیکن جیسا کہ اس کی ہر بات سے صاف ظاہر تھا، یہ ایک ایسا فنطاسیہ تھا جو کبھی خواب میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس نے ہمیں بھائی بھائی دکھایا! اسے یہ مناسب معلوم ہوا کہ خود کو میرے بڑے کے روپ میں پیش کرے جب کہ میں بڑی اطاعت گزاری سے اس کے سائنٹفک لیکچر سنوں۔ اگلی صبح جب ہم ناشتہ کر رہے تھے، اس نے پوچھا کہ ہمارے توام ہونے سے متعلق پڑوسیوں کی لاف گزاف کے بارے میں میرا کیا خیال ہے۔ اس سوال سے مجھے مسرت ہوئی لیکن میرے فخر کی تسکین نہیں، میں نے کچھ نہیں کہا۔ دو دن بعد اس نے بیچ رات میں یہ کہنے کے لیے جگا دیا کہ اس بار اس نے سچ مچ وہی خواب دیکھا ہے جو لکھا تھا۔ شاید یہ ٹھیک ہو، لیکن کسی وجہ سے میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ اگلی شب اس نے اقرار کیا کہ وہ طاعون میں مرنے سے خوفزدہ ہے۔

گھر میں بند پڑے رہنے سے وحشت زدہ ہو کر میں جھٹ پٹے کے وقت باہر سڑک پر نکل آیا۔ باغ میں بچے درختوں پر چڑھ رہے تھے اور اپنے رنگ برنگے جوتے نیچے زمین پر چھوڑ دیے تھے، فواروں کے پاس قطار میں کھڑی بک بک کرتی عورتیں میرے ان کے پاس سے گزرتے وقت خاموش نہیں ہو رہی تھیں، بازار گاہکوں سے بند تھے، سرِراہ جھگڑے ہو رہے تھے جنھیں کچھ لوگ منتشر کرا رہے

تھے اور کچھ دوسرے ان سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وبا اپنی میعاد پوری کر چکی ہے، لیکن جب میں نے مسجد بایزید سے ایک کے بعد ایک جنازہ نکلتے دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے اور گھر واپس آ گیا۔ جوں ہی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا، خوجہ نے آواز دی "ارے، ذرا یہاں آ کر اسے دیکھو۔" اس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور وہ ایک ہلکی سی سوجن کی طرف اشارہ کر رہا تھا، ناف کے نیچے ایک سرخ سا دھبا۔ "آس پاس اتنے بہت سی کیڑے مکوڑے ہیں۔" میں نے قریب آ کر غور سے دیکھا، یہ ایک چھوٹا سا سرخ دھبا تھا، جس پر ہلکی سی سوجن تھی، جیسے کسی کیڑے کے کاٹنے کا بڑا سا نشان، لیکن وہ یہ مجھے کیوں دکھا رہا ہے؟ میں اپنا چہرہ اور قریب لاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ "کیڑے کی کاٹ ہے،" خوجہ بولا، "ہے نا؟" اس نے سوجن کی نوک اپنی انگلی سے چھوئی۔ "یا پسو کی ہے؟" میں خاموش رہا، میں نے اسے نہیں بتایا کہ میں نے پسو کا ایسا کاٹا کبھی نہیں دیکھا۔

میں نے باغ میں غروب آفتاب تک رہنے کا کوئی بہانہ تلاش کر لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے مزید اس گھر میں نہیں رہنا چاہیے، لیکن میرے ذہن میں کوئی اور جگہ بھی نہیں آئی جہاں جا سکوں۔ اور وہ نشان واقعی کسی کیڑے کے ڈنک مارنے کا ہی لگ رہا تھا، وہ طاعون کی گلٹی کی طرح نمایاں اور پھیلا ہوا نہیں تھا؛ لیکن میرے خیالات جلد ہی کسی اور طرف چل پڑے چونکہ میں باغ میں لہلہاتے پودوں کے درمیان گھومتا پھر رہا تھا، مجھے یوں لگا کہ دو دن کے اندر اندر وہ سرخ نشان خوب پھول جائے گا، پھول کی طرح کھلے گا، اور پھوٹ پڑے گا، کہ خوجہ جاں بحق ہو گا، اذیت کے ساتھ۔ میں نے خود سے کہا کہ شاید یہ بدہضمی کا پیدا کیا ہوا کوئی پھوڑا ہو، لیکن نہیں، یہ کیڑے کے کاٹنے کا نشان ہی لگ رہا تھا، کس کیڑے کا؟ یہ ایک لمحے میں مجھے یاد آ جائے گا، ہو نہ ہو یہ انھیں میں کا ایک کیڑا ہو گا جو جسامت میں بڑے ہوتے ہیں اور رات کے وقت اڑتے پھرتے ہیں اور استوائی آب و ہوا میں خوب پھلتے پھولتے ہیں، لیکن اس بھوت جیسی مخلوق کا نام میری نوک زباں پر آ کر نہ دیا۔

جب ہم رات کا کھانا کھانے بیٹھے تو خوجہ نے خود کو بہت ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کی، مذاق کیے، مجھے ستایا، لیکن یہ سوانگ بہت دیر تک جاری نہ رکھ سکا۔ بہت بعد میں، جب ہم کھانا کھا کر اٹھ چکے تھے، جو ہم نے خاموشی میں کھایا تھا، اور رات، بے ہوا اور پر سکوت، ہلک چکی تھی، خوجہ بولا،

Scanned with CamScanner

''میں اناڑی محسوس کر رہا ہوں۔ میں خیالات سے بوجھل ہوں۔ چلو میز پر بیٹھ کر لکھیں۔'' بظاہر اپنی توجہ ہٹانے کا اس کے پاس بس یہی ذریعہ رہ گیا تھا۔

لیکن وہ لکھ نہیں سکا۔ بیکار بیٹھا اپنی آنکھ کے گوشے سے مجھے دیکھتا رہا، جبکہ میں قناعت کے ساتھ لکھتا چلا گیا۔ ''کیا لکھ رہے ہو؟'' میں نے پڑھ کر سنا دیا کہ اپنی انجینئری کے مطالعے کا پہلا سال ختم کرنے کے بعد میں تعطیل گزارنے کس قدر بے صبری سے ایک اچھی گاڑی میں گھر لوٹنے کا منتظر تھا۔ لیکن مجھے اپنے مکتب اور اپنے ساتھیوں دونوں ہی سے محبت تھی: میں نے اسے پڑھ کر سنایا کہ میں نے چشمے کے کنارے وہ کتابیں پڑھتے ہوئے جو تعطیلات میں ساتھ لیتا آیا تھا ان کی کس قدر شدید کمی محسوس کی تھی۔ ایک مختصر خاموشی کے بعد، خوجہ نے، جیسے کسی راز سے پردہ اٹھا رہا ہو، اچانک میرے کان میں سرگوشی کی: ''کیا لوگ وہاں ہمیشہ ہی اسی طرح خوش رہتے ہیں؟'' مجھے خیال ہوا کہ یہ کہتے ہی وہ اس پر پچھتائے گا، لیکن وہ مجھے ہنوز بچگانہ تجسس سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی سرگوشی کی ''میں خوش تھا!'' رشک کی ایک پرچھائیں سی اس کے چہرے پر سے ہو کر گزر گئی، لیکن اس میں ڈرانے دھمکانے والا انداز نہیں تھا۔ کم آمیزی سے، رکتے جھجکتے اس نے اپنی کہانی سنائی۔

جب اس کی عمر بارہ سال تھی اور اَیدرنہ میں رہ رہا تھا، ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مسجد بایزید کے شفاخانے اپنے نانا کی مزاج پرسی کے لیے جاتا تھا جو پیٹ کی کسی بیماری میں مبتلا تھا۔ صبح کے وقت اس کی ماں اس کے بھائی کو، جو ابھی بہت چھوٹا تھا، محلے والوں کی نگرانی میں چھوڑ آتی، اور پھر خوجہ، اس کی بہن، اور پڈنگ کے پیالے، جو ماں نے پہلے سے تیار کی ہوتی، کے ساتھ نکل پڑتی۔ سفر مختصر لیکن دلکش ہوتا، اور اس گزرگاہ پر جو سفیدے کے درختوں کی چھاؤں سے ہو کر جاتی تھی۔ اس کا نانا انھیں کہانیاں سناتا۔ خوجہ کو وہ کہانیاں بہت بھاتی تھیں، لیکن ان سے زیادہ شفاخانہ اور اس کے صحنوں اور غلام گردشوں میں گھومتے پھرنا۔ ایک بار اسے وہ موسیقی بھی سنائی دی جو ایک بہت بڑے گنبد کے فانوس کے نیچے ذہنی مریضوں کے لیے بجائی جا رہی تھی: پھر پانی، بہتے پانی کی آواز بھی تھی: وہ دوسرے کمروں میں بھی جا نکلتا، جن میں عجیب قسم کی رنگ برنگی بوتلیں اور مرتبان چمک رہے ہوتے: ایک اور مرتبہ وہ اپنا راستہ بھول بیٹھا اور رونے لگا، اور منتظمین اسے فرداً فرداً ہر کمرے میں لے گئے تا آنکہ انھیں اس کے نانا عبداللہ افندی کا کمرہ مل گیا: کبھی اس کی ماں آنسو بہانے لگتی، کبھی اپنی بیٹی کے

Scanned with CamScanner

ساتھ مل کر بوڑھے آدمی کی کہانیاں سنتی۔ پھر وہ نانا کا لوٹایا ہوا خالی برتن لے کر وہاں سے رخصت ہوتے، لیکن گھر پہنچنے سے پہلے ماں ان دونوں کو حلوہ خرید کر دیتی اور سرگوشی میں کہتی، "چلو اسے دوسروں کے دیکھنے سے پہلے ہی کھا لیں۔" سفیدوں کی چھاؤں میں چشمے کے قریب وہ ایک خفیہ مقام پر آتے جہاں تینوں پانی میں اپنے پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے، اور لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ حلوہ کھاتے۔

جب خوجہ نے بات ختم کی یک خاموشی اتر آئی، جس نے ہمیں مضطرب کر دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک سمجھ میں نہ آنے والے جذبۂ اخوت میں ایک دوسرے سے قریب بھی۔ بڑی دیر تک خوجہ فضا میں جو تناؤ آ گیا تھا اسے نظر انداز کرتا رہا۔ بعد میں، ایک قریبی گھر کا بھاری دروازہ لاپروائی سے بڑے زور سے بند کیا گیا تو اس نے کہا کہ اسے سب سے پہلی بار سائنس سے دلچسپی اسی وقت ہوئی، اس کا محرک مریض اور وہ رنگ برنگی بوتلیں اور مرتبان اور ترازو تھے جو انھیں تندرست کرتے تھے۔ لیکن نانا کی وفات کے بعد وہ دوبارہ وہاں نہیں گئے۔ خوجہ ہمیشہ یہ خواب دیکھتا رہا تھا کہ بڑا ہونے پر وہ اکیلا وہاں لوٹے گا، لیکن ایک سال دریائے تُنجہ میں جو ایدرنہ سے ہو کر بہتا ہے بغیر کسی انتباہ کے سیلاب آ گیا، مریضوں کو ان کے بچھونوں سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا کیونکہ کمرے غلیظ گدلے پانی سے بھر گئے تھے، اور جب آخرکار پانی اترا تو وہ خوشنما شفاخانہ برسوں ایک منحوس، متعفن کیچڑ کے نیچے دبا رہا جسے صاف کرنا ناممکن تھا۔

جوں ہی خوجہ دوبارہ خاموش ہوا، ہماری قربت کا لمحہ بھی رخصت ہو گیا۔ وہ میز سے اٹھ چکا تھا، اپنی آنکھ کے گوشے سے میں نے اس کی پرچھائیں کو کمرے میں قدم ناپتے دیکھا، پھر چراغ کو میز کے بیچ سے اٹھا کر وہ میرے پیچھے آ گیا، اور اب نہ مجھے خوجہ نظر آ رہا تھا نہ اس کی پرچھائیں۔ میں مڑ کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا، جیسے خوفزدہ ہوں، کسی شر کا متوقع۔ ایک لمحے بعد، کپڑوں کے اتارے جانے کی سرسراہٹ سن کر، میں ڈرتے ڈرتے مڑا۔ وہ آئینے کے مقابل کھڑا تھا، کمر سے اوپر ننگ دھڑنگ، چراغ کی روشنی میں بڑی احتیاط سے اپنے سینے اور زیریں شکم کا معائنہ کر رہا تھا۔ "خدایا،" وہ بولا، "یہ کس قسم کا دنبل ہے؟" میں خاموش رہا۔ "آ کر دیکھو تو سہی۔" میں نے جنبش تک نہ کی۔ وہ چلایا، "یہاں آؤ، میں کہتا ہوں!" میں ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھا، ایک طالب علم کی طرح جسے بس اب سزا ملنے ہی والی ہو۔

Scanned with CamScanner

میں کبھی اس کے ننگے جسم سے اتنے قریب نہیں ہوا تھا؛ مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ پہلے میں نے یہ یقین کرنا چاہا کہ میرے آگے نہ بڑھنے کی یہی وجہ ہو، لیکن مجھے معلوم تھا میں اس کے دمّل سے ڈرا ہوا ہوں۔ یہ اسے خود بھی معلوم تھا۔ تاہم، اپنے خوف کو چھپانے کے لیے میں اپنا سر قریب لایا اور ایک معالج کے انداز میں کچھ بڑبڑایا، دراصل کہ میری نگاہیں اس سوجن، اس سوزش پر جمی ہوئی تھیں۔ ''تمھیں ڈر لگ رہا، لگ رہا ہے نا؟'' آخرکار خوجہ نے کہا۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش میں کہ مجھے ڈر نہیں لگ رہا، میں اپنا سر کچھ اور قریب لایا۔ ''تمھیں ڈر ہے کہ کہیں یہ طاعون کی گلٹی نہ ہو۔'' میں نے نہ سننے کا روپ بھرا، اور یہ کہنے ہی والا تھا کہ اسے کسی کیڑے نے کاٹا ہے، شاید اسی عجیب کیڑے نے جس نے مجھے بھی، کہیں، ایک بار ڈنک مارا تھا، لیکن کیڑے کا نام اب بھی مجھے یاد نہ آسکا۔ ''اسے چھو کر دیکھو!'' خوجہ نے کہا۔ ''بغیر چھوئے تمھیں کیسے پتا چلے گا؟ مجھے چھوؤ!''

جب اس نے دیکھا کہ میں چھونے والا نہیں، وہ کھل اٹھا۔ س نے وہ انگلیاں میرے چہرے کی طرف بڑھائیں جن سے اس نے سوجن کو چھوا تھا۔ جب اس نے مجھے کراہت سے پیچھے ہٹتے دیکھا تو بڑے زور سے ہنسا، اور ایک معمولی سے کیڑے کی کاٹ سے اتنے خوفزدہ ہو جانے پر میرا مذاق اڑایا، لیکن ہنسی مذاق کی یہ بازی دیر تک قائم نہیں رہی۔ ''میں مرنے سے خوفزدہ ہوں،'' اس نے اچانک کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور ہی چیز کی بات کر رہا ہو وہ شرمسار سے زیادہ خفا تھا؛ یہ کسی ایسے شخص کا غصہ تھا جس کے ساتھ غداری کی گئی ہو۔ ''کیا تمھارے ایسے پھوڑا نہیں؟ کیا تمھیں یقین ہے؟ چلو قمیص اتارو، ابھی ابھی!'' س کے اصرار پر میں نے ایک بچے کی طرح جو دھلائے جانے سے ناراض ہو اپنی قمیص اتار دی۔ کمرہ گرم تھا، کھڑکی بند تھی، تاہم ٹھنڈی ہوا کہیں سے اندر آ رہی تھی؛ شاید یہ آئینے کی ٹھنڈک تھی جس نے میرے جسم میں سنسنی پیدا کر دی۔ مجھے نہیں معلوم۔ کیسا نظر آؤں گا۔ اس خیال سے مجھے ندامت محسوس ہوئی اور میں آئینے کے چوکھٹے کے باہر ہو گیا۔ جب خوجہ نے پنا سر میرے دھڑ کے نزدیک کیا تو مجھے آئینے میں اس کا چہرہ ترچھا منعکس نظر آیا؛ اس نے اپنا وہ بڑا سا سر جو ہر ایک یہی کہتا تھا کہ میرے سر سے ملتا جلتا ہے سیدھا میرے جسم کی طرف بڑھایا۔ وہ یہ میرے نفس میں زہر گھولنے کے لیے کر رہا ہے، مجھے اچانک خیال آیا؛ لیکن میں نے ایسا اس کے ساتھ کبھی نہیں کیا ہے، اس کے برعکس، ان تمام سالوں میں میں نے اس کا استاد ہونے پر فخر کیا ہے۔ ہرچند کہ یہ بالکل مہمل بات تھی، تاہم ایک لمحے کے لیے

Scanned with CamScanner

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ داڑھی والا سر، جو چراغ کی پرچھائیوں میں بڑا بے ہنگم نظر آ رہا تھا، میرا خون چوس جانے کے درپے تھا! ظاہر ہے یہ ان ہیبت ناک کہانیوں کا اثر تھا جو میں نے ایک بچے کی حیثیت سے سنی تھیں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے اپنے زیریں شکم پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کیا؛ میں نے بھاگ جانا چاہا، کوئی چیز اس کے سر پر دے مارنا۔ ''تمھیں نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ وہ میرے پیچھے آیا اور میری بغلوں، میری گردن، میرے کانوں کے عقب کا معائنہ کیا۔ ''یہاں بھی ایک نہیں، لگتا ہے کیڑے نے تمھیں نہیں کاٹا۔''

میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ آگے آیا اور میرے برابر کھڑا ہو گیا۔ اس کا طرزِ عمل کسی پرانے عزیز دوست کا سا تھا جو میرے عمیق ترین رازوں میں میرا شریک رہا ہو۔ دونوں طرف سے اپنی انگلیوں سے میری گدی دبا کر اس نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ ''آؤ، ساتھ ساتھ آئینے میں دیکھیں۔'' میں نے دیکھا، اور چراغ کی کھردری روشنی میں ایک بار پھر دیکھا کہ ہم دونوں کس قدر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ صادق پاشا کے دروازے پر انتظار کرتے وقت جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس مشابہت سے کس درجہ مغلوب ہو گیا تھا۔ اُس وقت میں نے کسی ایسے کو دیکھا تھا جیسا مجھے ہونا چاہیے تھا؛ اور اس وقت میں نے سوچا کہ اسے بھی مجھ جیسا ہی ہونا چاہیے۔ ہم دونوں ایک ہی شخص ہیں! اب یہ مجھے ایک بالکل ظاہری بات لگ رہی تھی۔ ایسا تھا جیسے جکڑا ہوا ہوں، میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، ہلنے جلنے سے عاجز۔ اپنی حفاظت کے لیے میں نے جنبش کی، تاکہ تصدیق کر سکوں کہ میں میں ہی ہوں۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھ بالوں میں پھرائے۔ لیکن اس نے میری حرکات کی نقالی کی اور انھیں بڑی تکمیل کے ساتھ انجام دیا، بغیر اس کے کہ آئینے میں منعکس پیکر کا تناسب ذرا بھی مضطرب ہو۔ اس نے میرے انداز کی نقالی بھی کی، میرے سر کے رجحان کی بھی، میری اس دہشت کی نقل اتاری جسے آئینے میں دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی لیکن جس سے، خوف کے مارے دم بخود، اپنی آنکھیں بھی نہیں ہٹا سکتا تھا؛ پھر وہ کسی بچے کی طرح مسرور ہو گیا جو اپنے دوست کے الفاظ اور حرکات کی نقالی کر کے اسے چڑا رہا ہو۔ اس نے چلا کر کہا کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ مریں گے! کیا حماقت ہے، میں نے سوچا۔ لیکن میں خوفزدہ بھی تھا۔ یہ سب سے زیادہ دہشت ناک رات تھی جو میں نے اس کے ساتھ گزاری۔

پھر اس نے بتایا کہ تمام وقت طاعون سے خوفزدہ رہا ہے، ہر وہ چیز جو اس نے کی ہے صرف

میری آزمائش کے لیے ہی کی ہے، مثلاً جب وہ صادق پاشا کے جلادوں کو قلع قمع کرنے کے لیے مجھے لے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، یا جب لوگ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے مشابہ قرار دیتے تھے۔ پھر بولا کہ وہ میرے نفس پر قابض ہو گیا ہے، بالکل جیسے ایک لمحہ پہلے وہ میری حرکات کی عکاسی کر رہا تھا، بالکل اسی طرح اس وقت وہ سب جو میں سوچ رہا ہوں، اسے معلوم ہے، اور جو کچھ مجھے معلوم ہے، وہ بھی وہی سوچ رہا ہے! جب اس نے پوچھا کہ میں لمحۂ موجودہ میں کیا سوچ رہا ہوں، میں سوائے اس کے کسی اور چیز کی بابت نہ سوچ سکا اور بولا کہ کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہا، لیکن وہ سن نہیں رہا تھا، وہ مجھ دریافت کرنے کے لیے باتیں نہیں کر رہا تھا، بلکہ صرف مجھے ڈرانے کے لیے، خود اپنے خوف پر میرے جذبات ابھارنے کے لیے، مجھے اس خوف کے بوجھ کو اپنے ساتھ سہنے پر مجبور کرنے کے لیے۔ مجھے لگا کہ اپنی تنہائی کے احساس کے بہ قدر، وہ میری ایذا دہی کا طلب گار ہے: جب اس نے اپنی انگلیاں ہمارے چہروں پر پھرائیں، اس پراسرار مشابہت کی ہیبت سے مجھے سحر زدہ کرنے کی کوشش کی اور خود مجھ سے زیادہ خیزش اور اضطراب میں آ گیا، مجھے لگا جیسے وہ کوئی گھناؤنی بات کر گزرنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے سے کہا کہ اگر وہ مجھے مسلسل آئینے کے مقابل کیے ہوئے ہے، میری گدی دبائے ہوئے ہے، تو اس لیے کہ اس کا دل فوراً اس شر کے ارتکاب پر راضی نہیں، لیکن وہ نہ مہمل لگ رہا ہے نہ بے یار و مددگار۔ وہ درست تھا، میں بھی وہی باتیں کہنا اور کرنا چاہتا تھا جو وہ۔ مجھے اس پر رشک تھا کہ جہاں وہ عملی قدم اٹھا سکتا تھا، میں نہیں، کیونکہ وہ طاعون کے خوف اور آئینے سے فائدہ اٹھانے کا اہل تھا۔

لیکن اپنے خوف کی شدت سے قطع نظر، حالانکہ مجھے یقین تھا کہ میں نے اپنے بارے میں ابھی ابھی وہ چیزیں دیکھی ہیں جن پر پہلے میری توجہ نہیں گئی تھی، میں کسی وجہ سے اس احساس کو نہ جھٹک سکا کہ یہ سب ایک کھیل ہے۔ میری گردن پر اس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی، لیکن میں آئینے کے چوکھٹے کے باہر قدم نہ دھر سکا۔ ''اب میں تم جیسا ہوں،'' وہ بولا۔ ''مجھے تمھارے خوف کا علم ہے۔ میں تم بن گیا ہوں!'' جو وہ کہہ رہا تھا میں سمجھ گیا لیکن خود کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ پیشین گوئی، جس کے نصف کے بارے میں اب مجھے کوئی شک نہیں رہا، احمقانہ اور بچکانہ تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا کو میری آنکھ سے دیکھ سکتا ہے۔ ''وہ،'' وہ پھر کہہ رہا تھا، آخر کار اب اسے اس نے سمجھ لیا تھا کہ ''وہ'' کس طرح سوچتے ہیں، ''انھیں'' کیسا لگتا ہے۔ اپنی نگاہ کو آئینے کے چوکھٹے کے ماورا بھٹکتا رہنے دیتے ہوئے، وہ

کچھ دیر تک بولتا رہا، میز کے قریب پرچھائیوں کو، گلاسوں کو، کرسیوں کو، اور چراغ کی روشنی میں نیم واضح اشیا کو دیکھتا رہا۔ اس نے اعلان کیا کہ اب وہ ایسی باتیں کہہ سکتا ہے جو پہلے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ انھیں دیکھنے کے قابل نہیں تھا، لیکن مجھے خیال ہوا کہ وہ غلطی پر ہے۔ الفاظ ہو بہو وہی تھے، اور اشیا بھی پہلے جیسی ہی۔ صرف اس کا خوف نیا تھا؛ نہیں، وہ بھی نہیں؛ بلکہ اس کو محسوس کرنے کی اس کی وضع؛ لیکن مجھے لگا کہ یہ بھی، جسے اب میں وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا، ایک ایسی چیز ہے جو اس نے آئینے کے سامنے اپنے پر منڈھ لی ہے، اس کی تازہ بتازہ چال۔ اور طو عاً و کرہاً اس کھیل کو بھی ایک طرف ڈال کر، اس کا ذہن چکر لگا کر اُس لال دمّل پر مرتکز ہوتا نظر آیا، یہ پوچھتے ہوئے: کیا یہ کوئی کیڑا اٹھایا طاعون؟

وہ کچھ دیر تو اس بارے میں بولتا رہا کہ جس مقام پر پہنچ کر میں ٹھہر گیا ہوں، وہ اسی مقام سے آگے جاری رہنے کا کس قدر متمنی ہے۔ ہم ابھی تک آئینے کے روبرو نیم برہنہ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ میری جگہ لینے والا تھا، میں اس کی، اور اسے انجام دینے کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ اپنے کپڑوں کا تبادلہ کریں، وہ اپنی داڑھی مونڈ ڈالے، اور میں اپنی بڑھنے دوں۔ اس خیال نے آئینے میں ہماری مشابہت کو اور زیادہ مکروہ بنا دیا، اور اسے یہ کہتے ہوئے سنتے کہ پھر میں اسے ایک آزاد کردہ آدمی بنا دوں گا میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا: اس نے فرطِ مسرت سے اترا کر کہا کہ وہ میرے بجائے میرے وطن لوٹنے پر کیا کچھ کرے گا۔ اس احساس سے مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی کہ اسے ہر وہ بات جو میں نے اپنے لڑکپن اور جوانی کی بابت بتائی تھی بعینٖ وعَین یاد تھی، اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک، اور ان تفاصیل سے اس نے اپنے ذوق کے مطابق ایک عجیب و غریب، حقیقت سے دور سرزمین بنا ڈالی تھی۔ میری زندگی میرے قابو سے باہر تھی، وہ اسے گھسیٹے گھسیٹے کہیں اور ہی لے جا رہا تھا، اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا، سوا اس کے کہ جو میرے ساتھ پیش آ رہا ہے اسے باہر سے منفعل بیٹھا دیکھتا رہوں، یوں جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میرے بجائے میرے ملک کا جو سفر وہ کرنے والا تھا اور جو زندگی وہاں گزارنے والا تھا، ان میں ایسی اجنبیت اور سادہ لوحی تھی جنھوں نے مجھے اس دعوے پر مکمل یقین کرنے سے باز رکھا۔ بایں ہمہ اس فنطاسیہ کی تفاصیل میں کارفرما منطق نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ بھی ہو سکتا تھا، میری زندگی کو اس طرح بھی بسر کیا جا سکتا تھا۔ تب میں سمجھ گیا کہ پہلی

Scanned with CamScanner

بار مجھے خوجہ کی زندگی کے بارے میں کسی بہت گہری چیز کا احساس ہوا ہے، لیکن ٹھیک ابھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ پراگندہ ذہنی سے یہ سنتے ہوئے کہ اپنی پرانی دنیا میں "میں" کیا کروں گا، وہ دنیا جس کی اتنی مدت سے آرزو کرتا رہا ہوں، میں صرف یہی کر سکتا تھا کہ طاعون کے خوف کو بھول جاؤں۔

لیکن یہ بہت دیر تک قائم نہیں رہا۔ اب خوجہ مجھ سے یہ کہلوانا چاہتا تھا کہ جب اس کی جگہ لے لوں گا تو کیا کروں گا۔ اس اوٹ پٹانگ جسمانی انداز میں خود کو اتنی سختی سے جکڑے ہوئے، تاکہ یہ باور کر سکوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں اور یہ کہ سوجن محض ایک کیڑے کی کاٹ ہے، میرے اعصاب اس بری طرح مضمحل ہو چکے تھے کہ مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ جب اس نے اصرار کیا، مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ میں نے وطن لوٹنے پر اپنا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا جب میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے ایک دن میں اس کے ماجرا کی ایک اچھی کہانی رقم کروں، تو اس نے مجھے سخت تنفر سے دیکھا۔ میں اسے اتنی اچھی طرح نہیں جانتا تھا جتنی اچھی طرح وہ مجھے — حقیقت تو یہ ہے کہ بالکل نہیں! مجھے دھکا دے کر دور کرنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے اکیلا کھڑا ہو گیا جب وہ میری جگہ لے لے گا تب یہ فیصلہ کرے گا کہ مجھے کیا پیش آنا چاہیے! اس نے کہا کہ سوجن طاعون ہی کی گلٹی ہے؛ میں مرنے والا ہوں۔ اس نے بیان کیا میں مرنے سے پہلے کتنی بھیانک اذیت سے دوچار ہوں گا؛ خوف، جس کے لیے میں تیار نہیں تھا، موت سے بدتر ہو گا۔ جب وہ بتا رہا تھا کہ مرض کے عذاب کس طرح میرا ٹینٹوا دبائیں گے، خوجہ آئینے کے چوکھٹے سے باہر نکل آیا تھا؛ جب میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنے بستر پر، جسے اس نے پھوہڑپن سے فرش پر بچھا دیا تھا، پیر پھیلائے پڑا تھا، اور ان شدید تکلیفوں کی وضاحت کر رہا تھا جو مجھے جھیلنی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت اس نے پکارا، اور جب میں، لرزہ براندام، اس کی جانب گیا، تو فوراً اس پر پچھتایا؛ اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ مجھ پر رکھنے کی کوشش کی۔ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو، میں نے یہی سوچا کہ وہ کیڑے کی کاٹ ہی تھی، اس کے باوجود میں خوفزدہ تھا۔

پوری رات اسی طرح گزری۔ مجھے مرض کی چھوت لگانے کی کوشش میں وہ مسلسل یہی تکرار کرتا رہا کہ میں وہ ہوں اور وہ میں۔ یہ وہ اس لیے کر رہا ہے کہ اسے اپنی ذات سے باہر قدم رکھنے میں لطف آتا ہے، اپنے کو فاصلے سے دیکھنے میں، میں نے خیال کیا، اور اپنے سے کہتا رہا، جیسے کوئی خواب سے جاگنے کی جان توڑ کوشش کر رہا ہو: یہ ایک کھیل ہے؛ کیونکہ وہ خود یہ لفظ "کھیل" استعمال کر رہا تھا، لیکن

Scanned with CamScanner

اسے کسی ایسے شخص کی طرح سخت پسینہ آرہا تھا جو کسی جسمانی مرض میں مبتلا ہو، ایسے آدمی کی طرح نہیں جس کا گرم کمرے میں موذی خیالات دم گھونٹے دے رہے ہوں۔

جب سورج نکلا تو وہ ستاروں اور موت کے بارے میں بات کر رہا تھا، اپنی جھوٹی پیشین گوئیوں کے بارے میں، سلطان کی حماقت اور بدتر، اس کی ناشکری، اپنے عزیز ''احمقوں'' کے بارے میں، ''ہم'' اور ''وہ،'' اس کے بارے میں کہ اسے کوئی دوسرا ہونے کی کتنی خواہش ہے۔ میں اب مزید نہیں سن رہا تھا، میں باہر باغ میں گیا۔ کسی وجہ سے میرا ذہن جادو دانیت سے متعلق خیالات میں ڈوبا ہوا تھا جس کی بابت میں نے ایک قدیم کتاب میں پڑھا تھا۔ باہر کوئی حرکت نہیں تھی سوائے اس کے کہ گوریاں چہچہا رہی تھیں اور لیموں کے درختوں کی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدک پھر رہی تھیں۔ سکوت کس قدر سراسیمہ کر دینے والا تھا! مجھے استنبول میں دوسرے کمروں کا خیال آیا جہاں طاعون زدہ پڑے مر رہے ہوں گے۔ اگر خوجہ کی بیماری طاعون تھی تو وہ اسی طرح جاری رہے گی تا آنکہ وہ مر نہیں جاتا، میں نے غور کیا، وہ سرخ سوجن غائب نہیں ہو جاتی۔ مجھے اب یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس گھر میں زیادہ عرصے نہیں رہ سکوں گا۔ جب میں اندر لوٹا تو مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ کہاں فرار کر سکتا ہوں، کہاں اپنے کو چھپاؤں گا۔ میں خوجہ سے دور کسی جگہ کا خواب دیکھ رہا تھا، طاعون سے دور۔ اپنے تھوڑے سے کپڑے ایک جھولے میں ٹھونستے ہوئے، مجھے صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ جگہ کہیں قریب ہی ہو گی کہ اس تک بغیر گرفتار ہوئے پہنچ سکوں۔

❀❀

راجستھانی زبان کے معروف ادیب وجے دان دیتھا کا نام "آج" کے پڑھنے والوں کے لیے اجنبی نہیں۔ ان کی کہانیاں اس رسالے کے ایک سے زیادہ شماروں میں شامل ہو چکی ہیں۔ اس بار ان کی ایک شاہکار کہانی "دُودھا" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ راجستھان کی ایک پرانی لوک کہانی کا نیا روپ ہے۔ قصے کی دلکشی تو اس کی سب سے نمایاں خوبی ہے ہی، لیکن ایک جانی پہچانی کہانی کی اس بازگوئی میں اس کے علاوہ اور بھی لطف پنہاں ہیں۔ ایک باشعور اور حساس کہانی کار کے کسی پرانے قصے کو اپنے لفظوں میں بیان کرنے سے وہ قصہ نہ صرف نیا معلوم ہونے لگتا ہے بلکہ معاصر حقیقتوں کا رنگ بھی اس میں جھلک اٹھتا ہے۔ اس بازگوئی نے بہت سے پڑھنے والوں کو مسرت اور آگہی بخشنے کے علاوہ ایک سے زیادہ فلمی ہدایت کاروں کو اسے اپنے اپنے انداز میں فلم کی صورت میں پیش کرنے پر اکسایا۔ ایک طرف دیتھا کی یہ کہانی برسوں پہلے ہندوستان کے ایک محترم فلم ساز منی کول کی شاہکار فلم "دُودھا" کی بنیاد بنی تو دوسری طرف ابھی پچھلے سال اس پر مبنی بمبئی کی ایک مقبول عام فلم "پہیلی" نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ ان کی اور کئی کہانیاں بھی فلموں اور ڈراموں کی بنیاد بنی ہیں۔

وجے دان دیتھا ۱۹۲۶ء میں راجستھان کے مقام بورونڈا میں پیدا ہوئے، ہندی ادب میں ایم کیا اور راجستھانی زبان میں کہانیاں اور ناول لکھے اور لوک گیت جمع کیے۔ ان کی کہانیاں "باتاں ری پھلواڑی" (باتوں کی پھلواری) کے عنوان سے تیرہ جلدوں میں شائع ہوئیں۔ انھوں نے راجستھانی کہاوتوں کی ایک فرہنگ بھی مرتب کی ہے۔

ترکی زبان کے ادیب اورحان پاموک کے ناول کے راوی اور اس کے ہم شکل خوجہ کے قصے کے بعد دیکھیے کہ اس سے ملتے جلتے موضوع کو بھی برصغیر کی ایک لوک کہانی کی بازگوئی میں کس انداز سے برتا گیا ہے اور معنی کے کون کون سے پہلو روشن کیے گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

وجے دان دیتھا

ہندی سے ترجمہ۔ اجمل کمال

دُبدھا

ایک دھنی سیٹھ تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے کی برات دھوم دھام سے شادی کی تقریب مکمل کر کے واپس لوٹتے ہوئے جنگل میں بسرام کرنے کے لیے رُکی۔ گھنی کھیجڑی کی ٹھنڈی چھاؤں۔ سامنے ہلورے بھرتا تالاب۔ کنول کے پھولوں سے ڈھکا ہوا شفاف پانی۔ سورج سر پر چڑھنے لگا تھا۔ جیٹھ کی تیز چلتی گرم لو سے جنگل چیخ رہا تھا۔ کھانا دانا کھا کر چلیں تو بہتر۔ دولھے کے باپ نے زیادہ منوہار[1] کی تو سب براتی خوشی خوشی وہاں ٹھہر گئے۔ دلہن کے ساتھ پانچ داسیاں تھیں۔ وہ سب اس کھیجڑی کی چھاؤں میں دری بچھا کر بیٹھ گئیں۔ پاس ہی ایک وشال ببول تھا، پیلے پھولوں سے اٹا ہوا۔ چاندی کے سمان سفید ہلاریاں۔ باقی براتی اس کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بسرام کرنے کے بعد کھانے کا انتظام ہونے لگا۔

دلہن منھ پھرائے، گھونگھٹ ہٹا کر بیٹھ گئی۔ اوپر دیکھا۔ چکنی چکنی ان گنت ہری سانگریاں ہی سانگریاں۔ دیکھتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک پھیل گئی۔ اتفاق کی بات کہ اس کھیجڑی میں ایک بھوت کا بسیرا تھا۔ عطر پھلیل کی خوشبو سے مہکتے دلہن کے کھلے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کیا عورت کا ایسا روپ اور جوبن بھی ہو سکتا ہے! گلاب کے پھولوں کی کومل تا، خوشبو اور ان کا رس، مانو سانچے میں ڈھل گیا ہو۔ دیکھ کر بھی ایسے روپ پر یقین نہیں ہوتا۔ بادلوں کا ٹھکانا چھوڑ کر کہیں بجلی تو نہیں اتر آئی! ان مدھ بھری آنکھوں کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ مانو تمام فطرت کا روپ اس چہرے

---

[1] منوہار: درخواست۔

میں سما گیا ہو۔ ہزاروں عورتوں کا روپ دیکھا، پر اس چہرے کی تو رنگت ہی نرالی! کھیجڑی کی چھاؤں تک چمکنے لگی۔ بھوت کی جون سوارت ہوئی۔ دلہن کے بدن میں داخل ہونے کا خیال آنے پر اسے واپس ہوش آیا۔ اس سے تو اسے تکلیف ہوگی! ایسے روپ کو تکلیف کیسے دی جا سکتی ہے۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ یہ تو ابھی دیکھتے دیکھتے چلی جائے گی۔ پھر نہ اس میں داخل ہو کر ستانے کو من کرتا ہے اور نہ چھوڑے ہی بنتا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ تو کیا دولہے کو لگ جاؤں؟ پر دولہے کو لگنے پر بھی دلہن کا من تو تڑپے گا ہی۔ اس روپ کے تڑپنے پر نہ بادل برسیں گے نہ بجلیاں چمکیں گی۔ نہ سورج اُگے گا نہ چاند۔ قدرت کا سارا نظارہ ہی بگڑ جائے گا۔ اس کے من میں اس طرح کی دیا پہلے تو کبھی نہیں آئی۔ اس روپ کو دکھ دینے کے بجائے تو خود دکھ اٹھانا کہیں اچھا ہے۔ ایسا دکھ بھی کہاں نصیب ہوتا ہے!! اس دکھ کے لمس سے تو بھوت کا جیون مکمل ہو جائے گا۔

آخر بسرام کے بعد تو روانہ ہونا ہی تھا۔ دلہن جب اٹھ کر چلنے لگی تو بھوت کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ رات میں بھی صاف دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے یہ دُھند کیسی! سر چڑھے سورج کی روشنی پر اچانک یہ کالک کیسے پُت گئی!

چھم چھم کرتی ہوئی دلہن دولہے کے رتھ پر سوار ہو گئی۔ یہ دولہا کتنا خوش قسمت ہے! کتنا سکھی ہے! بھوت کے روم روم میں مانو کانٹے چبھنے لگے۔ دل میں جیسے آگ بھڑک اٹھی۔ برہا کی اس جلن کے کارن نہ تو مرنا ممکن ہے اور نہ ہی جینا۔ جیتے جی یہ جلن کیسے سہی جا سکتی ہے!! اور مرنے پر تو یہ جلن بھی کہاں! بھوت کے من میں ایسی الجھن تو کبھی نہیں ہوئی۔ رتھ کے اوجھل ہوتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔

اور اُدھر رتھ میں بیٹھے دولہے کے دل کی الجھن بھی کم نہیں تھی۔ دو گھڑی ہو گئی مغز ماری کرتے ہوئے، پر ابھی تک بیاہ کے خرچ کا حساب نہیں مل رہا تھا۔ باپو بہت ناراض ہوں گے۔ خرچ بھی کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ ایسی بھول چوک ہونے پر وہ آسانی سے خوش نہیں ہوتے۔ حساب اور بیوپار کا سکھ ہی سب سے بڑا سکھ ہے۔ باقی سب جھمیلے۔ خود بھگوان بھی پکا حسابی ہے۔ ہر ایک کے سانسوں کا پورا حساب رکھتا ہے۔ برسات کی بوند بوند، ہوا کی رگ رگ، اور دھرتی کے ذرے ذرے کا اس کے پاس ایک دم صحیح لیکھا ہے۔ قدرت کے حساب میں بھی جب بھول نہیں ہوتی تب بنیے کی بہی میں بھول کیسے کھٹ سکتی ہے!

تیوری پر بل ڈالے دولہا ہندسوں کا جوڑ توڑ بٹھا رہا تھا کہ دلہن نے رتھ کے پردے کو ہٹا کر باہر

Scanned with CamScanner

دیکھا۔ نظر نہ تکے، ایسی تیز دھوپ۔ ہرے بھرے کیروں پر سرخ ڈھالو دمک رہے تھے۔ کتنے سہانے! کتنے موہک! مسکراتے ڈھالوؤں میں دلہن کی نظر اٹک گئی۔ دولھے کی بانہہ پکڑ کر دلہن نا سمجھ بچے کی طرح بولی: "ایک دفعہ بھی سے نظر ہٹا کر باہر تو دیکھو۔ یہ ڈھالو کتنے سندر ہیں! ذرا نیچے جا کر دو تین انجلی ڈھالو تو لا دو۔ دیکھو، ایسی جلتی دھوپ میں بھی یہ پھیکے نہیں پڑے۔ جوں جوں دھوپ پڑتی ہے، توں توں رنگ اور نکھرتا ہے۔ دھوپ میں کیسا بھی رنگ یا تو اُڑ جاتا ہے یا سانولا پڑ جاتا ہے۔"

دولھا انسان جیسا انسان تھا۔ نہ زیادہ خوب صورت اور نہ زیادہ بدصورت۔ بیاہ تو بھری جوانی میں ہی ہوا تھا، پر اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ پانچ برس بعد ہوتا تو بھی چل جاتا، اور ہو گیا تو بھی اچھا۔ کبھی نہ کبھی تو ہونا ہی تھا۔ بڑا کام نبٹ گیا۔ نولکھے ہار پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا، "یہ ڈھالو تو ٹھیٹھ گنواروں کی پسند ہیں۔ تمھیں ان کی خواہش کیسے ہوئی؟ کھانے کی اِچھا ہو تو گانٹھ کھول کر چھوارے دوں، ناریل دوں۔ جی بھر کر کھاؤ۔"

دلہن بھی نپٹ گنوار نکلی۔ ہٹ کرتی ہوئی سی بولی، "نہیں، مجھے تو بس ڈھالو لا دو۔ آپ کا احسان مانوں گی۔ آپ تکلیف نہ اٹھانا چاہیں تو مجھے اجازت دیں، میں توڑ لاتی ہوں۔"

دولھے نے پھر وہی بات کی۔ کہا، "ان کانٹوں سے کون الجھے! جو ایک دم جنگلی ہوتے ہیں وہی ڈھالو توڑتے ہیں، اور وہی کھاتے ہیں۔ مکھانے کھاؤ، بتاشے کھاؤ۔ چاہو تو مصری کھاؤ۔ ان جھبیلوں اور ڈھالوؤں کی تو گھر پر بات ہی مت کرنا۔ لوگ ہنسیں گے۔"

"ہنسنے دو۔"

دلہن یہ بات کہہ کر ترنت رتھ سے کود پڑی۔ تتلی کی طرح کیر کیر پر اڑتی رہی۔ کچھ ہی دیر میں اوڑھنی بھر کر سرخ ڈھالو لے آئی۔ گھڑے کے پانی سے انھیں اچھی طرح دھویا، ٹھنڈا کیا، ہونٹوں اور ڈھالوؤں کا رنگ ایک سا۔ پر دولھے کو نہ ڈھالوؤں کا رنگ اچھا لگا نہ ہونٹوں کا۔ وہ تو حساب میں الجھا ہوا تھا۔ دلہن نے کافی نہورے کیے، پر وہ ڈھالو کھانے پر راضی نہ ہوا۔

دلہن نے کہا، "آپ کی مرضی۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ میرا تو ایک بار من ہوا کہ ان ڈھالوؤں کے بدلے نولکھا ہار کیر میں ٹانک دوں تب بھی کم ہے۔"

ڈھالو کھاتی دلہن کے چہرے کی طرف دیکھ کر دولھا کہنے لگا، "ایسی بے وقوفی کی بات پھر کبھی

مت کرنا۔ باپو بہت ناراض ہوں گے۔ وہ روپ کے بجائے عورت کے گنوں کا زیادہ آدر کرتے ہیں۔"

دلہن مسکراتی ہوئی سی بولی، "اب معلوم ہوا، ان کے ڈر سے ہی آپ حساب میں الجھے ہوئے ہیں۔ پر ساری باتیں اپنی اپنی جگہ شوبھا دیتی ہیں۔ بیاہ کے وقت حساب میں پھنسنا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

دولھے نے کہا، "بیاہ ہونا تھا سو ہو گیا، پر حساب تو ابھی باقی ہے۔ بیاہ کے خرچ کا سارا حساب سنبھلا کر ٹھیک تیج کے دن مجھے بیوپار کے لیے دساور جانا ہے۔ ایسا شبھ مہورت پھر سات برس تک نہیں ہے۔"

پر کنوار دلہن کو اس شبھ مہورت کی بات سن کر رتی بھر بھی خوشی نہیں ہوئی۔ بات سنتے ہی ڈھالوؤں کا سواد بگڑ گیا۔ لگا جیسے کوئی دل کو دبا کر خون نچوڑ رہا ہو۔ یہ کیسی انہونی بات سنی! اک بارگی یقین ہی نہیں آیا۔ پوچھا، "کیا کہا؟ آپ بیوپار کی خاطر دساور جائیں گے؟ سنا ہے آپ کی حویلی میں تو دولت کے بھنڈار بھرے ہیں۔"

دولھا گمان بھرے لہجے میں بولا، "اس میں کیا شک ہے! تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ ہیرے موتیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ پر دولت تو دن دونی اور رات چوگنی بڑھتی رہے تبھی اچھا ہے۔ بیوپار تو بنیے کا پہلا دھرم ہے۔ ابھی تو دولت بہت بڑھانی ہے۔ ایسا بڑھیا مہورت کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔"

دلہن نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ بات کرنے کا مطلب ہی کیا تھا۔ ایک ایک کر کے سارے ڈھالو باہر پھینک دیے۔ دولھے نے مسکرا کر کہا، "میں نے تو تمھیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ ڈھالو تو گنواروں کے کھانے کی چیز ہیں! اپن بڑے آدمیوں کو یہ اچھے نہیں لگتے۔ آخر کھاتے نہیں بنے تو تمھیں بھی پھینکنے ہی پڑے۔ تیز دھوپ میں جلیں سو الگ!"

یہ بات کہہ کر دولھا دھوپ کا تخمینہ لگانے کے لیے رتھ سے باہر دیکھنے لگا۔ نظر سنگ اٹھے، ایسی تیز دھوپ۔ پیلے پھولوں سے لدی ہینگانیوں کی ان گنت جھاڑیاں اسے ایسی لگیں مانو گھور گھور آگ کی لپٹیں اٹھ رہی ہوں۔ دولھے نے تاکید کرتے ہوئے کہا، "اب ان ہینگانیوں کی خاطر تو ضد نہیں کرو گی؟ ان میں اچھائی ہوتی تو بھلا گذریے کب چھوڑتے۔"

دلہن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ سوچنے لگی کہ اس پتی کے

Scanned with CamScanner

بھروسے گھر کا آنگن چھوڑا، ماں باپ کی جدائی سہی۔ سہیلیوں کا جھنڈ، بھائی بھتیجے، تالاب کا کنارہ، گیت، گڈے گڈی کا کھیل، بھرنی، آنکھ مچونی، دھما چوکڑی، یہ تمام سکھ چھلکا کر اس بچی کا ہاتھ تھاما، ماں کی گود چھوڑ کر پرائے گھر کی آس کی اور یہ ٹھیک تیج کے دن شبھ مہورت کی بیلا بیوپار کے لیے دساور جانا چاہتے ہیں! پھر یہ بے شمار دولت کس سکھ کے لیے ہے؟ جیتے جی کام آتی نہیں، مرنے پر کفن کی غرض بھی پوری نہیں کرتی۔ کس سکھ کی آشا میں ان کے پیچھے آئی۔ کس ان دیکھی خوشی اور سکون کے بھروسے پرائی ٹھور کا تو اس قبول کیا۔ کمائی، تجارت، جائیداد اور دولت پھر کس دن کے لیے ہے۔ اصلی سکھ کے اس سودے کے بدلے تینوں لوک کا راج ہاتھ لگے تو بھی کس کام کا! دنیا کی ساری دولت کے بدلے بھی بیتا ہوا پل واپس نہیں لوٹایا جا سکتا۔ انسان دولت کی خاطر ہے کہ دولت انسان کی خاطر، فقط اسی حساب کو اچھی طرح سمجھنا ہے۔ پھر کون سا حساب باقی رہ جاتا ہے! سونے کی عظمت بڑی ہے یا بدن کی، سانس کی عظمت بڑی ہے یا دولت کی، اس سوال کے جواب میں ہی زندگی کے سارے معنی پروئے ہوئے ہیں۔

دولھا اپنے حساب میں ڈوبا تھا، دلہن اپنے خیالوں میں غوطے لگا رہی تھی اور بیل اپنی چال میں مگن تھے۔ چلنے والا منزل پر پہنچے گا ہی، آخر سیٹھ کی حویلی کے سامنے برات آ کر رکی۔ گاجے باجے اور ڈھول نگاڑوں کے سواگت کے ساتھ دلہن رنواس[1] میں پہنچی۔ جس نے بھی دیکھا سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ روپ ہو تو ایسا! رنگ ہو تو ایسا!

شام کو رنواس میں گھی کے دیے جلائے گئے۔ رات کے دوسرے پہر دولھا رنواس میں آیا۔ آتے ہی دلہن کو نصیحت دینے لگا کہ وہ گھر کی عزت کا پورا پورا خیال رکھے، ساس سسر کی سیوا کرے، اپنی آبرو اپنے ہاتھ میں۔ دو دن کے لیے بدن کی چاہ کیوں جگائی جائے، دو دن کا ساتھ رہنا پانچ سال تک تکلیف دے گا۔ وقت بیتتے کیا دیر لگتی ہے! دیکھتے دیکھتے پانچ سال گزر جائیں گے۔ پھر کس بات کی کمی۔ یہی رنواس، یہی چراغ، یہی راتیں اور یہی تیج۔ وہ کسی بات کی چنتا کو پاس ہی نہ پھٹکنے دے۔ پلک جھپکتے پانچ برس گزر جائیں گے۔

نصیحت کی یہ اصول باتیں دلہن چپ چاپ سنتی رہی۔ کچھ کہنا سننا اور کرنا تو اس کے بس میں تھا نہیں، جو پتی کی اچھا وہی اس کی اچھا۔ جو باپو کی مرضی وہی بیٹے کی مرضی۔ جو لکشمی کی خوشی وہی باپو کی

[1] رنواس، رانیوں کے رہنے کی جگہ، مراد زنان خانہ یا خواب گاہ۔

خوشی۔ اور جو لالچ کی اچھا وہی لکشمی کی اچھا۔ نصیحت کی ان باتوں میں ساری رات ڈھل گئی۔ رات کے ساتھ جھلمل جھلمل چمکتے نو لاکھ تارے بھی ڈھل گئے۔

اور اُدھر اُس کھیجڑی کے نیچے بے ہوشی ٹوٹنے پر بھوت کی آنکھیں کھلیں۔ چاروں طرف دیکھا۔ سُونا جنگل، سوکھی ہریالی، گہری کھیجڑی، گہری چھاؤں۔ جھولتی سانگریاں، پر کہاں دلہن، کہاں اس کی مدھ بھری آنکھیں، کہاں اس کا خوبصورت چہرہ، کہاں اس کے گلابی ہونٹ۔ کہیں وہ سپنا تو نہیں تھا۔ بے ہوشی کے بعد ہوش میں آتے ہی اسے ایسا لگا مانو اس کے من میں چھل کپٹ کے میل کی جگہ دودھ کی گرم دھاراں نے لے لی ہو۔ ایسا سورج تو آج سے پہلے کبھی نہیں اگا۔ بڑا سا گلابی گولہ۔ تمام دنیا میں روشنی ہی روشنی۔ کیسی مند مند ہوا چل رہی ہے! ہوا کے ان دیکھے جھونکے میں جھولتی ہریالی۔ اس کا من ہر طرح کے ان گنت روپ دھار کر قدرت کے ذرے ذرے میں سما گیا۔

ارے! آج سے پہلے تو سورج اس طرح غروب نہیں ہوا! پچھم دِشا میں مانو گلال ہی گلال چھترا گیا ہو۔ دھرتی پر نہ تو ٹھٹکتی ہوئی روشنی نہ پورا اندھیرا۔ نہ گگن میں چاند نہ سورج اور نہ ہی کوئی تارا۔ گویا قدرت نے جھینا گھونگھٹ ڈال لیا ہو۔ چہرہ بھی دکھتا ہے، گھونگھٹ بھی دکھتا ہے۔ اب قدرت نے پھر چندری بدلی۔ نولکھ تاروں جڑی چندری۔ دھندلا دھندلا چہرہ دکھ رہا ہے۔ دھندلے پیڑ، دھندلی ہریالی، گویا سپنے کا تانا بانا بنا جا رہا ہو۔ پہلے تو قدرت کبھی اتنی موہک نہیں لگی۔ یہ سب دلہن کے چہرے کا کرشمہ ہے!

اور اُدھر دلہن کا پتی اس جو بن سے منہ پھیر کر دساور کی راہ چل پڑا۔ کمر پر ہیرے موتیوں کی پوٹلی بندھی ہوئی تھی۔ کندھے پر آگے پیچھے لٹکتی دو گٹھریاں، اور سامنے آکاش پر چمکتا بیوپار کا اکھنڈ سورج۔ سکھ، لابھ اور کمائی کا کیا پار!

جاتے ہوئے وہ اسی کھیجڑی کے پاس سے گزرا۔ بھوت نے اسے ترنت پہچان لیا۔ آدمی کا روپ دھار کر اس سے رام رام کیا۔ پوچھا: ''بھائی، ابھی تو بیاہ کے منگل دھاگے بھی نہیں کھلے۔ اتنی جلدی کہاں چل دیے؟''

سیٹھ کے لڑکے نے کہا: ''کیوں، منگل دھاگے کیا دساور میں نہیں کھل سکتے؟''

بھوت کافی دور تک ساتھ چلتا رہا۔ ساری باتیں جان لیں کہ وہ پانچ سال تک پردیس میں

Scanned with CamScanner

بیوپار کرے گا۔ اگر یہ مہورت چوک جاتا تو اگلے سات سال تک ایسا بڑھیا مہورت ہاتھ نہ لگتا۔ سیٹھ کے لڑکے کی بول چال اور سبھاؤ کو غور سے دیکھنے بھالنے کے بعد اس نے اپنی راہ لی۔ من ہی من میں سوچنے لگا کہ سیٹھ کے لڑکے کا روپ دھار کر سویرے ہی سیٹھ کی حویلی پہنچ جائے تو پانچ سال تک کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ یہ بات تو خوب بنی! کیا عمدہ موقع ہاتھ لگا ہے! آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ بھگوان نے آخر بنتی سن ہی لی۔ پھر تو اس سے ایک پل بھی نہیں رہا گیا۔ ہو بہو سیٹھ کے لڑکے کا روپ دھار کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ من میں نہ خوشی کی حد تھی نہ آنند کی۔

ایک پہر دن باقی تھا، تو بھی کافی اندھیرا ہو گیا۔ اُتر سے زور کی کالی پیلی آندھی آتی نظر آئی۔ آندھی دھیرے دھیرے چڑھنے لگی۔ دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھنے لگا۔ سورج کے ہوتے ہوئے بھی اندھیرا! ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ قدرت کو بھی کیسے کیسے سپنے آتے ہیں۔ قدرت کے اس سپنے کے بنا زمین پر بچھی ہوئی پیروں تلے کی دھول کو سورج ڈھکنے کا موقع کب ہاتھ لگتا ہے! زمین پر پڑی دھول آکاش پر چڑھ گئی۔ اندھڑ کی مار سے سارا ماحول کراہنے لگا۔ پہاڑوں تک کی جڑیں ہلا دینے والی آندھی۔ کھوکھلے غرور والے بڑے بڑے پیڑ چرمرا کر گرنے لگے۔ نرمی رکھنے والی لچکیلی جھاڑیاں آندھی کے ساتھ ہی اِدھر اُدھر جھکنے لگیں۔ ان کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ پیروں تلے روندی جانے والی گھاس کا تو کچھ بھی خراب نہیں ہوا۔ حال چال پوچھتی، ڈلارتی، سہلاتی ہوئی آندھی اس کے اوپر سے نکل گئی۔ ساری ونس پتی؎ مانو پالنے میں جھولنے لگی۔ پات پات اور کونپل کونپل کی ٹھیک سے سنبھال ہو گئی۔ بڑے پرندوں کو جھپاٹے لگنے لگے۔ چھوٹے پنچھی ڈالوں سے چپک کر بیٹھ گئے۔ اڑنا ممکن نہ رہا۔ سمو چے آکاش پر آندھی کا راج ہو گیا۔ چاروں جانب تیز سرسراہٹ، گویا جنگل کراہ رہا ہو۔ سورج کے تاپ اور تیج کو دھرتی کی دھول نگل گئی۔ عجیب ہے آندھی کا یہ کرتب! عجیب ہے ریت کی یہ گھومر! سموچی قدرت اس طوفان میں چھپ گئی۔ سارا برہمنڈ ایک آکار ہو گیا۔ نہ آکاش دکھتا ہے نہ سورج۔ نہ پہاڑ نہ ونس پتی اور نہ زمین۔ بے شکل اپرم پار۔ قدرت کی اس ذرا سی جماہی کے سامنے نہ انسان کے دھیان کی کوئی ہستی ہے نہ اس کی طاقت کی کچھ اوقات، نہ اس کی انا کی کچھ حیثیت اور نہ اس کے کام کاج کی کوئی حقیقت۔

؎ ونس پتی: نباتات۔

Scanned with CamScanner

قدرت کی شبیہ کی دوسری تصویر ـــــ تھوڑا تھوڑا اجالا پھیلنے لگا۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھنے لگا۔ پل پل اجالے کا وجود پھیلنے لگا۔ دھیرے دھیرے قدرت کی شبیہ صاف دکھنے لگی۔ پہاڑ کی جگہ پہاڑ، سونے کی تھالی سا گول سورج، پیڑوں کی جگہ پیڑ، جھاڑیوں کی جگہ جھاڑیاں، ہوا کی جگہ ہوا۔ یہ کیا جادو ہوا... کہ یکا یک تڑا تڑ موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ بوند سے بوند ٹکرانے لگی۔ گویا بادلوں کے منہ کھول دیے گئے ہوں۔ قدرت اشنان کرنے لگی۔ اس کا ذرہ ذرہ نہا گیا۔ ندی نالوں میں پانی بہنے لگا۔ چاروں اور پانی ہی پانی۔ نہاتی ہوئی قدرت کو دیکھ کر سورج کی چھپی روشنی پرسکون ہوئی۔

بھوت سوچنے لگا کہ کچھ ہی دیر میں یہ کیا ماجرا ہوا۔ دیکھنے پر بھی یقین نہ ہو، یہ قدرت کی کیسی حرکت ہے۔ یہ کیا ہوا، کیسے ہوا؟ کہیں اس کے من کی آندھی ہی تو باہر ظاہر نہیں ہوئی؟ قدرت کی یہ لیلا! کہیں اس کے من ہی میں تو دبی ہوئی نہیں تھی؟ اس گمان کے زور میں تیز چلنے لگا۔ دل ہی دل میں تدبیر سوچتا جا رہا تھا اور راہ چلتا جا رہا تھا۔

وہ حویلی نہ جا کر پہلے سیدھا سیٹھ کی دکان پر پہنچا۔ حساب کتاب کرتے ہوئے سیٹھ نے بیٹے کو دیکھا، تب بھی اس کا دل نہ مانا۔ دساور کے بیے گیا ہوا بیٹا واپس کیسے آ سکتا ہے؟ آج دن تک اس نے کبھی کہنا نہیں ٹالا۔ بیاہ ہونے کے بعد انسان کام کا نہیں رہتا، یہ سب کیا دھرا دلہن کا ہے۔ اب ہو چکی کمائی! یا تو بیوپار کی حاضری بجا لو یا پھر عورت کی۔

باپو کے ہونٹوں پر آتی بات کو بیٹا بغیر کہے ہی سمجھ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا، ''پہلے آپ میری بات سنو! بیوپار کے لیے صلاح مشورہ کرنے کے لیے ہی واپس آیا ہوں۔ اگر آپ کی مرضی نہیں ہوگی تو گھر گئے بغیر ہی واپس مڑ جاؤں گا۔ راستے میں سمادھی لگائے ایک مہاتما کے درشن ہو گئے۔ سارے شریر پر دیمک کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے ستھرائی سے دیمک ہٹائی، کنویں سے پانی نکال کر انھیں نہلایا، پانی پلایا، کھانا کھلایا۔ تب مہاتما نے خوش ہو کر وردان دیا کہ سویرے پلنگ سے نیچے اترتے ہی مجھے روزانہ پانچ مہریں ملیں گی۔ دساور جانے کی بات سوچتے ہی وردان ختم ہو جائے گا۔ اب آپ جو حکم دیں مجھے منظور ہے۔''

ایسے غیر متوقع وردان کے بعد جو حکم ہونا تھا وہی ہوا۔ سیٹھ خوشی خوشی مان گیا۔ سیٹھ کے ساتھ سیٹھانی بھی بہت خوش ہوئی۔ اکلوتا بیٹا آنکھوں کے سامنے رہے گا، اور کمائی کی جگہ کمائی کا جگاڑ ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

دلہن کو خوشی کے ساتھ تعجب اور غرور بھی ہوا کہ بھلا یہ روپ چھوڑ کر کون دساور جا سکتا ہے۔ تیسرے دن ہی واپس لوٹنا پڑا۔

دکان کا حساب کتاب اور بھوجن کر کے پتی دو گھڑی رات ڈھلنے پر رنواس میں آ کر سو گیا۔ چاروں کونوں میں گھی کے دیے جل رہے تھے۔ پھولوں کی سیج۔ ایسے انتظار سے بڑھ کر کوئی آنند نہیں۔ پایل کی جھنک جھنک جھنکار سنائی دی۔ اس جھنکار سے بڑھ کر کوئی سُر نہیں۔ سولہ سنگھار سجی دلہن رنواس میں آئی۔ اس حسن سے بڑھ کر کوئی منظر نہیں۔ سمو چے رنواس میں عطر پھلیل کی خوشبو چھا گئی۔ اس خوشبو سے بڑھ کر کوئی مہک نہیں۔ اس مہک نے ہی تو اس کھیجڑی کے مقام پر بھوت کی سوئی خواہشوں کو جگایا تھا۔ اور آج رنواس میں آخر ان کی نظروں کا ملن ہوا۔ اتنی جلدی من چاہی ہو جائے گی، اس کا تو سپنے میں بھی خیال نہیں تھا۔

دلہن بے فکر پاس آ کر بیٹھ گئی۔ گھونگھٹ کیا ہٹایا، مانو تینوں لوکوں کا پورا سکھ جگمگا رہا ہو۔ اس روپ کی تو چھایا بھی دہکتی ہے۔ دلہن مسکراتی ہوئی بولی: ''میں جانتی تھی کہ تم بیچ راہ ہی سے لوٹ آؤ گے۔ یہ تاروں بھری رات اس موقعے پر آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ ایسے ارادے کے مالک تھے تو پھر میرے روکنے کے باوجود گئے ہی کیوں؟ میری منت پوری ہوئی۔''

یہ بات سنتے ہی بھوت کے من میں بگولا سا اٹھا۔ اس پوتر دودھ میں کیچڑ کیسے ملائے؟ اسے دھوکا دینے سے بڑھ کر کوئی پاپ نہیں۔ یہ تو اصلی پتی مان کر اتنی خوش ہوئی ہے، پر اس سے بدتر جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے! یہ جھوٹ کا انتم چھور ہے۔ آخری حد۔ اس معصوم پیار کے ساتھ کیسے دغا کرے! پیار کرنے کے بعد تو بھوتوں کا من بھی ڈھل جاتا ہے۔ کوئی برابر کا ہو تو چھل بل کی طاقت بھی آزمائے، پر نیند میں سوئے ہوئے کا گلا چاک کرنے پر تو تلوار میں بھی کلنک لگتا ہے

بھوت تھوڑا دور کھسک کر بولا: ''کیا معلوم منت پوری ہوئی یا نہیں۔ پہلے پوری چھان بین تو کر لو کہ میں کہیں دوسرا آدمی تو نہیں ہوں۔ کوئی جعل ساز تمھارے پتی کا روپ دھار کر تو نہیں آ گیا!''

دلہن یہ بات سن کر پہلے تو کچھ چونکی، پھر نظر گڑا کر پاس بیٹھے شخص کو اچھی طرح دیکھا۔ ہو بہو وہی چہرہ، وہی رنگ روپ، وہی بولی۔ ترنت سمجھ گئی کہ پتی اس کے کردار کو پرکھنا چاہتا ہے۔ مسکراہٹ کی چمک پھیلاتے ہوئے بولی: ''میں سپنے میں بھی پرائے مرد کے سائے تک کا لمس نہیں آنے دیتی۔

Scanned with CamScanner

پھر بھی آنکھوں یہ بات کیسے ممکن ہے۔ اگر دوسرا آدمی ہوتا تو میرے کردار کی آگ سے کبھی کا بھسم ہو چکا ہوتا۔"

پہلے تو یہ بات بھوت کو چبھی، ہونٹوں پر آئی ہوئی بات کو فوراً نگل گیا کہ تب تو اس کے کردار میں ضرور ہی کھوٹ ہے۔ وہ بھسم ہو جاتا تو اُس کا کردار سچا تھا۔ اصلیت میں دوسرا آدمی ہوتے ہوئے بھی جب وہ بھسم نہیں ہوا تو اس کا کردار ایک دم بجھ ہوا ہے۔ پر اگلے ہی پل بات کا دوسرا پہلو سوچتے ہی اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ الٹا بے حد خوش ہوا۔ سوچنے لگا کہ فقط چہرے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ سچا پتی ہوتا تو بیوپار کے لالچ میں عورت کی یہ مایا چھوڑ سکتا تھا! کیا اس نے اس لیے ہاتھ تھاما کہ ایسے روپ کو برہ کی آگ میں جلنے کے لیے چھوڑ کر چلتا بنے؟ کوئی اندھا بھی اس روپ کی دمک کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ تب وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی کس طرح اندھا بنا؟ آگ کی گواہی میں سات پھیرے لگا لیے تو کیا ہوا، اس کی پریت میں سچائی کہاں ہے! اور بھوت ہو کر بھی میں نے سچا پیار کیا۔ چھل کرتے ہوئے دل کانپتا ہے۔ میری پریت سچی ہے۔ میری چاہت کھری ہے۔ تبھی تو دونوں کا ست بچ گیا۔ پر پھر بھی راز رکھنے سے پریت کو ٹھیس لگے گی۔ اصلیت بتائے بغیر اس رنواس میں سانس لینا بھی دوبھر ہے۔ پاس کھسک کر کہنے لگا، "دراصل میں ہوں تو دوسرا آدمی ہی، پر پھر بھی تمھارا کردار کھرا ہے، کیونکہ میری پریت سچی ہے۔ منڈپ کے اصلی پتی کی پریت جھوٹی ہے۔ تبھی تو وہ ایسے روپ سے منھ پھیر کر ساور کے لیے چل پڑا۔"

پر دلہن سچ جھوٹ کی کیسے پہچان کرے! یہ باتیں رتی بھر بھی اس کے پلے نہیں پڑیں۔ خود ماں باپ جسے اپنا بیٹا مانتے ہیں، اس ہو بہو شکل والے آدمی کو اپنا پتی ماننے میں کیسی ہچکچاہٹ! شکل اور رنگ روپ ہی تمام رشتوں کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

تب اس کے بعد اس بھوت نے دلہن کو ساری بات بتائی، کہ اس کھیجڑی کے مقام پر اس کا روپ دیکھ کر اس کی کیا دشا ہوئی۔ اس کے روانہ ہوتے ہی وہ کیسے غش کھا گیا۔ واپس کب ہوش آیا۔ پردیس جاتے ہوئے اس کے پتی کے ساتھ اس کی کیا کیا باتیں ہوئیں۔ پھر اس کا روپ دھار کر کیسے اس حویلی پر آنے کا ارادہ کیا۔ راہ چلتے ہوئے آندھی پانی کی بات بھی وستار سے کہی۔ دلہن کٹھ پتلی کی طرح گم سم بیٹھی ساری بات سنتی رہی۔ کیا اسی بات کو سننے کی خاطر وِدھاتا نے اسے کان دیے ہیں؟

Scanned with CamScanner

اس کی کلائی کو سہلاتے ہوئے بھوت آگے کہنے لگا: "ماں باپ کو تو روز کی پانچ مہروں اور دکان کی کمائی سے مطلب ہے۔ اصل بھید سے انھیں کچھ لینا دینا نہیں۔ پر تمھیں نہ جتانے پر پریت کے منھ پر کالک پت جاتی۔ اگر میں یہ بھید ظاہر نہ کرتا تو پانچ سال تک تم سپنے میں بھی اصلیت نہ جان پاتیں۔ تم تو اسلی پتی مان کر ہی ملاپ کرتیں۔ پر میرا من نہیں مانا۔ میں اپنے من سے صحیح بات کیسے چھپاتا؟ آج سے پہلے بہت سی عورتوں کے شریر میں گھس کر انھیں بہت تکلیف دی، پر میرے من کی ایسی حالت تو کبھی نہیں ہوئی۔ رام جانے اتنی دیا میرے من کے کس کونے میں چھپی تھی۔ اس کے باوجود اگر تمھاری خواہش نہ ہو تو میں اسی پل واپس چلا جاؤں گا۔ جیتے جی اس طرف منھ تک نہیں کروں گا۔ تمھیں تڑپا کر مجھے پریت کا آنند نہیں چاہیے۔ پھر بھی عمر بھر تمھارا احسان مانوں گا کہ تمھاری پریت کی وجہ سے میرے دل کا زہر امرت میں بدل گیا۔ عورت کے روپ اور مرد کی پریت کی ہی تو سب سے اونچی سطح ہے۔"

روپ کی پتلی کے ہونٹ کھلے۔ بولی: "ابھی تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ بھید ظاہر ہونا ٹھیک رہا یا ظاہر نہ ہونا ٹھیک رہتا۔ کبھی پہلی بات ٹھیک لگتی ہے کبھی دوسری۔"

دلہن کی آنکھوں میں نظر گڑا کر بھوت نے کہا: "زچہ کے درد کو بھلا بانجھ کیا سمجھے! اس پیڑا میں ہی کوکھ کا سب سے گہرا سکھ نواس کرتا ہے۔ سچائی اور کوکھ کے پھل کا درد ایک سا ہوتا ہے۔ اس سچائی کو چھپانے میں نہ تو تکلیف تھی اور نہ ہی آنند۔ وہ تو فقط حقیقت کا دھوکا ہوتا، آنند کا ڈھونگ۔ میں کئی عورتوں کے شریر میں داخل ہوا، تب کہیں جا کر حقیقت کے دھوکے کی ٹھیک سے پہچان ہوئی۔ میں کئی ایسی ستی ساوتری عورتوں کو جانتا ہوں جو ملاپ کے وقت پتی کے چہرے میں کسی اور کا چہرہ دیکھتی ہیں۔ یوں کہنے کو تو وہ پرائے مرد کی چھایا کو بھی نہیں چھوتیں، پر پتی کے بہانے دوسرے چہرے کے خیال میں شوہر سے کتنی وفاداری ہے اس کی صحیح پہچان جتنی مجھے ہے اتنی خود اوپر والے کو بھی نہیں ہے۔ پتی ورتا عورتوں کے تماشے میں نے بہت دیکھے ہیں۔ ڈر تو فقط بدنامی کا ہے۔ بھید کھلنے کا ڈر نہ ہو تو خود بھگوان بھی پاپ کرنے سے نہ چوکے۔ اب جو بھی تمھاری اچھا ہو، ظاہر کر دو۔ میں نے تو بھوت ہو کر بھی کوئی بات نہیں چھپائی۔"

ایسی پہیلی سے تو آج تک کسی عورت کا سامنا نہیں ہوا۔ اپنی مرضی سے پرائے مرد کی ہونے کی

Scanned with CamScanner

تو بات ہی الگ ہے۔ پرائی عورت اور پرائے مرد کی خاطر کس کا من نہیں للچاتا، پر سماجی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے پردہ نہیں ہٹایا جا سکتا۔ پردے کے پیچھے جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوتا ہی ہے۔ سوچ بچار کر ایسی بات کا جواب دینا کتنا دوبھر ہے! وہ اس طرح گم سم بیٹھی رہی مانو بولنا ہی بھول گئی ہو۔ اتنی باتیں سننے کے بعد تو وہ بالکل گونگی ہو گئی۔

دلہن کے دماغ میں انجانے ہی ایک لہر اٹھی۔ وہ سوچنے لگی، جنم کے وقت تھال کے بجائے سُوپ بجا۔ گھر والوں کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ لڑکا ہوتا تو زیادہ خوش ہوتے۔ ماں باپ کی نظر میں ڈھور بڑھنے میں وقت لگتا ہو تو بیٹی کا بدن بڑھنے میں بھی کوئی وقت لگے۔ دسواں سال لگتے ہی ماں باپ اس کے ہاتھ پیلے کر کے پرائے ٹھکانے بھیجنے کی چنتا کرنے لگے۔ وہ نہ آنگن میں سماتی تھی اور نہ گگن میں۔ چھاچھ اور لڑکی مانگنے میں کیسی شرم۔ رشتے پر رشتے آنے لگے۔ اس کے روپ کا چرچا چاروں اور ہوا میں گھل گیا تھا۔ سولہ سال پورے کرنے مشکل ہو گئے۔ ماں کی کوکھ میں سما گئی پر گھر کے آنگن میں نہ سما سکی۔ اچانک اس حویلی سے ناریل آیا۔ اس کی قسمت کہ گھر والوں نے ناریل لوٹایا نہیں۔ اس حویلی کے بجائے اگر کوئی دوسرا گھر ہوتا تب بھی اسے تو جانا ہی تھا۔ جس کے لیے گھر والوں کی مرضی ہوتی اسی کا ہاتھ تھامنا پڑتا۔ پتی بیوپار اور حساب کتاب میں ہی کھویا رہتا ہے۔ اس کی نظر میں ہنڈیا کے پیندے اور عورت کے چہرے میں کوئی فرق نہیں۔ پھٹتا ہوا جوبن بھی ویسا اور چٹخی ہوئی مٹی بھی ویسی۔ نہ رتھ میں بیوی کے دل کی بات سمجھا اور نہ رنواس میں۔ سونی رنواس اور چکنی سیج چھوڑ کر اپنے بیوپار کے لیے چل پڑا۔ واپس مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اور آج کی بھوت کے پیار کی روشنی کے سامنے تو سورج بھی دھندلا گیا! سات پھیرے والا پتی زبردستی روانہ ہوا تو اس کا بس چلا نہیں۔ بھوت کے اس پیار کے سامنے بھی اس کا بس کہاں چلا! جانے والے کو روک نہ سکی تو پھر رنواس میں آنے والے کو کیسے روکے؟ یہ پیار جتاتا ہے تو کانوں میں تیل کیسے ڈالے؟ پتی نے اسے اس طرح منجدھار میں چھوڑ دیا۔ بھوت ہوتے ہوئے بھی اس نے پیار جتایا تو کیسے انکار کرے؟ اگر سپنا بس میں ہو تو پیار بھی بس میں ہو! وہ اپنی سدھ بدھ بسرا کر بھوت کی گود میں لڑھک گئی۔

کہیں یہ دلہن کے من کا ہی تو بھوت نہیں تھا، جو حقیقت کا روپ دھار کر ظاہر ہوا؟ بھرا اپنے من سے بیاوری! جہاں بھاشا اٹک جاتی ہے وہاں خاموشی کام کر جاتی ہے۔ اب کچھ کہنا سننا باقی نہ رہا۔

Scanned with CamScanner

دونوں ہی ایک دوسرے کے اندر کی بات سمجھ گئے۔ پھر چراغ کی روشنی گل ہوگئی اور اندھیرا اجالے کا روپ دھار کر دپ دپ کرنے لگا۔ سیج کے مرجھائے ہوئے پھولوں کی پنکھڑی پنکھڑی کھل اٹھی۔ رنواس کی روشنی سوارت ہوئی۔ خواب گاہ کا اندھیرا سوارت ہوا۔ آسمان کے نولکھ تاروں کی جگمگاہٹ آپ ہی بڑھ گئی۔

ایسی رسیلی راتوں کے ہوتے وقت کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ چٹکیوں میں دن بیتنے لگے۔ خوب بیوپار بڑھا۔ خوب لین دین بڑھا۔ سماج میں خوب مقام بڑھا۔ ماں باپ تو خوش تھے ہی، سارا علاقہ بھی سیٹھ کے لڑکے سے بے حد خوش تھا۔ وقت بے وقت سب کے کام آتا تھا۔ دوسرے بنیوں کے موافق گلے نہیں کاٹتا تھا۔ بالکل متحمل مزاج، ہمیشہ اچھے سبھاؤ والا۔ دکان پر آنے والی عورتوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ چھوٹی کو بہن اور بڑی کو ماں سمان مانتا تھا۔ اس کا نام لیتے ہی لوگوں کا دل احترام سے بھر جاتا تھا۔ اس میں فقط ایک بات کی کمی تھی، کہ پردیس سے سیٹھ کے لڑکے کا خط آتا تو پھاڑ کر پھینک دیتا۔ واپس کوئی جواب نہیں۔

اس آنند اور کامیابی کے بیچ دیکھتے ہی دیکھتے تین برس گزر گئے، گویا میٹھا سپنا بیتا ہو۔ بھوت بھی اس حویلی میں رس بس گیا، مانو سیٹھ کا سگا بیٹا ہی ہو۔ بہو بھی رنواس کے نشے میں مست تھی۔ رنواس کے انتظار میں اگتے ہی دن ڈھل جاتا۔ رنواس میں گھستے ہی پل بھر میں رات ڈھل جاتی۔

بہو امید سے ہوگئی۔ تیسرا مہینہ اترنے والا تھا۔ پاؤں بھاری ہونے کی خوشخبری سن کر سیٹھ نے سوا من گڑ اپنے ہاتھوں سے بانٹا۔ لوگوں نے سوا من سونا مان کر قبول کیا۔ سیٹھ نے عمر میں پہلی مرتبہ یہ سخاوت برتی تھی۔ آج ہاتھ کھلا ہے تو آگے بھی کچھ نہ کچھ ملے گا۔ بیٹے بہو نے چپکے چپکے کافی دان پُن کیا۔ سکھ کے ان گنت تاروں کے بیچ اب نیا چاند جڑے گا۔ کوکھ کا چاند آکاش کے چاند سے سدا بڑھ کر ہوتا ہے۔

دونوں پتی پتنی کو بیٹی کی بے حد چاہ تھی۔ خوب خوشیاں منائیں گے۔ بیٹا کون سا سورگ لے جاتا ہے۔ رام جانے کس کی شکل پہ جائے! اولاد کے جنم کے بجائے اولاد کے تصور میں زیادہ سکھ ہوتا ہے۔ کوکھ میں اولاد کے ساتھ ساتھ سپنے پلتے ہیں۔

دن گھوڑے کی رفتار سے دوڑنے لگے۔ پانچ مہینے بیتے۔ سات مہینے پورے ہوئے۔ یہ نواں

Scanned with CamScanner

مہینہ اترنے والا ہے۔ بہو دن بھر نواس میں سوئی رہتی۔ اس کی سیوا میں تین داسیاں آٹھوں پہر حاضر رہتیں۔

ایک رات پتی کی گود میں سوئی بہو منھ اٹھا کر بولی، ''کئی دفعہ سوچتی ہوں، اگر اس دن کھیجڑی کے سائے میں آرام کرنے کے لیے نہ ٹھہرتے تو رام جانے میرے یہ چار سال کس طرح کٹتے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کٹتے ہی نہیں۔''

بھوت بولا، ''تمھارے دن تو جیسے تیسے نکل ہی جاتے۔ پر میری کیا دشا ہوتی؟ جھاڑی جھاڑی، پیڑ پیڑ پر بھوت کی جون پوری کرتا۔ اُس دن خیر ہوئی کہ میں تمھیں لگا نہیں۔ مجھے تو آج بھی یقین نہیں ہوتا کہ زندگی کا آنند بھوگ رہا ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔''

چکنے ریشمی بالوں پر انگلیاں پھراتے پھراتے رات پھسل گئی۔

اُدھر بہت دور دساور میں بہو کا پھیرے لینے والا دولھا رات کے آخری پہر میں اٹھ بیٹھا۔ آلکس سے جماہی لے کر گھڑے سے ٹھنڈا پانی پیا۔ چاروں طرف دیکھا۔ ایک سا اندھیرا۔ جھلملاتے ہوئے ایک سے تارے۔ کسی بھی سمت میں روشنی نہیں۔ سوچنے لگا کہ یہ رات اور بھی چھوٹی ہوتی تو کتنا اچھا رہتا! کیا ضرورت ہے اتنی لمبی راتوں کی! سونے سونے میں ہی آدھی زندگی گزر جاتی ہے۔ نیند میں تو بیوپار اور لین دین ہو نہیں سکتا، ورنہ دونی کمائی ہوتی۔ پھر بھی دولت کم اکٹھی نہیں کی۔ باپو بے حد خوش ہوں گے۔

بیچ بیچ میں آس پاس کے بیوپاری ملتے رہتے تھے۔ اسے وہاں پا کر انھیں بہت تعجب ہوتا تھا۔ ایک دفعہ پوچھ ہی لیا کہ وہ گاؤں سے واپس کب آیا۔ یہ سن کر اسے بھی کم تعجب نہیں ہوا تھا۔ جواب دیا کہ اس نے تو ابھی گاؤں کی طرف منھ بھی نہیں کیا۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ لوگوں نے زور دے کر کہا، وستار سے ساری بات بتائی، پھر بھی اسے وشواس نہیں ہوا۔ وہ جب یہاں ہے تو وہاں کیسے ہو سکتا ہے! کمائی سہل نہیں ہوتی، اس لیے حاسد لوگ اسے چکر میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ پر وہ ایسا نا سمجھ نہیں ہے۔ ان کے بھی کان کترنے والا ہے۔ کمائی اور بیوپار میں اور زیادہ من لگانے لگا۔

پر آج بہت سویرے ہی ایک بھروسے مند پڑوسی نے خبر دی کہ بہو کے تو بچہ ہونے والا ہے۔ شاید ہو گیا ہو۔

Scanned with CamScanner

سیٹھ کا لڑکا بیچ ہی میں بولا، ''اگر ایسی بات ہوتی تو گھر والے مجھے ضرور خبر کرتے۔ میں نے پانچ سات چٹھیاں بھیجیں، پر ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔''

پڑوسی نے کہا، ''بھلے آدمی، ذرا سوچو تو سہی کہ گھر والے کیوں خبر کرتے؟ کس کو کرتے؟ ان کا لڑکا تو بیچ راہ سے تیسرے ہی دن واپس آ گیا تھا۔ ایک مہاتما کے دیے ہوئے منتر سے سیٹھ جی کو روزانہ پانچ مہریں دیتا ہے۔ حویلی پر تو رام کی مہر ہے۔ گاجے باجے اور جشن کے ٹھاٹھ ہیں۔ رات اس میں گھی کے دیے جلتے ہیں۔ ہاں، اب معلوم ہوا کہ آپ کی شکل ہو بہو سیٹھ جی کے لڑکے سے ملتی ہے۔ اوپر والے کا کھیل! خود سیٹھ جی دیکھیں تو پہچان نہ سکیں۔ اب بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ شکل تو ضرور ملتی ہے پر آپ دوسرے ہیں۔''

''بھلا میں دوسرا کیسے ہوا؟ اب لگتا ہے کہ کل پرسوں ہی جانا پڑے گا۔''

سو سیٹھ کے لڑکے نے اپنا دھندا سیٹھا منیم کو حساب کتاب سمجھایا اور اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہی جیٹھ کا مہینہ۔ لوؤں کے اندھڑ شور مچا رہے تھے۔ جھاڑیوں پر سرخ ڈھالو دیکھ کر یکایک اُس دن والی بات یاد آ گئی۔ سوچا، بہو کی اگر ایسی پسند ہے تو اپنا کیا جاتا ہے۔ کون سے پیسے لگتے ہیں! پکے ہوئے ڈھالو توڑ کر انگوچھے کے پلو میں باندھ لیے۔

وہ حویلی پہنچا تو آنگن میں عورتوں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ سیٹھ سیٹھانی گھبراتے ہوئے منت پر منت مان رہے تھے۔ بھوت ولایتی اوپر رنواس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اداس اور پریشان۔ بہو نیچے سوری[1] کے اندر کراہ رہی تھی۔ بچہ اٹک گیا تھا۔ دائیاں اپنے ہنر آزما رہی تھیں۔ کہ اتنے میں آنگن کی اس چل پوں کے درمیان سات پھیروں والا بیچ دھول میں اٹا ہوا، بے جھجک، آنگن میں آ کھڑا ہوا۔ کندھے پر ڈھالوؤں کا انگوچھا لٹک رہا تھا۔ ماں باپ کے چرنوں میں سیس نوا کر پرنام کیا۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ ہو بہو بیٹے سے شکل ملتی ہے۔ گرد سے اٹا ہے تو کیا ہوا! دولت کے لالچ میں کوئی بہروپیا تو نہیں آ گیا؟ انتہائی تعجب بھی گونگا ہوتا ہے۔ ماں باپ نے بولنا چاہا تو بھی ان سے بولا نہیں گیا۔ عورتوں کے گلے کا راگ بدل گیا۔ ہائے دیا! ایک ہی صورت کے دو پتی! کون سچا، کون جھوٹا؟ یہ کیسا کرشمہ، یہ کیسا تماشا؟ کوئی اِدھر بھاگی، کوئی اُدھر بھاگی۔

---

[1] سوری: زچہ خانہ۔

سوری کے اندر سے بہو کے کراہنے کی آواز سن کر وہ فوراً ساری بات سمجھ گیا۔ سنی سو خبر سچی تھی! ایسا چھل کس نے کیا؟ کیسے ہو اس کی پہچان؟ لوگ کس کے کہے پر یقین کریں گے؟ اچانک اوپر رفو اس کے دروازے پر کھڑے نوجوان پر اس کی نظر پڑی۔ یہ تو واقعی ہو بہو اس کا ہم شکل ہے۔ جعل ساز کے چھل کا کون مقابلہ کر سکتا ہے! رگوں میں خون جم گیا۔ اوہ، یہ انہونی کیسے ہوئی؟

پریت والے پتی کے کانوں میں تو فقط زچہ کا کراہنا گونج رہا تھا۔ اسے تو کسی دوسری بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ہوا تھم گئی تھی۔ سورج تھم گیا تھا۔ کب یہ کراہنا بند ہو اور کب قدرت کا یہ بندھن کھلے!

باپو کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹا بولا، ''میں تو چار سال سے دور دساور میں تھا، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بہو کے گربھ کیسے رہ گیا۔ تمھیں کچھ تو عقل سے کام لینا تھا۔''

سیٹھ نے دل ہی دل میں سارا حساب لگا لیا۔ بولا، ''تو ہے کون؟ میرا لڑکا تو تیسرے ہی دن واپس آ گیا تھا۔ یہاں عیاری کی تو دال نہیں گلے گی۔''

باپو کے منہ سے یہ بول سن کر بیٹے کو بے حد تعجب ہوا۔ چپ رہنے پر تو ساری بات بگڑ جائے گی۔ ترنت بولا، ''چار سال تک بے شمار کمائی کر کے دساور سے باپ کے گھر آیا۔ اس میں عیاری کی کون سی بات ہے؟ تمھیں نے تو زبردستی بھیجا تھا۔''

سیٹھ نے کہا، ''نہیں چاہیے مجھے ایسی کمائی۔ تو مجھے کمائی کا کیا لالچ دے رہا ہے؟ جس راہ آیا اسی راہ سیدھے سیدھے چلتا بن، ورنہ بُری بیتے گی۔''

باپو کا تو دماغ ہی پھر گیا لگتا ہے۔ اس نے ماں کے منہ کی طرف دیکھ کر پوچھا، ''ماں، کیا تو بھی اپنے کوکھ کے بیٹے کو نہیں پہچانتی؟''

ماں اس سوال کا کیا جواب دیتی! اس کی زبان مانو تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر پتی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ ماں نے کچھ جواب نہ دیا تو بیٹا بھی دبدھا میں پڑ گیا۔ اچانک اسے ڈھالوؤں کی بات یاد آ گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے ترنت انگوچھا کھولا اور لال لال ڈھالوؤں کو باپو کے سامنے کرتے ہوئے کہا، ''بہو سے اُس دن کی ڈھالوؤں کی بات تو پوچھو۔ وہ سارا قصہ بتا دے گی۔ اس دن اس نے خود ہی ڈھالو توڑ کر کھائے تھے۔ آج میں اپنے ہاتھوں سے توڑ کر لایا ہوں۔ ایک دفعہ اس سے پوچھو تو سہی۔ آپ فرمائیں تو میں باہر کھڑے کھڑے ہی پوچھ لوں۔''

Scanned with CamScanner

سیٹھ کو غصہ آ گیا۔ بولا، ''پاگل کہیں کا! یہ وقت ڈھالوؤں کی بات پوچھنے کا ہے؟ بہو موت سے جوجھ رہی ہے اور تجھے ڈھالوؤں کی پڑی ہے۔ بھاڑ میں جائیں تیرے یہ ڈھالو۔ میں تو یہ بے تکی بات سنتے ہی ساری بات سمجھ گیا۔ میری بہو گنواروں کی طرح ہاتھوں سے توڑ کر ڈھالو کھائے گی؟ عزت پیاری ہے تو یہاں سے دفع ہو جا۔ ورنہ اتنے جوتے پڑیں گے کہ کوئی گننے والا بھی نہیں ملے گا۔''

بیٹے نے کہا، ''باپ کے جوتوں کی کوئی پروا نہیں۔ لیکن سچ سچ میں نے بھی اُس دن رتھ میں ٹھیک یہی بات کہی تھی۔''

سوری کے اندر بہو کا کراہنا اسی طرح جاری تھا۔ دائیوں نے کئی دفعہ پوچھا، پھر بھی وہ بچے کو کاٹ کر نکلوانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ بمشکل مرنے سے بچی۔ بہو کی آنکھوں کے آگے کبھی اندھیرا چھا جاتا، کبھی بجلیاں جگمگانے لگتیں۔

حویلی سے بھاگی عورتوں کی زبانی یہ بات ہوا کی طرح گھر گھر میں پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیٹھ کی حویلی کے سامنے میلہ لگ گیا۔ ایسی انہونی بات کا سواد تو زبان کو برسوں میں ملتا ہے۔ ہر ایک کی زبان کے پنکھ لگ گئے۔ ایک ہی شکل کے دو پتی! ایک تو چار سال پہلے سے ہی رنواس میں عیش کر رہا ہے اور ایک آج دساور سے لوٹا ہے۔ بہو زچہ خانے میں درد زہ سے کراہ رہی ہے۔ خوب تماشا ہوا! دیکھنا ہے کہ دھنا سیٹھ اس معاملے کو کیسے نبٹاتے ہیں، کیسے چھپاتے ہیں۔ بھلا ایسی بات پر پردہ کون ڈالنے دے گا! لوگ چبا چبا کر پھر سے جگالی کرنے لگتے۔

اپنی حویلی کے چاروں طرف یہ جمگھٹ دیکھا تو سیٹھ کے ایڑی سے چوٹی تک آگ لگ گئی۔ تھوک اچھالتے ہوئے کہنے لگا، ''میرے گھر کی بات ہے، ہم آپ ہی نبٹ لیں گے۔ بستی والے کیوں ٹانگ اڑاتے ہیں؟ میں کہتا ہوں کہ بعد میں آنے والا آدمی چھلی ہے۔ میں اپنے نوکروں سے دھکے دلوا کر اسے نکلوا دوں گا۔ دن دہاڑے یہ مکاری نہیں چل سکتی۔''

بیٹا چلایا، ''باپو، تم یہ کیا پاگل پن کر رہے ہو؟ سورج کو توا اور توے کو سورج بتا رہے ہو؟ تم جیسے بھی چاہو پوری چھان بین کر لو۔ یہ تو سراسر انیائے ہے۔''

ان دولت مند لوگوں کو نیچا دکھانے کا موقع کب کب ملتا ہے! لوگ بات پر اڑ گئے کہ کھرا انصاف ہونا چاہیے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ قصوروار کو واجب سزا ملے۔ یوں دو پتیوں کا رواج

Scanned with CamScanner

چل نکلا تو کیسے نبھے گی؟ امیروں کا تو کچھ نہیں، پر غریبوں کا جینا حرام ہو جائے گا۔ بستی کی بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ چاہے کتنا ہی دولت کا زور کیوں نہ ہو، کندھا دینے والے کرائے پر نہیں آئیں گے۔

معاملہ کافی الجھ گیا۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑ گئے۔ کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ نہ سیٹھ اور نہ برادری والے۔ لوگوں کی زبان تھی اور بہو کے کان تھے۔ سو اُس تک بھی ساری خبر پہنچ گئی۔ عورت کی اس زندگی میں رام جانے کیسی کیسی باتیں سنی پڑیں گی، کیسی کیسی ہتک سنی پڑے گی اور کیسے کیسے تماشے دیکھنے پڑیں گے! آخر ایک دن تو یہ جھمیلا ہونا ہی تھا۔ چار سال تو سپنے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بھلا سپنوں کے دلاسے سے کب تک من کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ کتنا اس کا سہارا! اور کتنی اس کی گہرائی!

کسی پرانے کھنڈر کی چمگادڑوں کی طرح بھیڑ ادھر اُدھر چکر لگانے لگی۔ یہ معاملہ نپٹائے بغیر تو گلے سے نوالہ بھی نہیں نگلا جا سکتا۔

سوری کا دروازہ کھول کر دائیوں نے خبر دی کہ بہو کے لڑکی ہوئی ہے۔ موت کی خطرناک گھاٹی ٹل گئی۔ زچہ کے مرنے میں تو کوئی کسر نہیں تھی۔ بچ گئی سو قسمت کی بات۔ سوری کے باہر دندناتی عورتوں کو بچی کا رونا سنائی دیا۔ خواب گاہ کے باہر کھڑے پتی کو اب جا کر ہوش آیا، پر ہوش آتے ہی جو بھنک کانوں میں پڑی تو مانو کلیجے میں اچانک سرنگ چھوٹی ہو۔ سدھ بدھ کو گویا لقوہ مار گیا ہو۔ ایک سال پہلے یہ بجلی کیسے گری!

سیٹھ سیٹھانی پاگلوں کی طرح ہکا بکا، گنگ! پوری بستی میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ یہ کیسی ناگہانی مصیبت آ پڑی! اس حرامزادے چنڈال نے نہ جانے کس جنم کا بدلہ لیا ہے۔ بات تو ہاتھ سے چھوٹی جا رہی ہے۔ اب کیسے سمیٹی جائے، کون جانے۔ کون جانے کس نے یہ چال چلی ہے۔ رنو اس تو پچھلے چار سال سے روشن ہے۔ اسے نہ قبولنے پر تو حویلی کی ساری عزت ہی مٹی میں مل جائے گی۔ ڈھالو والا کسی طرح مان جائے تو پردہ پڑا رہے۔ منہ مانگی دولت دینے کو تیار ہیں، پھر اسے کیا چاہیے!

پر نہ ڈھالو والا مانا اور نہ بستی کے لوگ ہی مانے۔ پنچ انصاف ہونا چاہیے۔ ساری برادری کی ناک کٹتی ہے۔ چار سال بعد کوکھ اُگھڑتے ہی ایک اور پتی آ دھمکا کیا معلوم کون اصلی ہے! ایک کو تو

Scanned with CamScanner

جھوٹا ہونا ہی پڑے گا۔ لوگوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا، مانو بڑوں کا بڑا چھتا نیچے آ پڑا ہو۔ ڈھالو والے کی حمایت نہ کرنا تو ہاتھوں بھڑکائی آگ پر پانی ڈالنا ہوگا۔ تب تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے گا۔ اس مزے کو چکھنے کی خاطر ہر شخص ڈھالو والے چچی کی طرف داری کرنے لگا۔

سیٹھ ہاتھ جوڑتے ہوئے رندھی آواز میں بولا، ''میری پگڑی اچھال کر تمھیں کیا ملے گا؟ بھائیوں کی طرح ساتھ رہتے ہیں، وقت بے وقت ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ میرے بیٹے کے گُن تم لوگوں سے چھپے نہیں ہیں۔ اس کے ہاتھوں سے کس کا بھلا نہیں ہوا!! اتنی جلدی احسان فراموش نہ بنو۔ میری عزت اب تمھارے ہاتھوں میں ہے۔ کسی بھی طرح معاملہ سلجھا دو۔ یہ ڈھالو والا آدمی جعلی ہے۔ اسے دھکے مار کر گاؤں سے باہر نکالو۔''

بزرگوں نے کہا، ''سیٹھ جی، دکھتی مکھی نگلی نہیں جا سکتی۔ وقت آنے پر جان دینے کو تیار ہیں۔ پر پانی کی گٹھری کیسے باندھی جا سکتی ہے! یہ آدمی بڑھ بڑھ کر کہہ رہا ہے۔ بہو سے ڈھالوؤں والی بات پوچھو تو سہی۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

ایسی بات کیسے پوچھی جا سکتی ہے؟ کون پوچھے؟ تب کچھ بھلی بوڑھی عورتیں آگے آئیں۔ مصیبت میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ سوری کا دروازہ کھول کر اندر گئیں۔ زچہ کا پیٹ درد سے اینٹھ رہا تھا۔ زچگی کی گھاٹی پار کرنے کے بعد اس بات کی بھنک اس کے کانوں میں پڑی تو وہ زچگی کی ساری تکلیف بھول گئی۔ یہ دوسری تکلیف بہت، بہت بڑی تھی۔ دانت پیستے ہوئے، مشکل سے بولی، ''کوئی مرد یہ بات پوچھتا تو اس کو ہاں یا نہ میں جواب بھی دیتی۔ پر عورتوں کا دل رکھ کر بھی تم یہ بات پوچھنے کی ہمت کیسے جٹا پائیں؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تمھیں پریشان کرنے کا کیا یہی وقت ملا ہے؟ شاباش ہے تمھاری ہمت کو!''

بوڑھی عورتیں منھ بگاڑتی ہوئی باہر آئیں۔ بولیں، ''ایسی بات میں عورتیں سچ نہیں بولتیں۔ ہمیں تو دودھ میں کالک نظر آتی ہے۔ باقی جو تمھاری سمجھ میں آئے سو کرو۔''

ایسے موقعوں پر ہی تو سمجھ کی دھار تیز ہوتی ہے۔ سوت تو خوب ہی الجھا۔ بزرگوں نے پھر سمجھ سے کام لیا۔ کہا، ''یہ انصاف راجہ کے بنا نہیں نپٹ سکتا۔ کسی اور نے اس میں ٹانگ اڑائی تو سوچی بستی کو اُن کے غصے کا شکار ہونا پڑے گا۔ اپنا بھلا برا تو سوچنا ہی پڑتا ہے۔ ایک دفعہ ان دونوں چیتوں کو راجہ کے

Scanned with CamScanner

حوالے کر دیں۔ پھر راجہ جانے اور سیٹھ جانے۔ اپن بیچ میں ناحق کیوں تھوک اچھالیں؟ پھر بستی رام ہے، جو سب کی اچھا ہو سو کرو۔"

آخر کار بستی جو چاہتی تھی وہی ہوا۔ بھلا اپنا رام پر وہ کیوں چھوڑتی۔ دونوں پتیوں کو رسیوں سے باندھ کر لے چلنے کا فیصلہ ہوا۔

رنواس کے باہر کھڑے پتی کو باندھنے لگے تب اسے ہوش آیا کہ آخر بات کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اس نے کچھ بھی آنا کانی نہیں کی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے کلیجہ ہونٹوں تک لا کر بولا: "مجھے ایک دفعہ سوری میں جانے دو۔ ماں بیٹی کی خیریت تو پوچھ لوں۔ نہ جانے کیسی طبیعت ہے۔"

پر لوگ نہیں مانے۔ کہا: "فیصلہ ہونے کے بعد ساری عمر خیریت پوچھنی ہی ہے۔ اتنی جلدی کیا ہے؟"

لوگوں کا بگولا بیروں آگے بڑھا۔ دونوں پتی بندھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سیٹھ بھی جوتیاں پھٹکارتا ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ پگڑی کھل کر گلے میں جھول رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے پتے پتے کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ چلتے چلتے اسی کھیجڑی پر بھوت کی نظر پڑی۔ سارے بدن میں بجلی دوڑ گئی۔ اس کے پاؤں وہیں چپک گئے۔ سر میں اُچھان اٹھنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے یادوں کی تصویریں پھڑ پھڑانے لگی ہی تھیں کہ رسی کا جھٹکا لگنے پر اسے ہوش آیا۔ پیر آپ ہی آپ بڑھنے لگے۔ بایاں دایاں، بایاں دایاں۔ انسان کے دل میں یادوں کا جھنجھٹ نہ رہے تو کتنا اچھا ہو۔ یہ یاد تو مانو خون ہی نچوڑ ڈالے گی۔

ساتھ بندھے کاروبار والے پتی کا من تو چھل سے خالی تھا۔ لیکن آج سانچ کو یہ آنچ کیسی لگی؟ وہ خود بھرم میں پڑ گیا۔ یہ کیا لیلا ہوئی؟ ساتھ ساتھ چلتا یہ شخص ایسے لگ رہا ہے گویا وہ شیشے میں اپنا ہی عکس دیکھ رہا ہو۔ اس سے پوچھنے پر ہی بھرم مٹ سکتا ہے۔ اس کے گلے میں پھنستے پھنستے بمشکل یہ لفظ باہر نکل پائے: "بھائی میرے، انصاف تو رام جانے کیا ہوگا، پر تو یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں ہی سیٹھ جی کا لڑکا ہوں۔ سات پھیرے کھانے والا اصلی پتی ہوں۔ پر تو کون ہے، یہ تو بتا؟ یہ کیسا اندر جال ہے؟ بیٹھے بٹھائے یہ کیسی مصیبت آ پڑی! بتا، مجھے تو بتا کر تو ہے کون؟"

تھا تو وہ مہابلی بھوت۔ انصاف کرنے والے پنچوں کی گردنیں ایک ساتھ مروڑ سکتا تھا۔ کئی

کرتب کرسکتا تھا۔ کسی کے جسم میں گھس کر اس کا ستیاناس کرسکتا تھا۔ پر چار سال تک پریت کی زندگی جی کر اس کا مانس ہی بدل گیا۔ جھوٹ بولنا بھی چاہا تو اس سے بولا نہیں گیا۔ لیکن کھلا سچ بھی کیسے کہے! پر-ستما کی عزت تو رکھنی ہی تھی۔ اس سے بے وفائی کیسے کرے۔ یہ مشتر والی مریادا نبھائی۔ بولا، "میں عورتوں کے بدن کے اندر کا باریک جیو ہوں۔ ان کی پریت کا مالک ہوں۔ بیوپار اور کمائی کی بہ نسبت مجھے موہ پریت کی لالچ زیادہ ہے۔"

سات پھیروں والا پتی بے صبری سے بیچ میں ہی بولا، "فالتو بکواس کیوں کرتا ہے! صاف صاف بتا کہ منڈپ میں تو نے بیاہ کیا تھا کیا؟"

"فقط بیاہ سے کیا ہوتا ہے! بیاہ کی دُہائی عمر بھر نہیں چل سکتی۔ بیوپار چیزوں کا ہوتا ہے، پریت کا نہیں۔ تم تو پریت کا بھی بیوپار کرنے لگے! اس بیوپار میں ایسی ہی برکت ہوا کرتی ہے!"

سیٹھ کے لڑکے کے دل میں گویا گرم سلائیں گھس گئی ہوں۔ ایسی باتیں تو اس نے کبھی سوچیں ہی نہیں۔ سوچنے کا موقع ہی کب ملا تھا! آج موقع ملا بھی تو اس حالت میں!

بھیڑ کا بگولا انصاف کی خاطر راجہ کی طرف جلدی جلدی بڑھ رہا تھا کہ بیچ راہ میں ریوڑ چراتا ہوا ایک گڈریا ملا۔ ہاتھ میں تڑا[1]۔ لال صافے سے باہر نکلے بال۔ گھنی کالی داڑھی۔ ہاتھوں میں چاندی کے کڑے۔ بھرپور لمبا قد۔ ریچھ کی طرح سارے جسم پر بال ہی بال۔ پلکوں اور بھنووں کے بال بھی کافی بڑھے ہوئے تھے۔ کانوں پر بالوں کے گچھے۔ پیلے دانت۔ تڑا سامنے کرتے ہوئے پوچھا، "اتنے سارے لوگ اکٹھے ہو کر کہاں جا رہے ہو؟ شاید مرتیو بھوج[2] کھانے کے لیے یہ کارواں نکلا ہے؟"

دو تین مرتبہ سمجھانے پر اسے ٹھیک سے سمجھ میں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ہونٹوں کے ایک کونے سے ہنسی چھلکاتے ہوئے کہنے لگا، "اس ادنیٰ سے کام کی خاطر بیچارے راجہ کو کیوں تکلیف دیتے ہو! یہ جھمیلا تو میں ہی نپٹا دوں گا۔ تمہیں میری آنکھوں کی قسم اگر ایک قدم بھی آگے رکھا تو۔ ندی کا ٹھنڈا پانی پیو۔ کچھ آرام کرو۔ تمہارے علاقے کی تو غضب ہی قسمت کھلی۔ کوئی مائی کا لال یہ انصاف نہیں نپٹا سکا! جوتے چٹکارتے ہوئے سیدھے راجہ کے پاس چل پڑے!"

لوگوں نے بھی سوچا کہ ابھی تو راج دربار کافی دور ہے۔ اگر اس گنوار کی عقل سے کام نکل جائے

---

[1] تڑا لٹھ۔ [2] مرتیو بھوج: کسی کی موت پر دیا جانے والا کھانا۔

تو کیا حرج ہے۔ ورنہ آگے تو جانا ہی ہے۔ وہ مان گئے۔ تب گذریے نے باری باری سے دونوں کے چہرے دیکھے۔ بالکل ایک سی شکل۔ بال جتنا بھی فرق نہیں۔ چنچل اوپر والے نے بھی کیسا مذاق کیا!

ان دونوں کی رسیاں کھولتے ہوئے وہ کہنے لگا، "بھلے آدمیو، انھیں اس طرح باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بھیڑ سے بچ کر یہ کہاں جاتے؟"

پھر مکھیا کی طرف دیکھ کر پوچھا، "یہ گونگے بہرے تو نہیں ہیں؟"

مکھیا نے جواب دیا، "نہیں، یہ تو بالکل گونگے بہرے نہیں ہیں۔ بے دھڑک بولتے ہیں۔"

گذریا یہ بات سنتے ہی ٹھہاکا مار کر ہنسا۔ ہنستے ہنستے ہی بولا، "پھر یہ بے کار چکر کیوں لگایا؟ ان سے وہیں پوچھ تاچھ کر لیتے۔ دونوں میں سے ایک تو جھوٹا ہے ہی۔"

پنچ دل ہی دل میں ہنسے۔ یہ گذریا تو نرا مورکھ ہے۔ یہ بول جاتے تو پھر رونا کس بات کا تھا۔ بس ہو چکا اس کے ہاتھوں انصاف! ایسی انصاف کرنے لائق عقل ہوتی تو یہ تڑا لیے بھیڑوں کے پیچھے ڈھر ڈھر کرتا کیوں بھٹکتا!

رسی کو سمیٹتے ہوئے گذریا کہنے لگا، "سمجھ گیا، سمجھ گیا۔ بولنا تو جانتے ہیں، پر ساتھ ہی ساتھ جھوٹ بولنا بھی سیکھ گئے ہیں۔ پر کوئی بات نہیں۔ سچ کو باہر نکالنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ گلے میں تڑا ڈال کر آنتوں میں پھنسا ہوا سچ ابھی باہر لا پٹکتا ہوں۔ دیر کس بات کی! کھیجڑی کی ڈالیاں بھی اس تڑے کے سامنے نہیں ٹک سکتیں، پھر بیچارے سچ کی تو اوقات ہی کیا ہے! بولو، کس کے گلے میں تڑا گھسیڑوں؟ جو پہلے منھ کھولے گا وہی سچا ہے۔"

بھوت نے سوچا کہ اگر اکیلے اسی کی بات ہوتی تو کوئی بھی جوکھم اور مصیبت اٹھا لیتا۔ پر اب بھید ظاہر ہونے پر تو گھر کی مالکن کو دکھ اٹھانا پڑے گا۔ ایسا معلوم ہوتا تو کھیجڑی کے کانٹوں میں بندھا رہنا ہی ٹھیک تھا۔ بھوتوں کے چھل بل میں تو وہ استاد تھا، پر انسانوں کے کپٹ کی اسے رتی بھر بھی جانکاری نہیں تھی۔ انسان کی زبان سے نکلی ہر بات کو وہ صحیح مانتا تھا۔ تڑا اس کے گلے کا کیا بگاڑ سکتا ہے! ایسے سات تڑے گھسیڑ رہی یہ میرا بال بانکا نہیں کر سکتے۔ میری پریت جھوٹی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے' وہ تو ترت منھ پھاڑتا ہی نظر آیا۔ سیٹھ کے لڑکے نے تو ہونٹ ہی نہیں کھولے۔ غصہ تو ایسا آیا کہ اس گنوار گذریے کی چٹنی بنا ڈالے، پر کہا کچھ نہیں۔

Scanned with CamScanner

منھ پھاڑنے والے پنچ کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے گڈریا بولا، "واہ رے پٹھے! تجھ جیسے ستیہ وادی ¹ آدمی کو ان سور کھ لوگوں نے اتنا پریشان کیا! پر من کی تسلی بڑی بات ہے۔ تھوڑی بہت بھی شک کی گنجائش کیوں رہے!"

اس کی بھیڑیں کافی دوری پر الگ الگ چر رہی تھیں۔ ان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے گڈریا کہنے لگا، "میں سات تالیاں بجاؤں، تب تک ان تمام بھیڑوں کو جو اس کھیجڑی کے گرد اکٹھا کر دے وہی سچا ہے۔"

گڈریے کے کہتے ہی اس بھوت نے بگولے کا روپ دھار کر پانچویں تالی بجنے سے پہلے تمام بھیڑوں کو اکٹھا کر دیا۔ سیٹھ کا لڑکا منھ لٹکائے کھڑا رہا۔ وہاں سے ہلا تک نہیں۔ جیسی گڈریوں کی جاہل قوم، ویسا ہی جاہل اس کا انصاف! ماننا اور نہ ماننا تو اس کی مرضی پر ہے۔

گڈریا بولا، "شاباش! سچے پنچ کے علاوہ اتنا جوش اور اتنی طاقت بھلا کس کی ہو سکتی ہے! اب ایک آخری پرکھ اور کروں گا۔ تھوڑا سستا لو۔"

تڑا بغل میں دبا کر چھاگل کا منھ کھولا۔ ایک ہی سانس میں غٹ غٹ سارا پانی منھ میں انڈیل کر زور سے ڈکار کھائی۔ پھر پیٹ پر ہاتھ پھراتے ہوئے کہنے لگا، "سات چٹکیوں کے ساتھ ہی جو اس چھاگل کے اندر گھس جائے گا وہی رتو اس کا اصل مالک ہے۔ جو میرے انصاف کو غلط بتائے گا اس کے گلے کی خاطر میرے تڑے کا ایک ہی جھٹکا کافی ہے، یہ خیال رکھنا۔"

لوگوں کے تڑے کے منھ پر بندھے بھیسے کی طرف دیکھا دھار لگا ہوا۔ ایک دم تیکھا۔ ایک جھٹکا لگنے پر دوسرے کی ضرورت ہی نہیں۔ کھوپڑی سیدھی دھول چاٹتی نظر آئے گی۔

لوگوں کو بھیسے کی طرف دیکھنے میں تو وقت لگا، پر بھوت کو چھاگل کے اندر گھسنے میں کچھ بھی وقت نہ لگا۔ یہ کرتب تو وہ جنم سے ہی جانتا تھا۔ بیچارے گڈریے نے تو آج عزت رکھ لی۔ بھوت کے اندر گھستے ہی گڈریے نے پھر ایک پل کی بھی ڈھیل نہیں کی۔ ترنت چھاگل کا منھ دوہرا کر، رسی سے کس کر باندھ دیا۔ پھر پنچوں کے منھ کی طرف دیکھتے ہوئے فخر سے بولا، "انصاف کرنے میں بس اتنی دیر لگی۔ چھاگل تو میری بھی جائے گی، پر انصاف کرنا منظور کیا تو کچھ سوچ بچار کر ہی کیا تھا۔ چلو، اب سب چل کر

---

¹ ستیہ وادی: حق پرست۔

اس چھاگل کو ندی کے حوالے کر دیں۔ اُمڑتی، اُچھلتے کھاتی ندی اسے آپ ہی رلو اس کی تہہ پر پہنچا دے گی۔ بولو، ہوا کہ نہیں کھرا انصاف؟“

سب نے ایک ساتھ سر ہلا کر تائید کی۔ سیٹھ کا لڑکا تو خوشی کے مارے بورا سا گیا۔ بیاہ سے بھی ہزار گنا آنند اس کے دل میں ہلکورے لینے لگا۔ مارے خوشی کے کانپتے ہاتھوں سے نگ جڑی انگوٹھی کھول کر گڈریے کے سامنے کی۔ گڈریا بغیر کہے ہی اس کے دل کی بات سمجھ گیا، پر انگوٹھی قبول نہیں کی۔ کالی داڑھی کے بیچ پیلے دانتوں کی ہنسی ہنستے ہوئے بولا، ”میں کوئی راجہ نہیں ہوں جو انصاف کی قیمت وصول کروں۔ میں نے تو اتنا کام نکال دیا۔ اور یہ انگوٹھی میرے کس کام کی! نہ انگلیوں میں آتی ہے نہ ٹڑے میں۔ میری بھیڑیں بھی میری طرح گنوار ہیں۔ گھاس تو کھاتی ہیں، پر سونا سونگھتی تک نہیں۔ بیکار کی چیزیں تم امیروں کو ہی شوبھا دیتی ہیں۔“

اب کہیں جا کر بھوت کو گڈریے کے اُجڈ انصاف کا پتا چلا۔ پر اب ہو بھی کیا سکتا تھا! بات قابو سے باہر نکل گئی تھی۔ پھر بھی وہ چھاگل کے اندر سے چلایا، ”باپو، مجھ پر دیا کر! ایک دفعہ باہر نکال دے۔ زندگی بھر تیرا غلام رہوں گا۔“

بھلا اب بھوت کی بات کون سنتا! جوش سے بھرے سب لوگ ندی کے کنارے پہنچے۔ چھاگل کو تیزی سے بہتے پانی میں پھینک دیا پریت کے مالک کو آخر بل کھاتی بھنور بناتی، لہراتی، اُچھلتے کھاتی کل کل کرتی ندی کی تہہ ملی۔ اس کا جیون سپھل ہوا۔ اس کی موت سوارت ہوئی۔

پھر بستی کے لوگ، سیٹھ اور سیٹھ کا لڑکا واپس دگنی رفتار سے گاؤں کی طرف لوٹے۔

حویلی کے دروازے میں گھستے ہی سیٹھ کا لڑکا سیدھا سوری کی طرف لپکا۔ ایک دائی بیٹی کو گھی کی مالش کر رہی تھی۔ دوسری چندن کی کنگھی سے زچہ کے بال سلجھا رہی تھی۔ گڈریے کے کھرے انصاف کی ساری داستان اس نے ایک ہی سانس میں سنا ڈالی۔ ایک ایک لفظ کے ساتھ زچہ کو ایسا لگتا گویا آگ میں تپا لال سرخ بھالا اس کے دل میں گھونپا جا رہا ہو۔ زچہ کے درد سے بھی یہ پیڑا ہزار گنا زیادہ تھی۔ پر اس نے نہ تو اُف کی اور نہ کوئی آہ اس کے منہ سے نکلی۔ پتھر کی مورت کی طرح گم سم تنی رہی۔

دل کی ساری بھڑاس نکالنے کے بعد وہ کہنے لگا، ”پر تم اس قدر پریشانی میں کیوں پڑ گئیں؟ جنم دینے والے ماں باپ بھی جب نہیں پہچان سکے تو بھلا تم کیسے پہچانتیں؟ اس میں تمھاری کچھ بھی غلطی

Scanned with CamScanner

نہیں ہے۔ پر نالائق بھوت پر تو اس کے لچھن کے مطابق خوب بجی۔ چھاگل میں گھسنے کے بعد بہت گڑگڑایا، بہت رویا، پر پھر تو رام کا نام لو۔ ہم ایسے نادان کہاں! آخرندی میں پھینکنے پر اس سے پنڈ چھوٹا اور اس کا چلانا بند ہوا۔ حرامزدہ پھر کبھی چھل کرے گا!"

تب آخر کار گھر والوں نے جیسا کہا، زچہ نے ویسا ہی کیا۔ کبھی کسی بات کا الٹ کر جواب نہیں دیا۔ کسی بھی کام میں آنا کانی نہیں کی۔ اس کی خاطر ساس نے جتنے بھی لڈو وغیرہ بنائے، اس نے چپ چاپ کھا لیے۔ جب ساس نے کہا تب سر دھویا۔ سورج پوجا۔ برہمن نے ہون کیا۔ عورتوں نے گیت گائے۔ گڑ کی منگلک لاپسی بنی۔ تالاب پر جا کر جل دیوتا کی پوجا کی۔ پیلی چندری اوڑھی۔ بچی کو پالنے میں جھلایا۔ جل بھرے گھڑے پوجے۔ ٹم ٹم سے آنگن اَریہا۔ مہندی لگائی۔ جیسا کہا ویسا سنگھار کیا۔ زیور پہنے۔ ایسی سلچھنی بہو تو سو بھاگیہ سے ہی ملتی ہے۔

جل پوجن کی رات کو بہو پیلی چندری اوڑھ کر، جھانجھر کی جھنکار کرتی ہوئی رنواس کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ گود میں بچی۔ آنچل میں دودھ۔ آنکھیں سونی۔ دل سونا۔ سر میں مانوان گنت جھینگر گونجار کر رہے ہوں۔ پتی انتظار میں پھولوں کی سیج پر بیٹھا تھا۔ اس ایک ہی رنواس میں رام جانے، سے کتنے جیون بھوگنے پڑیں گے۔ پر آنچل سے دودھ پیتی یہ بچی بڑی ہو کر عورت کا ایسا جیون نہ بھوگے تو ماں کی ساری تکلیفیں سوارت ہو جائیں۔ اس طرح تو جانور بھی آسانی سے اپنی مرضی کے خلاف استعمال نہیں کیے جاتے۔ ایک دفعہ تو سر ہلاتے ہی ہیں۔ پر عورتوں کی اپنی مرضی ہوتی ہی کہاں ہے۔ شمشان نہ پہنچے تب تک رنواس۔ اور رنواس چھوٹنے پر سیدھے شمشان!

❋ ❋

چیک ادیب میلان کنڈیرا (Milan Kundera) کی تحریروں کا ایک انتخاب "آج" کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا جس میں کنڈیرا کے ناولوں کے ابواب، مضامین، انٹرویو اور ایک کہانی کا ترجمہ شامل تھا۔ یہ کہانی The Huchhiking Game جس کا ترجمہ "سوانگ" کے عنوان سے کیا گیا، کنڈیرا کی کہانیوں کے مجموعے *Laughable Loves* سے لی گئی تھی۔ آئندہ صفحوں میں آپ اسی مجموعے میں شامل ایک اور کہانی Nobody will Laugh کا ترجمہ ملاحظہ کریں گے۔

۱۹۲۹ء میں چیکوسلوواکیہ (اب چیک ریپبلک) کے مقام برنو میں پیدا ہونے والے کنڈیرا نے ۱۹۷۵ء میں ترکِ وطن کر کے فرانس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس سے پہلے ان کے کئی ناول شائع ہو چکے تھے۔ فرانس منتقل ہونے کے بعد کنڈیرا نے چیک زبان میں کئی اور ناول تحریر کیے، اور اس کے بعد فرانسیسی زبان کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنا لیا۔ ان کا تازہ ترین ناول *Ignorance* فرانسیسی میں لکھا ہوا ان کا دوسرا ناول ہے اور ۱۹۸۹ء کے بعد آنے والی تبدیلیوں اور جلاوطن کی واپسی (اور واپسی کے ناممکن ہونے) جیسے موضوعات کی پرتیں اسی اسلوب میں کھولتا ہے جو کنڈیرا کی ناول نگاری سے مخصوص ہے۔

زیرِ نظر کہانی کا موضوع کنڈیرا کے پہلے ناول *The Joke* سے ملتا جلتا محسوس ہوگا۔ دراصل کسی ایسی (نظریاتی) ریاست میں جہاں اقتدار کے مختلف درجوں پر موجود لوگ خود کو اور زندگی کو بے حد سنجیدگی سے برتتے ہیں، جس مزاح کی کارفرمائی مفقود ہو جاتی ہے اور ہنسی اور مذاق پر مبنی کوئی انفرادی عمل بھی انتہا درجے کی سنگینی اختیار کر لیتا ہے۔ مزاح، جیسا کہ کنڈیرا کی تحریروں میں بار بار سامنے آیا ہے، ریاست کے اسی کٹرپن کے خلاف مزاحمت کا ایک ہتھیار ہے جسے لوگ دم گھٹنے سے بچنے کے لیے کثرت کام میں لاتے ہیں۔ یہ بات ہمارے خطّے میں بھی ایسی نامانوس نہیں اور آپ اس کہانی کو اس بنا پر بھی پُرلطف پائیں گے۔

Scanned with CamScanner

میلان کنڈیرا

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کوئی نہیں ہنسے گا

1

''مجھے تھوڑی اور وائن دینا،'' کلارا نے کہا، اور میں بھی اس خیال سے غیر متفق نہ تھا۔ ہم دونوں کے لیے سلیوووِتس وائن کی نئی بوتل کھولنا یوں بھی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، اور اِس بار تو اس کا معقول جواز بھی موجود تھا۔ اس روز مجھے اپنے ایک تحقیقی مقالے کے آخری حصے کی اشاعت پر معاوضے کی خاصی بڑی رقم موصول ہوئی تھی جسے بصری فنون کا ایک پیشہ ورانہ رسالہ قسط وار شائع کر رہا تھا۔

اس مقالے کو شائع کرانا آسان کام ثابت نہیں ہوا تھا — میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ خاصا مناظراتی اور متنازعہ تھا۔ میرے پچھلے مقالے اسی باعث ''جریدۂ بصری فنون'' نے، جس کے مدیران عمر رسیدہ اور محتاط لوگ تھے، رد کر کے لوٹا دیے تھے، اور پھر وہ اس کے مد مقابل ایک کم اہم رسالے میں ہی شائع ہو سکے تھے، جس کے مدیر نسبتاً جوان لوگ تھے اور زیادہ قدامت پرست نہ تھے۔

ڈاکیے نے یونیورسٹی میں رقم کے لفافے کے ساتھ ایک اور خط بھی پہنچایا تھا؛ ایک غیر اہم خط؛ صبح کے اس مبارک لمحے میں میں نے اس پر سرسری سی نظر ہی ڈالی ہوگی۔ مگر اب گھر پر، جب آدھی رات ہونے کو تھی اور وائن قریب قریب ختم ہو چکی تھی، میں نے اسے، ہم دونوں کی تفریحِ طبع کی خاطر، میز سے اٹھایا۔

''معزز کامریڈ، اور اگر آپ کی طرف سے اجازت ہو تو، میرے رفیق — میرے رفیق!'' میں

Scanned with CamScanner

نے بلند آواز میں کلارا کو پڑھ کر سنایا۔ "یہ خط لکھنے پر مجھے، ایک شخص کو جس سے آپ کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی، معاف کیجیے گا۔ میں یہ خط آپ سے یہ درخواست کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ منسلکہ مضمون کو پڑھ لیجیے۔ یہ سچ ہے کہ میں آپ سے واقفیت نہیں رکھتا، لیکن ایک ایسے شخص کے طور پر آپ کا احترام کرتا ہوں جس کی آرا، مشاہدات اور اخذ کردہ نتائج حیران کن حد تک میری اپنی تحقیق کے نتائج سے مطابقت رکھتے ہیں؛ میں اس امر پر مکمل طور پر متعجب ہوں۔ چنانچہ، مثال کے طور پر، اگرچہ میں آپ کے اخذ کردہ نتائج اور آپ کے نہایت اعلیٰ تقابلی تجزیے کے سامنے ادب سے سر جھکاتا ہوں، لیکن اس خیال کی جانب پُرزور انداز میں توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چیک آرٹ ہر دور میں عوام سے قریب رہا ہے۔ میں نے یہ رائے آپ کا مقالہ پڑھنے سے پیشتر ظاہر کی تھی۔ میں اسے نہایت آسانی سے ثابت کر سکتا ہوں، کیونکہ، دیگر چیزوں کے علاوہ، میرے پاس گواہ بھی موجود ہیں۔ تاہم، یہ ایک غیر اہم بات ہے، کیونکہ آپ کا مقالہ..." اس کے بعد میرے علم و فضل کی مزید ستائش کی گئی تھی، اور پھر ایک درخواست: کیا میں اس کے لکھے ہوئے مضمون پر تبصرہ لکھ سکتا ہوں، یعنی اس مضمون کے معیار کے بارے میں "جریدۂ بصری فنون" کے مدیروں کے نام ایک نوٹ، کیونکہ وہ لوگ چھ مہینے سے اس مضمون کو رد کرتے آرہے ہیں۔ انھوں نے اسے بتایا تھا کہ میری رائے اس بارے میں فیصلہ کن ہوگی، چنانچہ میں اس مضمون کے مصنف کی آخری امید بن گیا تھا، مکمل تاریکی میں روشنی کی واحد کرن۔

ہم دونوں نے مسٹر زیتورتسکی کا خوب مذاق اڑایا، جس کے اشرافیہ جیسے نام نے ہمیں مسحور کر لیا تھا۔ لیکن یہ سب محض مذاق تھا، مذاق جس سے کسی کو نقصان پہنچانا مقصود نہ تھا، کیونکہ اس نے مجھ پر مدح وستائش کے جو ڈونگرے برسائے تھے انھوں نے نہایت عمدہ وائن کے ساتھ مل کر میری طبیعت میں ایک گداز پیدا کر دیا تھا۔ مجھ میں اس قدر گداز پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے تمام دنیا سے الفت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن تمام دنیا سے زیادہ، خاص طور پر کلارا سے، کیونکہ وہ اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی، جبکہ باقی پوری دنیا میری نظروں سے اوجھل، ورشووِتس محلے میں واقع میرے تنگ فلیٹ کی دیواروں کے دوسری طرف تھی۔ اور چونکہ اس وقت میرے پاس دنیا کو نوازنے کے لیے کچھ نہ تھا، اس لیے میں نے کلارا کو نوازا، کم از کم وعدوں سے۔

کلارا ایک اچھے خاندان کی بیس سالہ لڑکی تھی۔ وہ، میں کیا کہہ گیا؟ اچھے خاندان کی؟ اعلیٰ ترین

Scanned with CamScanner

خاندان کی! اس کا باپ بینک منیجر رہ چکا تھا، اور سن پچاس کی دہائی میں اسے بالائی بورژوا طبقے کا نمائندہ قرار دے کر پراگ سے خاصی دور چیلاکووتس کے گاؤں میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی بیٹی کا پارٹی ریکارڈ خراب تھا اور وہ پراگ کے ایک بڑے ملبوسات کے کارخانے میں درزن کے طور پر کام کرتی تھی۔ تعصب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ میں نہیں مانتا کہ باپ کے صاحبِ جائیداد ہونے سے اس کی اولاد کے جبر پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، آج کون نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور کون امرا کے طبقے سے؟ سب کچھ اس قدر گڈمڈ ہو چکا ہے اور چیزیں ایک دوسرے سے اپنی جگہیں اس حد تک مکمل طور بدل چکی ہیں کہ بعض اوقات تو سماجیاتی اصطلاحات میں کسی بھی چیز کو سمجھنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس وقت اپنے سامنے ایک طبقاتی دشمن کو بیٹھا دیکھ کر اسے ذرا بھی طبقاتی دشمن محسوس نہیں کر رہا تھا؛ اس کے برعکس میں تو اپنے سامنے ایک حسین درزن کو بیٹھا دیکھ رہا تھا اور اس کے دل میں اپنے لیے زیادہ پسندیدگی پیدا کرنے کی کوشش میں خوش دلی کے ساتھ اسے اُس ملازمت کے فوائد سے آگاہ کر رہا تھا جو اپنے تعلقات استعمال کر کے دلوانے کا میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس جیسی حسین لڑکی کے لیے سلائی مشین کے سامنے بیٹھے رہ کر اپنا حسن گنوا دینا انتہائی مہمل بات ہوگی، اور میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ماڈل بننا چاہیے۔

کلارا نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی اور ہم نے وہ رات نہایت مسرور افہام و تفہیم میں گزاری۔

۲

آدمی زمانۂ حال سے اس طرح گزرتا ہے کہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ جس تجربے سے وہ دراصل گزر رہا ہوتا ہے اس کے بارے میں اسے صرف اندازہ لگانے اور قیاس آرائی کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ بعد میں، جب اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی جاتی ہے، تب کہیں وہ مڑ کر ماضی پر نظر ڈالتا ہے اور تب اسے پتا چلتا ہے کہ وہ کس تجربے سے گزر رہا تھا اور اس کا مفہوم کیا تھا۔

اُس رات میں سمجھ رہا تھا کہ اپنی کامیابی کا جام نوش کر رہا ہوں، اور مجھے گمان تک نہ تھا کہ یہ دراصل میری بربادی کا آغاز ہے۔

اور چونکہ مجھے گمان تک نہ تھا، اس لیے اگلی صبح میں بہت اچھے موڈ میں بیدار ہوا، اور اگرچہ کلارا

ابھی میرے پہلو میں لیٹی گہرے سانس لے رہی تھی، میں نے اُس خط کے ساتھ منسلک مضمون نکالا اور خوش طبع بے نیازی سے اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے لگا۔

اس کا عنوان تھا: ''میکولش آلیش- چیک ڈرائنگ کا ماہرِ فن استاد''، اور یہ سچ مچ اس آدھے گھنٹے کی توجہ کا بھی مستحق نہ تھا جو میں نے اس پر صرف کی۔ یہ محض پیش پا افتادہ باتوں کا ایک بے ہنگم ڈھیر تھا جس میں کسی تسلسل کا پتا نہ تھا اور اس کے ذریعے کسی اوریجنل خیال کو پیش کرنے کی نیت کا نام ونشان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

یہ بات واضح تھی کہ یہ مضمون خالص لغویت پر مبنی تھا۔ اسی دن ''جریدۂ بصری فنون'' کے مدیر ڈاکٹر کلوسک نے (جو ویسے ایک غیر معمولی طور پر کینہ جو شخص تھا) فون پر میری رائے کی مزید تصدیق کر دی۔ اس نے مجھے یونیورسٹی میں فون کیا: ''تمھیں میاں زیتور تسکی کا مقالہ مل گیا؟... تو ٹھیک ہے، اسے نمٹا دو۔ پانچ لیکچرر پہلے ہی اس کی خاصی حجامت کر چکے ہیں، پھر بھی وہ جھاڑ کے کانٹے کی طرح پیچھے پڑا ہوا ہے؛ اس کے دماغ میں کہیں سے یہ بات گھس گئی ہے کہ تمھاری رائے ہی اس بارے میں مستند ہوگی. اسے دو جملوں میں بتا دو کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ بکواس ہے، تم جانتے ہو یہ کس طرح کیا جاتا ہے، تمھیں زہرآلود باتیں کرنا خوب آتا ہے۔ بس، اس کے بعد ہم سب سکون سے رہ سکیں گے۔''

لیکن میرے اندر کسی چیز نے احتجاج کیا. بھلا میں مسٹر زیتور تسکی کے جلاد کے فرائض کیوں انجام دوں؟ کیا اس کام کے لیے ایڈیٹر کی تنخواہ مجھے ملتی ہے؟ اس کے علاوہ، مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ''جریدۂ بصری فنون'' نے میرا مقالہ ضرورت سے زیادہ احتیاط پسندی کے باعث رد کر دیا تھا: مزید یہ کہ مسٹر زیتور تسکی کا نام میرے ذہن میں کلارا، سلیوو وِتس کی بوتل اور اس حسین شام سے مضبوطی سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اور آخری بات یہ، میں اس سے انکار نہیں کروں گا، یہ ایک انسانی کمزوری ہے — میں ایسے لوگوں کو جو مجھے میری رائے کو استناد کا درجہ دیتے تھے، اپنے ہاتھ کی ایک انگلی پر گن سکتا تھا. میں بھلا اپنے اس واحد مداح کو کیونکر ہاتھ سے جانے دوں؟

میں نے گفتگو کو چالاکی کے ساتھ مبہم انداز میں ختم کیا، جو کلوسک کے خیال میں وعدہ اور میرے خیال میں معذرت تھی۔ میں نے ریسیور اس مصمم ارادے کے ساتھ رکھا کہ مسٹر زیتور تسکی کے مضمون پر تبصرہ کبھی تحریر نہیں کروں گا۔

Scanned with CamScanner

اس کے بجائے میں نے دراز میں سے لکھنے کا کاغذ نکالا اور مسٹر زیتورتسکی کے نام ایک خط لکھا، جس میں اس کے کام کے بارے میں کوئی رائے دینے سے احتراز کیا، اور یہ کہہ کر معذرت کی کہ انیسویں صدی کے آرٹ کی بات میری آرا کو عموماً گمراہ اور سنکی پن پرمبنی خیال کیا جاتا ہے، چنانچہ میری مداخلت — خصوصاً "جریدۂ بصری فنون" کے مدیروں کے سلسلے میں — اس کے لیے کارآمد سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے مسٹر زیتورتسکی کو دوستانہ بسیار گوئی سے لاد دیا، لیکن اس میں میری طرف سے اس کے کام کی کسی طرح کی ستائش تلاش کرنا ناممکن تھا۔

خط کو لیٹر باکس میں ڈالتے ہی میں مسٹر زیتورتسکی کو بھول گیا۔ لیکن مسٹر زیتورتسکی مجھے بالکل نہیں بھولا۔

۳

ایک دن جب میں اپنا لیکچر ختم کرنے کو تھا — میں کالج میں آرٹ کی تاریخ کا مضمون پڑھاتا ہوں — کہ دروازے پر دستک ہوئی، یہ ہمارے شعبے کی سیکرٹری، میری تھی، ایک مہربان پختہ عمر کی خاتون، جو کبھی کبھی میرے لیے کافی بنا دیتی ہے، اور جب فون پر ناپسندیدہ نسوانی آوازیں سنائی دیں تو کہہ دیتی ہے کہ میں باہر گیا ہوا ہوں۔ اس نے دروازے میں سر ڈال کر بتایا کہ کوئی صاحب مجھے تلاش کر رہے ہیں۔

میں صاحبوں سے قطعی خوفزدہ نہیں ہوتا، چنانچہ میں نے طالب علموں سے معذرت کی اور خوش طبعی کے ساتھ باہر راہداری میں نکل آیا۔ بھدا سا کالا سوٹ اور سفید قمیص پہنے ایک پستہ قد آدمی نے جھک کر مجھے سلام کیا۔ اس نے نہایت احترام کے ساتھ مجھے اطلاع دی کہ وہ زیتورتسکی ہے۔

میں اپنے مہمان کو ایک خالی کمرے میں لے گیا، اسے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی، اور خوشگوار انداز میں اس سے ہر ممکن موضوع پر باتیں کرنے لگا، مثلاً یہ اس سال گرمی کتنی پڑ رہی ہے اور پراگ میں کون کون سی نمائشیں چل رہی ہیں۔ مسٹر زیتورتسکی شائستہ انداز میں میری باتوں سے اتفاق ظاہر کرتا رہا، لیکن جلد ہی میرے کہے ہوئے ہر فقرے کو اپنے مضمون پر منطبق کرنے لگا جو ہم دونوں کے درمیان غیر مرئی طور پر ایک ناقابل مزاحمت مقناطیس کی طرح پڑا تھا۔

Scanned with CamScanner

''آپ کے مضمون پر تبصرہ لکھنے سے زیادہ مجھے کسی اور بات سے خوشی نہیں ہو سکتی،'' آخرکار میں نے کہا، ''لیکن جیسا کہ میں خط میں وضاحت کر چکا ہوں، انیسویں صدی کے چیک آرٹ پر میری رائے مستند نہیں سمجھی جاتی، اور اس کے علاوہ جریدے کے مدیر حضرات سے میرے تعلقات خراب ہیں، جو مجھے ایک سخت گیر جدیدیت پسند خیال کرتے ہیں، چنانچہ میرے لکھے ہوئے مثبت تبصرے سے آپ کو صرف نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔''

''اوہ! آپ کس قدر منکسر مزاج ہیں،'' مسٹر زیتورتسکی نے کہا، ''آپ جیسا ماہرِ فن خود اپنے مقام کے متعلق اس قدر غلط فہمی میں کیونکر مبتلا ہو سکتا ہے! جریدے کے ادارتی دفتر والوں نے مجھے خود بتایا ہے کہ سب کچھ آپ کے تبصرے پر منحصر ہے۔ اگر آپ میرے مضمون پر اچھی رائے دے دیں تو وہ اسے شائع کر دیں گے۔ آپ میری واحد امید ہیں۔ یہ مضمون میرے تین سال کے مطالعے اور تین سال کی محنت کا حاصل ہے۔ سب کچھ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

آدمی اپنے بہانے کتنی بے احتیاطی اور غیر ہنرمندی سے بناتا ہے! میری سمجھ میں نہ آیا کہ مسٹر زیتورتسکی کو کیا جواب دوں۔ میں نے یونہی اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں مجھے نہ صرف چھوٹے شیشوں والی قدیم اور معصوم عینک دکھائی دی بلکہ اس کی پیشانی پر پڑا ہوا ایک طاقتور، گہرا عمودی بل بھی نظر آیا۔ مستقبل بینی کے ایک مختصر سے لمحے میں میری ریڑھ کی ہڈی میں کپکپی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ بل، انتہائی مرکوز اور ہٹ دھرم، نہ صرف اس عقلی کرب کی غمازی کرتا تھا جس سے اس کا مالک میکولاش آلیش کی ڈرائنگوں کے سلسلے میں گزرا تھا، بلکہ ایک مضبوط قوتِ ارادی کی بھی۔ میں اپنی حاضر دماغی کھو بیٹھا اور کوئی ہوشیاری کا بہانہ تلاش نہ کر سکا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ میں تبصرہ لکھنے والا نہیں، لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ مجھ میں یہ بات اس قابلِ رحم پست قد آدمی کے منہ پر کہنے کی ہمت نہیں۔

تب میں مسکرانے لگا اور میں نے کسی مبہم چیز کا وعدہ کر لیا۔ مسٹر زیتورتسکی نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ جلد ہی دوبارہ آئے گا۔ ہم مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

چند دن بعد وہ واقعی آ گیا۔ اس روز تو میں نے ہوشیاری سے اس سے ملاقات کو ٹال دیا لیکن اس کے اگلے روز مجھے بتایا گیا کہ وہ مجھے یونیورسٹی میں ایک بار پھر ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ برا وقت میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں جلدی سے میری کے پاس گیا تاکہ مناسب قدم اٹھائے جا سکیں۔

Scanned with CamScanner

''میری ڈیئر، میری تم سے التجا ہے، اگر یہ آدمی دوبارہ میری تلاش میں آئے تو اس سے کہہ دینا کہ میں کسی تحقیق کے سلسلے میں جرمنی گیا ہوا ہوں اور ایک مہینے میں لوٹوں گا۔ اور ایک بات اور جان لو: میری کلاسیں، جیسا کہ تمھیں معلوم ہے، منگل اور بدھ کو ہوتی ہیں۔ میں انھیں خفیہ طور پر بدل کر جمعرات اور جمعے کو کر لیتا ہوں۔ صرف طلبا کو اس کے بارے میں معلوم ہوگا، اور کسی کو مت بتانا، اور ٹائم ٹیبل کو بھی جوں کا توں رہنے دینا۔ مجھے قاعدوں کی خلاف ورزی کرنی ہی ہوگی۔''

۴

بے شک مسٹر زیتور تسکی جلد ہی ایک بار پھر میری تلاش میں آیا اور جب سیکرٹری نے اسے اطلاع دی کہ میں اچانک جرمنی چلا گیا ہوں تو اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ ''لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ مسٹر کلیما کو میرے بارے میں تبصرہ لکھنا ہے۔ وہ اس طرح کیسے جا سکتے ہیں؟'' ''میں نہیں جانتی،'' میری نے کہا۔ ''لیکن وہ مہینے بھر میں لوٹ آئیں گے۔'' ''ایک مہینہ اور... '' مسٹر زیتور تسکی کراہا: ''اور آپ کو جرمنی میں ان کا پتا معلوم نہیں؟'' ''نہیں،'' میری بولی۔

چنانچہ میرا ایک مہینہ سکون سے گزرا، لیکن وہ مہینہ میری توقع سے جلد گزر گیا اور مسٹر زیتور تسکی ایک بار پھر دفتر کے باہر آ کھڑا ہوا۔ ''نہیں، وہ اب تک واپس نہیں آئے،'' میری نے کہا، اور بعد میں جب وہ کسی سلسلے میں مجھ سے ملی تو استدعا کے لہجے میں پوچھنے لگی: ''تمھارا وہ چھوٹا ملاقاتی پھر آیا تھا، اب میں آخر اس سے کیا کہوں؟'' ''میری، اس سے کہہ دو کہ مجھے یرقان ہو گیا ہے اور میں جینا کے ایک ہسپتال میں داخل ہوں۔'' ''ہسپتال میں!'' جب میری نے چند روز بعد مسٹر زیتور تسکی کو اطلاع دی تو وہ چلایا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انھیں میرے بارے میں تبصرہ لکھنا ہے!'' ''مسٹر زیتور تسکی!'' سیکرٹری نے ملامت آمیز لہجے میں کہا، ''مسٹر کلیما کہیں غیر ملک میں سخت بیمار پڑے ہوئے ہیں اور آپ کو سوائے اپنے تبصرے کے کسی چیز کا خیال نہیں!'' مسٹر زیتور تسکی یہ سن کر دبک گیا اور رخصت ہوا، لیکن دو ہفتے بعد پھر دفتر میں موجود تھا۔ ''میں نے مسٹر کلیما کے نام ایک رجسٹرڈ خط جینا بھیجا تھا۔ وہ چھوٹی سی جگہ ہے، وہاں ایک ہی ہسپتال ہوگا، لیکن خط میرے پاس واپس آ گیا!'' ''تمھارا چھوٹا ملاقاتی مجھے پاگل کیے دے رہا ہے،'' اگلے روز میری نے مجھ سے کہا۔ ''مجھ پر بگڑنا مت، میں اس

Scanned with CamScanner

سے اور کیا کہتی؟ میں نے کہہ دیا کہ تم واپس آ گئے ہو۔ اب تم اس سے خود ہی نمٹنا۔"

میں میری پر بگڑا نہیں۔ وہ جو کچھ کر سکتی تھی وہی اس نے کیا۔ علاوہ ازیں، میں خود کو کسی بھی طرح ہارا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پکڑا نہیں جاؤں گا۔ میں تمام وقت روپوشی کی حالت میں رہتا۔ جمعرات اور جمعے کو خفیہ طور پر لیکچر دیتا، اور ہر منگل اور بدھ کو اسکول کے سامنے والے ایک مکان کے دروازے سے مسٹر زیتور تسکی کا نظارہ کر کے خوش ہوتا، جو اسکول کے باہر میرے نکلنے کا منتظر کھڑا رہا کرتا۔ مجھے باؤلر ہیٹ پہننے اور داڑھی لگانے کی خواہش محسوس ہوتی۔ میں خود کو شرلاک ہومز یا ان دیکھا آدمی محسوس کرتا جو نظر آئے بغیر چل پھر رہا ہو۔ میں خود کو چھوٹا سا لارڈ کا محسوس کرتا۔

لیکن ایک دن مسٹر زیتور تسکی اس پہرے داری سے تھک گیا اور میری پر ٹوٹ پڑا۔ "آخر مسٹر کلیما کہاں لیکچر دیتے ہیں؟" "ٹائم ٹیبل وہاں لگا ہوا ہے،" میری نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں ایک بڑے سے تختے پر سارے لیکچروں کی تفصیل مثالی انداز میں درج تھی۔

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں،" مسٹر زیتور تسکی نے ٹس سے مس ہوئے بغیر کہا۔ "لیکن مسٹر کلیما یہاں نہ منگل کو لیکچر دیتے ہیں نہ بدھ کو۔ کیا وہ بیمار ہیں؟"

"نہیں،" میری ہچکچاتے ہوئے بولی۔ اور تب وہ شخص میری پر برس پڑا۔ اس نے ٹائم ٹیبل کے کنفیوژن پر اسے ملامت کی۔ اس نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا کہ وہ کس طرح اس بات سے بے خبر ہو سکتی ہے کہ کس وقت کون سا استاد کہاں ہوگا۔ وہ میری پر چلایا۔ اس نے کہا کہ وہ کامریڈ اسسٹنٹ کلیما کی شکایت کرے گا جو لیکچر نہیں دے رہے ہیں، جو انھیں دینے چاہئیں۔ اس نے پوچھا کہ آیا ڈین اپنے دفتر میں ہے۔

بدقسمتی سے ڈین اپنے دفتر میں موجود تھا۔ مسٹر زیتور تسکی دروازہ کھٹکھٹا کر اندر چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ میری کے دفتر میں واپس آیا اور میرے فلیٹ کا پتا دریافت کیا۔

"نمبر ۲۰، اسکالنک اسٹریٹ، لیتومیشل،" میری نے کہا۔ "پراگ میں مسٹر کلیما کا عارضی پتا ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے..." "میں آپ سے کامریڈ کلیما کے پراگ کے فلیٹ کا پتا پوچھ رہا ہوں،" پستہ قد آدمی لرزتی ہوئی آواز میں چیخا۔

نہ جانے کس طرح میری اپنی حاضر دماغی کھو بیٹھی۔ اس نے اسے میرے فلیٹ، میری چھوٹی سی

Scanned with CamScanner

پناہ گاہ، میرے پیارے سے بھٹ کا پتا دے دیا، جہاں مجھے پکڑا جاتا تھا۔

۵

ہاں، میرا مستقل پتا میتو میشل کا ہے: میری ماں، میرے دوست، اور میرے باپ کی یادیں وہیں مقیم ہیں: جب بھی موقع ملتا ہے، میں پراگ سے بھاگ نکلتا ہوں اور گھر، اپنی ماں کے چھوٹے سے فلیٹ، میں بیٹھ کر لکھا کرتا ہوں۔ تو اس طرح ہوا کہ میں نے اپنی ماں کے فلیٹ کو اپنا مستقل پتا لکھوا دیا ور پراگ میں کوئی مناسب بیچلر فلیٹ حاصل نہ کر سکا، جیسا کہ قاعدے سے میرے لیے کرنا ضروری تھا، بلکہ ورشووتس کے علاقے میں واقع ایک مکمل طور پر پرائیویٹ اقامت خانے میں ایک کمرے پر مشتمل فلیٹ میں رہنے لگا، جس کے وجود کو میں اپنے امکان بھر چھپا کر رکھتا تھا۔ میں نے اپنے پتے کو کہیں رجسٹر نہیں کرایا تھا تاکہ میرے ناپسندیدہ مہمانوں کی میری متعدد عارضی نسوانی ہم نشینوں سے (جن کی آمد و رفت، میں اقرار کرتا ہوں، نہایت بے قاعدہ تھی) غیر ضروری ملاقاتیں نہ ہوں۔ اور ٹھیک اسی وجہ سے اس اقامت خانے میں میری شہرت زیادہ اچھی نہ تھی۔ مزید یہ کہ جب کبھی میں میتو میشل گیا ہوا ہوتا تو کئی بار اپنا چھوٹا سا کمرہ دوستوں کو مستعار دے دیا کرتا، جو وہاں بے حد پُرلطف وقت گزارتے، اور اقامت خانے میں رہنے والے کسی شخص کو ایک پل بھی سونے نہ دیتے۔ ان تمام باتوں نے وہاں کے کئی مکینوں کو سخت چراغ پا کر دیا تھا اور انھوں نے میرے خلاف ایک خاموش جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ بعض موقعوں پر انھوں نے مقامی کمیٹی کو میرے خلاف منفی رائے ظاہر کرنے پر اکسایا تھا اور یہاں تک کہ اقامت خانے کے دفتر میں میرے خلاف شکایت بھی داخل کر رکھی تھی۔

ان دنوں کلارا کو چیلاکووتس کے دور دست محلے سے اپنے کام پر جانے میں دقت ہوتی تھی، چنانچہ وہ رات کو میرے ہی پاس ٹھہرنے لگی تھی۔ پہلے پہل وہ متذبذب انداز میں کبھی کبھار وہاں رات گزارتی، پھر اس نے اپنا ایک جوڑا وہاں لا رکھا، پھر کئی جوڑے، اور بہت جلد میرے دو سوٹ الماری کے ایک کونے میں سمٹ گئے اور میرا چھوٹا سا کمرہ ایک زنانہ خواب گاہ میں بدل گیا۔

میں کلارا کو سچ مچ پسند کرتا تھا؛ وہ خوبصورت تھی: مجھے خوشی محسوس ہوتی جب ہم اکٹھے باہر نکلتے اور لوگ ہمیں مڑ مڑ کر دیکھا کرتے؛ وہ مجھ سے کم از کم تیرہ سال چھوٹی تھی، جس سے طالب علموں میں

Scanned with CamScanner

میری عزت بڑھ گئی تھی، میرے پاس اس کا اچھی طرح خیال رکھنے کی ہزار وجوہ تھیں۔ لیکن میں یہ بات ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ اقامت خانے میں ہمارے بارے میں چہ میگوئیاں اور افواہیں پھیل جائیں گی؛ مجھے ڈر تھا کہ کوئی میرے نیک دل مالک مکان پر جلد بول دے گا، جو سال کا بیشتر حصہ پراگ سے باہر گزارتا، اپنے کام سے کام رکھتا اور میرے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتا تھا؛ مجھے ڈر تھا کہ ایک روز وہ ناخوشی کے عالم میں اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ میرے پاس آئے گا اور مجھ سے، اپنی نیک نامی کی خاطر، اس نوجوان خاتون کو وہاں سے رخصت کر دینے کو کہے گا۔

کلارا کو خفیہ ہدایت تھی کہ کسی کے لیے دروازہ نہ کھولے۔

ایک روز وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ وہ ایک دھوپ بھرا دن تھا اور کمرے میں حبس سا تھا۔ وہ میرے دیوان پر، قریب قریب ننگی لیٹی، چھت کا جائزہ لینے میں محو تھی جب اچانک دروازے پر زور کی دستک سنائی دی۔

اس میں کوئی چونکنے والی بات نہ تھی۔ میرے پاس گھنٹی نہ تھی، اس لیے جو بھی آتا اسے دروازہ کھٹکھٹانا ہی پڑتا۔ چنانچہ کلارا نے اس شور و غل سے متاثر نہ ہونے کا فیصلہ کیا اور چھت کا معائنہ کرتی رہی۔ لیکن دروازہ پیٹنے کا عمل ختم نہ ہوا؛ بلکہ اس کے برعکس نہایت مستقل مزاجی سے جاری رہا۔ اب کلارا کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ ایک ایسے شخص کو دروازے کے باہر ایستادہ تصور کرنے لگی جو آہستگی سے اور معنی خیز انداز میں اپنی جیکٹ کا کالر اونچا کر رہا ہے، اور جو کچھ دیر بعد اس پر جھپٹ کر سوال کرے گا کہ اس نے دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگائی، وہ کیا چیز چھپا رہی ہے، اور آیا وہ رجسٹرڈ ہے۔ ایک حساس جرم نے اسے آ لیا۔ اس نے اپنی نظریں چھت سے ہٹائیں اور سوچنا شروع کیا کہ اپنے کپڑے کہاں اتارے تھے۔ لیکن دروازہ اتنی تن دہی سے متواتر پیٹا جا رہا تھا کہ اپنے اضطراب میں اسے کھونٹی پر لٹکی میری برساتی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آ سکا۔ اس نے خود کو برساتی میں لپیٹ لیا اور دروازہ کھول دیا۔

اسے کسی سوالیہ چہرے والے خطرناک شخص کے بجائے ایک پستہ قد آدمی دکھائی دیا جو تعظیماً جھک کر بولا، ''کیا مسٹر کلیما گھر پر ہیں؟'' ''نہیں ہیں۔'' ''اوہ، یہ تو برا ہوا!'' چھوٹے آدمی نے کہا اور اسے پریشان کرنے پر اس سے معذرت کی۔ ''بات یہ ہے کہ مسٹر کلیما کو میرے بارے میں ایک تبصرہ

لکھنا ہے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اور اس کام کو جلد کرنا ضروری ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کم از کم ان کے نام ایک پیغام چھوڑ سکتا ہوں۔"

کلارا نے اسے کاغذ پنسل دے دی، اور اُس شام میں نے پڑھا کہ میکولاش الیش کے بارے میں لکھے گئے مضمون کی تقدیر صرف میرے ہاتھوں میں ہے اور یہ کہ مسٹر زیتور تسکی نہایت احترام کے ساتھ میرے تبصرے کا منتظر ہے اور وہ مجھ سے یونیورسٹی میں ملنے کی دوبارہ کوشش کرے گا۔

٦

اگلے دن میری نے مجھے بتایا کہ کس طرح مسٹر زیتور تسکی نے اسے دھمکایا تھا، پھر جا کر اس شکایت کی تھی؛ اس کی آواز کپکپا رہی تھی اور وہ رو پڑنے کو تھی۔ میں طیش میں آ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ بچاری سیکرٹری، جواب تک میرے آنکھ مچولی کے کھیل پر ہنستی رہی تھی (اگرچہ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کیا وہ لطف اندوزی کی خاطر نہیں بلکہ میری مروت میں کیا تھا)، اب تکلیف محسوس کر رہی تھی اور قابلِ فہم طور پر اپنی تکلیف کا منبع مجھے سمجھ رہی تھی۔ جب میں نے ان تمام چیزوں میں اپنے پتے کے انکشاف، دس منٹ تک فلیٹ کا دروازہ پیٹے جانے اور کلارا کے خوفزدہ ہونے کو بھی شامل کر کے دیکھا تو میرا غصہ جلال کی حد تک جا پہنچا۔

جس وقت میں میری کے دفتر میں، بے چینی سے ہونٹ کاٹتا، اپنا خون کھولاتا، انتقام کے متعلق سوچتا، اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا، ٹھیک اس وقت دروازہ کھلا اور مسٹر زیتور تسکی نمودار ہوا۔

مجھے دیکھ کر خوشی کی جھلملاہٹ سی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس نے جھک کر مجھے سلام کیا۔ وہ ذرا جلدی آ گیا تھا، یعنی اس سے پہلے کہ میں اپنے انتقام کے منصوبے پر اچھی طرح غور کر سکتا۔

اس نے پوچھا کہ آیا مجھے پچھلے روز اس کا چھوڑا ہوا پیغام مل گیا تھا۔

میں خاموش رہا۔ اس نے اپنا سوال دُہرایا۔ "مل گیا تھا،" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا آپ مہربانی کر کے تبصرہ لکھ دیں گے؟"

میں نے اسے اپنے سامنے کھڑے دیکھا: نڈھال، ضدی، ملتجی۔ میں نے اس کے ماتھے کے عمودی بل کو دیکھا — دھات پر کندہ کی ہوئی لکیر، یک سوجنون کی علامت — میں نے اس عمودی لکیر کو

غور سے دیکھا اور جان گیا کہ یہ دو نقطوں کو ملانے والی ایک سیدھی لکیر ہے، اور وہ دو نقطے ہیں اس کا مضمون اور میرا تبصرہ۔ اس جنونی سیدھی لکیر کی گرفت کے باہر اس کی زندگی میں سوائے ولیوں کی سی رہبانیت کے کچھ نہ تھا؛ اور ٹھیک اس وقت ایک معاندانہ ترکیب میرے ذہن میں آئی۔

''اتنا تو آپ سمجھتے ہوں گے کہ کل کے واقعے کے بعد میں آپ سے بات نہیں کر سکتا،'' میں نے کہا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔''

''بننے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب آپ کا اس سے انکار کرنا غیر ضروری ہوگا۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا،'' چھوٹے آدمی نے اپنی بات پھر دہرائی، لیکن اس بار زیادہ فیصلہ کن لہجے میں۔

میں نے خوش طبعی کا، تقریباً دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ''دیکھیے مسٹر ژیتور تسکی، میں آپ کو قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ میں بھی عورتوں کے تعاقب میں رہتا ہوں اور آپ کی کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو خود کو ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ تنہا پا کر، خاص طور پر جب اس نے ایک مردانہ برساتی کے نیچے کچھ نہ پہن رکھا ہو، اسے راہ پر لانے کی کوشش کرتا۔''

''یہ بڑی زیادتی ہے!'' پستہ قد آدمی پیلا پڑ گیا۔

''نہیں، یہ سچ ہے، مسٹر ژیتور تسکی۔''

''کیا خاتون نے آپ کو یہ بات بتائی ہے؟''

''اس کے اور درمیان کوئی راز نہیں۔''

''کامریڈ اسسٹنٹ، یہ بہت بڑی زیادتی ہے! میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری ایک بیوی ہے! میرے بچے ہیں!'' پستہ قد آدمی نے ایک قدم آگے بڑھایا، اور مجھے ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔

''یہ تو آپ کے لیے اور بھی بُرا ہے، مسٹر ژیتور تسکی۔''

''اور بھی بُرا ہے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

''میرا خیال ہے شادی شدہ ہونا عورتوں کا تعاقب کرنے کے معاملے میں ایک خامی ہے۔''

Scanned with CamScanner

"اپنی بات کو واپس لیجیے!" مسٹرز یتورتسکی نے دھمکانے کے انداز میں کہا۔

"اچھا، ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا، "شادی شدہ ہونا اس معاملے میں ہمیشہ رکاوٹ نہیں بنتا۔ اس کے برعکس کبھی کبھی یہ ہر چیز کا پردہ بھی بن بھی جاتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں آپ سے بالکل ناراض نہیں اور آپ کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ صرف ایک بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ آپ ایک ایسے شخص سے اب بھی تبصرہ لکھوانا چاہتے ہیں جس کی عورت کو آپ نے پٹانے کی کوشش کی، یہ کیونکر؟"

"کامریڈ اسسٹنٹ! اکیڈمی آف سائنسز کے 'جریدہ بصری فنون' کے مدیر ڈاکٹر کلوسک میرے مضمون پر آپ کا تبصرہ چاہتے ہیں۔ اور آپ کو یہ تبصرہ لکھنا ہو گا۔"

"تبصرہ یا عورت۔ آپ دونوں کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔"

"یہ کس طرح کا طرزِ عمل ہے، کامریڈ؟" مسٹرز یتورتسکی نے سخت طیش کے عالم میں چلا کر کہا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مسٹرز یتورتسکی نے سچ مچ کلارا کو پٹانے کی کوشش کی ہو۔ غصے سے سلگتے ہوئے میں نے چیخ کر کہا، "تمھاری یہ جرأت کہ مجھ پر چلاؤ؟! تمھیں تو میری سیکرٹری کے سامنے مجھ سے معافی مانگنی چاہیے۔"

میں نے مسٹرز یتورتسکی کی طرف پیٹھ موڑ لی اور وہ ہکا بکا سا لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گیا۔

"افوہ!" میں نے یک ایسے جنرل کے انداز میں آہ بھری جس نے سخت مقابلے کے بعد کوئی لڑائی جیت لی ہو، اور میری سے کہا، "شاید اب وہ مجھ سے تبصرہ لکھوانے کا خیال چھوڑ دے گا۔"

میری مسکرائی، پھر لمحہ بھر بعد ہچکچاتے ہوئے بولی، "آپ آخر تبصرہ کیوں نہیں لکھنا چاہتے؟"

"کیونکہ، میری ڈیئر، اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ پرلے درجے کی بکواس ہے۔"

"تو آپ اپنے تبصرے میں یہی کیوں نہیں لکھ دیتے کہ یہ بکواس ہے؟"

"میں کیوں لکھوں؟ میں لوگوں کی عداوت کیوں مول لیتا پھروں..." لیکن اتنا کہتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مسٹرز یتورتسکی اس کے باوجود میرا دشمن ہو چکا ہے، اور تبصرہ نہ لکھنے کی میری کوشش ایک بے مقصد اور لغو جدوجہد تھی — بدقسمتی سے میں نہ اب اسے روک سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

میری ایک مہربان مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی، جیسے عورتیں بچوں کی حماقت کو دیکھ

Scanned with CamScanner

کرتی ہیں' تب دروازہ کھلا اور مسٹر زیتورتسکی ایک بازو اوپر اٹھائے وہاں کھڑا دکھائی دیا۔ "مجھے نہیں، معافی آپ کو مانگنی ہوگی!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں چلایا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

۷

مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ کب، اُسی دن یا اس کے چند دن بعد، اقامت خانے کے پوسٹ باکس میں ہمیں ایک لفافہ ملا جس پر کوئی پتا نہیں لکھا ہوا تھا۔

اندر ٹیڑھی میڑھی، تقریباً قدیم انداز کی لکھائی میں ایک خط تھا۔

محترم خاتون،

میرے شوہر کی ہتک کے سلسلے میں براہ کرم اتوار کو میرے گھر آیئے۔

میں پورا دن گھر پر ہوں گی۔ اگر آپ نہ آئیں تو مجھے مجبوراً اقدامات کرنے ہوں گے۔

آنا زیتورتسکی، ۱۴ دالمیلو وا اسٹریٹ، پراگ ۳۔

کلارا خوفزدہ ہو گئی اور میرے قصور کے بارے میں کچھ کہنے لگی۔ میں نے ہاتھ لہرا کر اعلان کیا کہ زندگی کا کام تفریح بہم پہنچانا ہے، اور اگر زندگی اس سلسلے میں کاہلی کا مظاہرہ کرتی ہے تو ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کام میں اس کی تھوڑی بہت مدد کریں۔ آدمی کو مسلسل واقعات کے تیز رفتار گھوڑوں پر سواری کرنی چاہیے، کیونکہ ان کے بغیر وہ ریت میں قدم گھسیٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ مسٹر یا مسز زیتورتسکی سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوگی، اور جس واقعے کے رہوار کی پیٹھ پر میں چھلانگ لگا کر جم گیا ہوں اسے اپنا ایک ہاتھ پیچھے باندھ کر بھی قابو میں لا سکتا ہوں۔

صبح جس وقت ہم اقامت خانے سے باہر نکل رہے تھے، چوکیدار نے ہمیں روکا۔ یہ چوکیدار ہمارا دشمن نہیں تھا۔ میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اسے ایک بار پچاس کراؤن کا نوٹ رشوت میں دیا تھا اور اب تک اس خوشگوار اطمینان میں زندگی بسر کر رہا تھا کہ اس نے میرے بارے کچھ نہ جاننا سیکھ لیا ہے، اور اس آگ میں تیل چھڑکنے سے احتراز کرتا ہے جو میرے دشمنوں نے وہاں جلا رکھی تھی۔

"کل ایک میاں بیوی آپ کو تلاش کر رہے تھے،" اس نے بتایا۔

''کس قسم کے لوگ تھے؟''

''ایک چھوٹے قد کا آدمی تھا اور اس کی عورت ساتھ تھی۔''

''عورت کس حلیے کی تھی؟''

''اس سے دوسرا اونچی۔ انتہائی پھرتیلی۔ تناور عورت۔ ہر قسم کی باتیں پوچھ رہی تھی۔'' وہ کلارا کی طرف مڑا۔ ''زیادہ تر آپ کے بارے میں۔ کہ آپ کون ہیں اور نام کیا ہے۔''

''اوہ خدایا! تو تم نے اسے کیا بتایا؟'' کلارا چلائی۔

''میں کیا بتاتا؟ مجھے کیا خبر مسٹر کلیما سے ملنے والے کون کون ہیں؟ میں نے اس سے کہہ دیا کہ ہر رات کوئی اور آتا ہے۔''

''شاباش!'' میں نے قہقہہ لگایا اور جیب سے دس کراؤن کا نوٹ نکالا۔ ''بس اسی طرح کے جواب دیتے رہنا۔''

''درست،'' بعد میں میں نے کلارا سے کہا۔ ''نہ تم اتوار کو کہیں جاؤ گی اور نہ کوئی تمھیں پا سکے گا۔''

اتوار آیا اور گزر گیا، اتوار کے بعد پیر اور منگل اور بدھ، کچھ بھی نہیں ہوا۔ ''دیکھا،'' میں نے کلارا سے کہا۔ لیکن پھر جمعرات کا دن آیا۔ میں اپنے خفیہ لیکچر میں اپنے طالب علموں کو بتا رہا تھا کہ کس طرح اور کیسے بے غرضانہ رفاقت کے ماحول میں فاؤوسٹوں (Fauvists) نے رنگوں کو ان کے سابق امپریشنسٹ کردار کی قیود سے رہائی دلائی، کہ اسی وقت میری نے دروازہ کھولا اور سرگوشی میں مجھ سے کہا، ''اس مسٹر زیتورتسکی کی بیوی آئی ہے۔'' ''لیکن میں تو یہاں نہیں ہوں،'' میں نے کہا، ''اسے نام تختیل دکھا دو۔'' ''دکھایا تھا، لیکن اس نے آپ کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اسے آپ کی برساتی اسٹینڈ پر لٹکی دکھائی دے گئی۔ اسی وقت اسسٹنٹ پروفیسر زیلینی وہاں آ گئے اور انھوں نے اسے بتا دیا کہ یہ آپ کی ہی برساتی ہے۔ اب وہ راہداری میں آپ کے انتظار میں بیٹھی ہے۔''

اگر قسمت زیادہ منظم انداز سے میرا تعاقب کر سکتی تو ممکن ہے میں ایک کامیاب شخص ہوتا۔ بند گلی ایک ایسی شے ہے جہاں میرے تخیل کو مہمیز ملتی ہے اور بہترین ترکیبیں سوجھتی ہیں۔ میں نے اپنے ایک پسندیدہ طالب علم سے کہا:

Scanned with CamScanner

"مہربانی کرکے میرا ایک کام کر دو۔ میرے دفتر میں جاؤ، اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی میری برساتی پہنو اور اسکول سے باہر نکل جاؤ۔ راہداری میں بیٹھی ایک عورت تمھیں روک کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گی کہ تم کلیما ہو۔ تمھارا کام یہ ہے کہ اس کا کسی قیمت پر اقرار نہ کرنا۔"

طالب علم گیا اور کوئی چوتھائی گھنٹے میں لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ مشن کامیابی سے پورا ہوا، مطلع اب صاف ہے اور عورت اسکول کی عمارت سے جا چکی ہے۔

چنانچہ اس بار میں جیت گیا۔ لیکن پھر ہفتے کا دن آیا، اور سہ پہر کے وقت کلارا پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کام سے واپس آئی۔

جو صاحب کارخانے کے صاف ستھرے دفتر میں خوش مزاج آدمی گاہکوں سے ملاقات کیا کرتا تھا، اس نے کارگاہ کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولا جہاں کلارا اور پندرہ دوسری درزنیں سلائی مشینوں پر جھکی ہوئی کام میں مصروف تھیں، اور اونچی آواز میں کہا:

"کیا تم میں سے کوئی نمبر ۵ پشلن اسٹریٹ پر رہتی ہے؟"

کلارا جانتی تھی کہ اس کا اشارہ کیا جا رہا ہے، کیونکہ ۵ پشلن اسٹریٹ میرے خفیہ اقامت خانے کا پتا تھا۔ لیکن احتیاط نے اسے بولنے سے باز رکھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا میرے ساتھ رہنا ایک راز ہے اور اس سے کوئی واقف نہیں۔

"دیکھا، میں ان خاتون سے کیا کہہ رہا تھا؟" جب کسی لڑکی نے جواب میں کچھ نہ کہا تو شائستہ شخص بولا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ کلارا کو بعد میں معلوم ہوا کہ ٹیلیفون پر ایک زنانہ آواز نے اسے پہلے کارخانے کے ملازمین کی فہرست کی چھان بین کرنے پر مجبور کیا اور پھر چوتھائی گھنٹے تک اس بات پر اصرار کرتی رہی کہ اس کارخانے میں کام کرنے والی لڑکیوں میں سے ایک نمبر ۵ پشلن اسٹریٹ پر رہتی ہے۔

مسز زیٹورسکی کا سایہ ہمارے معصوم پرسکون کمرے پر پھیل گیا۔

"لیکن اسے یہ کہاں سے پتا چلا کہ تم وہاں کام کرتی ہو؟ یہاں تو کوئی تمھیں جانتا نہیں!" میں نے زور سے کہا۔

ہاں، مجھے یقین تھا کہ ہمیں کوئی نہیں جانتا۔ میں کسی ایسے مخفی شخص کی طرح رہتا تھا جس کا خیال

Scanned with CamScanner

ہو کہ وہ اونچی دیوار کے پیچھے ہے اور اسے کوئی نہیں دیکھ رہا، لیکن تمام وقت ایک تفصیل اس کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے: یہ اونچی دیوار شفاف کانچ کی بنی ہوئی ہے۔

میں نے چوکیدار کو رشوت دے کر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے یہاں میرے ساتھ رہنے کی بات کسی پر ظاہر نہ کرے۔ میں نے کلارا کو خود کو چھپائے رکھنے کے نہایت تکلیف دہ اور جھنجھلا دینے والے طریقے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جبکہ اس مکان میں رہنے والے تمام لوگ اس کے بارے میں جانتے تھے۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ ایک بار وہ دوسری منزل پر رہنے والی ایک عورت سے بے احتیاطی سے بات کر بیٹھی تھی، اور سب لوگ جان گئے تھے کہ وہ کہاں کام کرتی ہے۔ ہمیں شبہ تک نہ ہوا تھا کہ اتنے دنوں سے ہم سب کی نظروں کے عین سامنے وہاں رہ رہے تھے۔ ہمارے دشمنوں سے اگر کوئی چیز چھپی ہوئی تھی تو بس کلارا کا نام، اور یہ چھوٹی سی تفصیل کہ وہ وہاں میرے ساتھ اپنا نام رجسٹر کرائے بغیر رہ رہی تھی۔ یہی دو آخری راز تھے جن کی اوٹ میں چھپ کر ہم، فی لحال، مسز زبتور تسکی کو جُل دینے میں کامیاب ہو گئے تھے جس نے اپنا حملہ اس قدر مصمم اور منظم انداز میں کیا تھا کہ میں دہشت زدہ رہ گیا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ معاملہ بہت دشوار ہو گا۔ میری کہانی کے گھوڑے کی زین اچھی طرح کسی جا چکی تھی۔

۸

یہ جمعے کا ذکر ہے۔ اور سنیچر کو جب کلارا کام پر سے واپس آئی تو اس پر پھر کپکپی طاری تھی۔

مسز زبتور تسکی اپنے شوہر کو ساتھ لے کر کارخانے پہنچی تھی۔ اس نے اپنی آمد کی پہلے سے اطلاع کر دی تھی اور منیجر سے اجازت حاصل کر لی کہ وہ دونوں کارگاہ کے اندر جا کر درزنوں کے چہروں کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس درخواست نے کامریڈ منیجر کو حیرت میں ڈال دیا تھا، لیکن مسز زبتور تسکی کا انداز ایسا تھا کہ اس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ اس نے مبہم سے انداز میں کسی توہین کا، اور زندگی کے تباہ ہو جانے کا، اور عدالتی چارہ جوئی کا ذکر کیا۔ برابر میں مسٹر زبتور تسکی تیوری چڑھائے خاموش کھڑا رہا۔

انھیں دروازہ کھول کر کارگاہ میں لایا گیا۔ درزنوں نے بے پروائی سے سر اٹھا کر دیکھا، اور کلارا

نے اس پست قد آدمی کو پہچان لیا۔ اس کی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ خود کو چھپانے کی عیاں کوشش میں جلدی سے سلائی کے کام میں لگ گئی۔

"یہ لیجیے،" منیجر نے خفیف طنز آمیز شائستگی کے ساتھ اس اکڑے ہوئے جوڑے سے کہا۔ مسز زیتورتسکی نے بھانپ لیا کہ اسی کو آگے بڑھنا ہوگا، اور اپنے شوہر سے بولی "اب دیکھو!" مسٹر زیتورتسکی نے تیوری چڑھا کر چاروں طرف دیکھا۔ "ان میں سے کوئی ہے؟" مسز زیتورتسکی نے سرگوشی میں پوچھا۔

چشمہ لگا کر بھی مسٹر زیتورتسکی اس بڑے سے کمرے کو ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا، جس کا جائزہ لینا یوں بھی آسان نہ تھا کیونکہ اس میں ہر طرف کپڑے کی کترنوں کے ڈھیر پڑے تھے اور اٹھی سلاخوں سے سلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے، اور بے وقت پہلو بدلتی ہوئی ورکر میں اپنے چہرے دروازے کی طرف کیے قطار میں نہیں بلکہ بے ترتیبی سے ادھر ادھر رخ کیے بیٹھی تھیں وہ آگے پیچھے، اوپر نیچے ہر طرف متواتر حرکت کر رہی تھیں۔ چنانچہ مسٹر زیتورتسکی کو ایک ایک قدم بڑھاتے ہوئے گردن موڑ موڑ کر ایک ایک چہرے کو دیکھنا پڑ رہا تھا کہ کوئی رہ نہ جائے۔

جب عورتوں کو اندازہ ہوا کہ انھیں دیکھا جا رہا ہے، اور دیکھنے والا بھی اس قدر بھدا اور غیر دلکش آدمی ہے، تو انھیں ہلکی سی ہتک محسوس ہوئی، اور ان کے طنزیہ فقرے وہ بڑبڑا نہیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں سے ایک، جو تنومند نوعمر لڑکی تھی، گستاخی سے بول اٹھی

"یہ پورے پراگ میں اس چوہے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے جس نے اسے حاملہ کر دیا!"

عورتوں کی پُرشور اور مضحکہ خیز فقرے بازی نے میاں بیوی کو گھیر لیا؛ وہ پہلے تو دل شکستہ سے کھڑے رہے، پھر ایک عجیب قسم کے وقار سے تن گئے۔

"میڈم!" گستاخ لڑکی مسز زیتورتسکی سے مخاطب ہو کر ایک بار پھر بولی، "آپ اپنے بیٹے کا اچھی طرح خیال نہیں رکھتیں! میں تو ایسے پیارے سے ننھے کو کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھنے دوں۔"

"اور ٹھیک سے دیکھو!" اس نے اپنے شوہر سے سرگوشی کی، اور وہ افسردہ اور جھینپے ہوئے انداز میں ایک ایک قدم یوں آگے بڑھتا رہا جیسے اسے دونوں طرف سے مار پڑ رہی ہو، لیکن اس کے باوجود اس کے انداز میں ایک مضبوطی تھی اور اس نے ایک بھی چہرے کو دیکھے بغیر نہ چھوڑا۔

Scanned with CamScanner

اس تمام عرصے میں منیجر مبہم سے انداز میں مسکراتا رہا؛ وہ اپنی ملازم عورتوں کو جانتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان منہ پھٹ درزنوں کا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے ان کے شور وغل کو نہ سننے کا ناٹک کرتے ہوئے مسٹر زیتورتسکی سے سوال کیا، "آپ مہربانی کر کے مجھے یہ بتائیے کہ آپ جس عورت کی تلاش میں ہیں وہ کس حلیے کی ہے؟"

مسٹر زیتورتسکی منیجر کی طرف مڑا اور آہستہ آہستہ، نہایت سنجیدہ لہجے میں بولا، "وہ خوبصورت تھی... بہت خوبصورت تھی..."

اس دوران کلارا ایک کونے میں بیٹھی تھی، اور اس کی برہمی، جھکا ہوا سر اور کام میں اس کی جبلی محویت اسے منہ پھٹ لڑکیوں سے الگ ظاہر کر رہی تھی۔ اُف! اس نے خود کو چھپانے اور غیر اہم ظاہر کرنے کا کتنا غلط طریقہ اختیار کیا تھا! اور اب مسٹر زیتورتسکی اس سے ذرا ہی دور تھا؛ منٹ بھر بعد اس کی نظر اس کے چہرے پر پڑنے والی تھی۔

"یہ تو کافی نہیں ہے، اگر آپ کو صرف اتنا ہی یاد ہے کہ وہ خوبصورت تھی،" شائستہ کامریڈ منیجر نے مسٹر زیتورتسکی سے کہا۔ "خوبصورت عورتیں تو بہت سی ہیں۔ وہ لمبی تھی یا چھوٹی؟"

"لمبی،" مسٹر زیتورتسکی نے کہا۔

"اس کے بال کالے تھے یا سنہری؟" مسٹر زیتورتسکی نے لمحہ بھر سوچا اور پھر کہا، "سنہری۔"

کہانی کا یہ حصہ حسن کی قوت کے بارے میں ایک حکایت کے طور پر کام آ سکتا ہے۔ جب مسٹر زیتورتسکی نے کلارا کو پہلی بار میرے گھر پر دیکھا تھا تو اس قدر چکاچوند ہو گیا تھا کہ اس نے دراصل اسے دیکھا ہی نہ تھا۔ حسن نے اس کی نظروں کے سامنے ایک پردہ تان دیا تھا جس کے پار دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ روشنی کا پردہ، جس کے پیچھے وہ یوں چھپی ہوئی تھی جیسے کسی نقاب میں۔

حقیقت یہ ہے کہ کلارا نہ لمبی ہے اور نہ سنہری بالوں والی۔ صرف حسن کی داخلی عظمت نے اسے مسٹر زیتورتسکی کی نگاہوں میں لمبا قد عطا کر دیا تھا۔ اور وہ دمک جو حسن سے پھوٹتی ہے، اس کی بدولت اس کے بال سنہری ہو گئے تھے۔

اس طرح جب پستہ قد آدمی آخر کار اس کونے پر پہنچا جہاں کلارا ایک بھورے رنگ کا سوتی باده

۱؎ ثنداق: کپڑے کا تھیلا جس میں نوزائیدہ بچے کو گردن تک بند کر دیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

پہنے، ایک قمیص کی سلائی میں مشغول بیٹھی تھی، تو وہ اسے پہچان نہ سکا، کیونکہ دراصل اس نے کلارا کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

۹

جب کلارا اس واقعے کا بے ربط اور مشکل سے سمجھ میں آنے والا بیان مکمل کر چکی تو میں نے کہا، "دیکھا، ہماری قسمت اچھی ہے۔"

لیکن کلارا سسکیوں کے درمیان مجھ سے بولی: "کیسی قسمت؟ اگر وہ مجھے آج نہیں ڈھونڈ سکے تو کل ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"ذرا بتاؤ تو، کس طرح؟"

"وہ مجھے یہاں، تمھارے گھر آ کر پکڑ لیں گے۔"

"میں کسی کو اندر آنے ہی نہیں دوں گا۔"

"اور اگر انھوں نے پولیس کو بھیج دیا تو؟"

"ارے چھوڑو بھی، میں کہہ دوں گا کہ یہ مذاق تھا۔ اور آخرش مذاق ہی تو تھا یہ۔"

"آج کل مذاق کا زمانہ نہیں ہے، آج کل ہر چیز سنجیدہ شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ کہیں گے کہ میں نے اس کی شہرت داغدار کرنے کی کوشش کی۔ اسے دیکھ کر کون کہے گا کہ وہ کسی عورت کو ستانے کی کوشش کر سکتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو، کلارا،" میں نے کہا، "وہ غالباً تمھیں قید میں ڈال دیں گے۔ لیکن دیکھو کارل ہاولیچیک بورووسکی بھی جیل گیا تھا اور کہاں تک پہنچا؛ تم نے اس کے بارے میں اسکول میں پڑھا ہوگا۔"

"بک بک بند کرو!" کلارا نے کہا۔ "تم جانتے ہو میرے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔ مجھے نظم وضبط کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونا پڑے گا اور یہ بات میرے ریکارڈ پر آ جائے گی، اور میں کبھی اس کارخانے سے نکل نہیں سکوں گی۔ ویسے بھی، میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس ملازمت کا کیا بنا جو مجھے دلوانے کا تم نے وعدہ کیا تھا۔ اب میں رات کو تمھارے گھر پر نہیں سو سکتی۔ مجھے ہمیشہ دھڑکا لگا رہے گا کہ وہ مجھے پکڑنے آ رہے ہیں۔ آج میں چیلاکوویتس واپس جا رہی ہوں۔" یہ تو ایک گفتگو تھی۔

سہ پہر کو شعبے میں ہونے والی ایک میٹنگ کے بعد میری ایک اور گفتگو ہوئی۔ شعبے کے چیئرمین نے، جو سفید بالوں والا آرٹ کا مورخ اور دانشمند آدمی تھا، مجھے اپنے دفتر میں آنے کی دعوت دی۔

''امید ہے تم جانتے ہو گے کہ تم نے اپنا تازہ ترین مقالہ چھپوا کر اپنا کچھ بھلا نہیں کیا ہے،'' وہ مجھ سے بولا۔

''ہاں، مجھے معلوم ہے،'' میں نے جواب دیا۔

''ہمارے کئی پروفیسروں کا خیال ہے کہ اس میں کہی ہوئی باتوں کا ان پر اطلاق ہوتا ہے، اور ڈین سمجھتا ہے کہ اس میں اس کے خیالات پر حملہ کیا گیا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں،'' پروفیسر نے جواب دیا، ''لیکن بطور لیکچرر تمھاری تین سال کی مدت پوری ہو رہی ہے اور اس جگہ کو پُر کرنے کے لیے امیدواروں میں مقابلہ ہوگا۔ کمیٹی کی روایت رہی ہے کہ خالی ہونے والی جگہ کسی ایسے شخص کو دی جائے جو اسکول میں پہلے بھی پڑھا چکا ہو، لیکن کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھارے معاملے میں یہ روایت برقرار رہے گی؟ مگر خیر، میں نے اس سلسلے میں بات کرنے کے لیے تمھیں نہیں بلایا ہے۔ اب تک میں تمھارے حق میں بولتا آیا ہوں کہ تم باقاعدگی سے لیکچر دیتے ہو، طالب علموں میں مقبول ہو، اور انھیں کچھ نہ کچھ پڑھاتے ہو۔ لیکن اب اس کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈین نے مجھے مطلع کیا ہے کہ پچھلے تین مہینوں سے تم نے کوئی لیکچر نہیں دیا ہے۔ اور کسی وجہ کے بغیر۔ صرف یہی بات تمھیں ملازمت سے برطرف کروانے کے لیے کافی ہے۔''

میں نے پروفیسر کو سمجھایا کہ میں نے ایک لیکچر کا بھی ناغہ نہیں کیا، یہ سب محض ایک مذاق تھا، اور میں نے اسے زیتورتسکی اور کلارا کا پورا قصہ سنا دیا۔

''بہت خوب، میں تمھاری بات مان لیتا ہوں،'' پروفیسر بولا۔ ''لیکن میرے ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آج پورا اسکول کہہ رہا ہے کہ تم کوئی لیکچر نہیں دیتے اور کچھ نہیں کرتے۔ اس پر یونین میٹنگ میں بھی بات ہو چکی ہے اور کل وہ لوگ یہ معاملہ بورڈ آف ریجنٹس کے پاس لے گئے ہیں۔''

''لیکن انھوں نے پہلے مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟''

''وہ تم سے کیوں بات کرتے؟ ہر چیز ان کے سامنے واضح ہے۔ اب وہ تمھاری پوری سابقہ

کارکردگی کا جائزہ لے رہے ہیں، اور تمھارے ماضی اور حال کے درمیان ربط تلاش کررہے ہیں۔''

''میرے ماضی میں انھیں کیا غلط چیز مل سکتی ہے؟ آپ تو خود جانتے ہیں کہ مجھے اپنا کام کس قدر پسند ہے۔ میں نے کبھی کام سے جی نہیں چرایا۔ میرا ضمیر صاف ہے۔''

''ہر انسانی وجود کے کئی پہلو ہوتے ہیں،'' پروفیسر نے کہا۔ ''ہم میں ہر ایک کے ماضی کو ایک جتنی آسانی کے ساتھ کسی محبوب رہنما یا کسی بدنام مجرم کی سوانح حیات کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ ذرا اپنے آپ پر غور سے نظر ڈالو۔ یہ کوئی نہیں کہہ رہا ہے کہ تم اپنے کام کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن ہوسکتا ہے یہ صرف تمھارے فرار کے لیے ایک بہانہ ہو۔ تم اکثر میٹنگوں میں نہیں آتے، اور جب آتے ہو تو زیادہ تر خاموش رہتے ہو۔ کوئی نہیں جانتا کہ تمھارے خیالات کیا ہیں۔ مجھے خود یاد ہے کہ کئی بار جب کوئی سنجیدہ موضوع زیرِ بحث تھا، تم نے اچانک کوئی مذاق کرڈالا جس سے سب کو خفت ہوئی۔ بے شک یہ خفت فوراً ہی فراموش کردی گئی، لیکن آج جب اسے ماضی میں سے برآمد کیا جائے گا تو اس میں ایک خاص اہمیت پیدا ہوجائے گی۔ یا پھر یاد کرو کہ کتنی بار مختلف عورتیں تمھیں ڈھونڈتی ہوئی یونیورسٹی پہنچیں اور تم نے ان سے ملنے سے انکار کردیا۔ اور اب تمھارا تازہ ترین مقالہ جس کے بارے میں کوئی بھی شخص اگر چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ یہ مشکوک قضیوں پر مبنی ہے۔ یہ سب میں مانتا ہوں الگ الگ حقائق ہیں؛ لیکن ذرا آج کے قصور کی روشنی میں ان پر نظر ڈالو، یہ سب اکٹھے ہوکر تمھارے کردار اور رویے کے بارے میں ایک اہم شہادت کی مجموعی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔''

''لیکن کون سا قصور؟ ہر چیز کی اتنی سیدھی سادی وضاحت موجود ہے! تمام حقائق بالکل سادہ اور صاف ہیں!''

''رویوں کے مقابلے میں حقائق بہت کم اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی افواہ یا احساس کی تردید کرنا اتنا ہی بے سود ہے جتنا بی بی مریم کی پاکبازی پر کسی کے عقیدے کے بارے میں دلیل بازی کرنا۔ تم محض ایک عقیدے کا شکار ہوئے ہو، کامریڈ اسسٹنٹ!''

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بڑی حد تک صحیح ہے،'' میں نے کہا، ''لیکن اگر میرے خلاف احساسات کسی عقیدے کی طرح بیدار ہوگئے ہیں تو میں عقیدے کا مقابلہ عقل سے کروں گا۔ میں ہر ایک کے سامنے ان تمام چیزوں کی وضاحت کروں گا جو پیش آئی ہیں۔ اگر لوگ سچ مچ انسان ہیں تو وہ ان پر

ہنسیں گے۔"

"جیسی تمھاری خوشی۔ لیکن بعد میں یا تو تم اس نتیجے پر پہنچو گے کہ لوگ انسان نہیں ہیں، یا پھر اس پر کہ تم نہیں جانتے انسان کیسے ہوتے ہیں۔ وہ بالکل نہیں ہنسیں گے۔ اگر تم ہر چیز جس طرح پیش آئی ہے ان کے سامنے رکھ دو، تو یہ ظاہر ہوگا کہ ایک طرف تم نے ٹائم ٹیبل کے مطابق اپنی ذمے داری پوری نہیں کی — یعنی وہ کام نہیں کیا جو تمھیں کرنا چاہیے تھا — اور دوسری طرف تم خفیہ طور پر لیکچر دیتے رہے — یعنی وہ کیا جو تمھیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور یہ ظاہر ہوگا کہ تم نے ایک ایسے آدمی کی ہتک کی جو تمھاری مدد کا طلبگار تھا۔ اور یہ ظاہر ہوگا کہ تمھارے نجی معاملات گڑبڑ ہیں، کہ تم نے کسی لڑکی کو بغیر رجسٹریشن کے اپنے ساتھ رکھ رکھا ہے، جس کا اثر یونین کی خاتون چیئرمین پر بہت ناموافق ہوگا۔ پورا معاملہ الجھ جائے گا اور خدا جانے اور کیا کیا افواہیں جنم لیں گی۔ وہ جو بھی افواہیں ہوں، ان لوگوں کے یقیناً بہت کام آئیں گی جو تمھارے خیالات کے باعث پہلے سے اشتعال میں ہیں لیکن صرف اس بنا پر تمھاری مخالفت کرنے سے شرمارہے ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ پروفیسر مجھے ڈرانے یا دھوکا دینے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ لیکن اس معاملے پر اس کی باتوں کو میں نے بُزدلی کی بڑ خیال کیا اور اس کی تشکیک کے آگے ہتھیار نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر زیتورتسکی والے ہنگامے نے مجھ پر سردی کی ایک لہر طاری کر دی تھی، لیکن مجھے پوری طرح تھکایا نہیں تھا۔ اس گھوڑے پر سواری کا فیصلہ میرا اپنا تھا، اس لیے میں اسے اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ سے لگام چھین کر مجھے جہاں اس کا جی چاہے لے جائے۔ میں اس سے زور آزمائی کرنے کو تیار تھا۔ اور گھوڑے نے بھی اس سے گریز نہیں کیا۔ جب میں گھر پہنچا تو مجھے اپنے پوسٹ باکس میں ایک کارڈ ملا جس میں مجھے مقامی کمیٹی کی میٹنگ میں حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی تھی، اور مجھے ذرا بھی شبہ نہ تھا کہ یہ کس سلسلے میں ہے۔

۱۰

میں غلط نہیں سمجھا تھا۔ مقامی کمیٹی، جس کی میٹنگ ایک ایسی جگہ ہو رہی تھی جہاں پہلے ایک اسٹور رہ چکا تھا، ایک لمبی میز کے گرد بیٹھی تھی۔ جب میں داخل ہوا تو کمیٹی کے ارکان کے چہروں پر افسردگی سی

Scanned with CamScanner

چھا گئی۔ کھچڑی بالوں، اندر کو دبی ہوئی ٹھوڑی اور چشمے والے ایک شخص نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا اور اس شخص نے کارروائی شروع کی۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ مقامی کمیٹی کچھ دنوں سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اسے بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ میری نجی زندگی خاصی بے قاعدہ ہے؛ اور یہ کہ اس باعث محلے میں میرا اچھا تاثر قائم نہیں ہو رہا ہے؛ یہ کہ میرے اقامت خانے کے کرایہ دار میرے بارے میں اس سے پہلے بھی ایک بار شکایت کر چکے ہیں جب وہ میرے کمرے میں ہونے والے شور و غل کے باعث رات بھر سو نہ سکے تھے؛ اور یہ کہ یہ سب کچھ اس بات کے لیے کافی تھا کہ مقامی کمیٹی میرے بارے میں ایک خاص طرح کا تاثر قائم کر لے۔ اور اب اس سے بڑھ کر کامریڈ مادام زیتور تسکی نے، جو ایک سائنسی کارکن کی بیوی ہے، کمیٹی سے مدد طلب کی ہے۔ چھ مہینے پہلے مجھے اس کے شوہر کے علمی مضمون کے بارے میں ایک تبصرہ تحریر کرنا تھا اور میں نے ایسا نہیں کیا، جبکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس مضمون کی تقدیر میرے تبصرے پر منحصر ہے۔

"آپ اسے علمی مضمون کہہ رہے ہیں!" میں نے دبی ہوئی ٹھوڑی والے آدمی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ صرف چربہ سازی اور پیوندکاری کا مجموعہ ہے۔"

"بہت دلچسپ، کامریڈ،" سنہری بالوں والی ایک تیس سالہ عورت گفتگو میں شامل ہو گئی؛ اس کے چہرے پر ایک چمکدار مسکراہٹ گویا مستقل طور پر چسپاں تھی۔ "مجھے ایک سوال پوچھنے کی اجازت دیجیے: آپ کا شعبہ کیا ہے؟"

"آرٹ کے نظریات کی تنقید۔"

"اور کامریڈ زیتور تسکی؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ شاید وہ بھی اسی قسم کا کام کرنے کی کوشش میں ہے۔"

"دیکھا!" سنہری بالوں والی عورت فتحمندانہ انداز میں دوسرے ارکان کی طرف مڑی، "کامریڈ کلیما اپنے شعبے میں کام کرنے والے ساتھی کارکن کو اپنا کامریڈ نہیں بلکہ حریف سمجھتے ہیں۔ آج کل تمام انٹلیکچوئل لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔"

"میں اپنی بات جاری رکھوں گا،" دبی ہوئی ٹھوڑی والے شخص نے کہا۔ "کامریڈ مادام زیتور تسکی نے ہمیں بتایا ہے کہ اس کا شوہر آپ سے ملنے آپ کے فلیٹ پر آیا جہاں اس کی ملاقات ایک

Scanned with CamScanner

خاتون سے ہوئی۔ بتایا گیا ہے کہ اس خاتون نے بعد میں مسٹر زیتورتسکی پر الزام لگایا کہ وہ اسے جنسی طور پر پریشان کرنے کا خواہاں تھا۔ کامریڈ مادام زیتورتسکی کے پاس چند دستاویزات تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کا شوہر اس طرح کے کام کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ اس خاتون کا نام جاننا چاہتی ہے، جس نے اس کے شوہر پر یہ الزام لگایا، اور معاملے کو کارروائی کے لیے عوامی کمیٹی کے شعبۂ نظم وضبط کے پاس بھجوانا چاہتی ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ اس الزام سے اس کے شوہر کی شہرت متاثر ہوئی ہے۔"

میں نے ایک بار پھر اس مضحکہ خیز معاملے کو مختصر کرنے کی کوشش کی۔ "بات سنیے، کامریڈز،" میں نے کہا، "یہ معاملہ ایسا نہیں کہ اس پر اتنی توجہ صرف کی جائے۔ یہ کسی کی شہرت کے داغدار ہونے کا معاملہ نہیں۔ اس کا مضمون اتنا گیا گزرا تھا کہ کوئی اور شخص بھی اس کے حق میں سفارش نہ کرتا۔ اور اگر اس خاتون اور مسٹر زیتورتسکی کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی بھی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقاعدہ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا جائے۔"

"خوش قسمتی سے، کمیٹی کی میٹنگ کے انعقاد کی بابت فیصلہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، کامریڈ،" دبی ہوئی ٹھوڑی والے شخص نے کہا۔ "اور اب جب آپ اتنے اصرار سے کہہ رہے ہیں کہ مسٹر زیتورتسکی کا مضمون بہت کمزور ہے، تو ہمیں اس پورے معاملے کو ایک انتقامی کارروائی کے طور پر دیکھنا ہوگا۔ کامریڈ مادام زیتورتسکی نے ہمیں ایک خط پڑھوایا جو آپ نے اس کے شوہر کا مضمون پڑھنے کے بعد لکھا تھا۔"

"ہاں۔ مگر میں نے اس خط میں اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا کہ وہ مضمون کیسا ہے۔"

"یہ درست ہے۔ لیکن آپ نے یہ ضرور لکھا تھا کہ آپ کو اس کی مدد کر کے خوشی ہوگی: اس خط سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ آپ کامریڈ زیتورتسکی کے مضمون کو احترام کے قابل سمجھتے ہیں۔ اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ محض پیوندکاری پر مشتمل ہے۔ آپ نے یہ بات اس کے منہ پر کیوں نہیں کہی؟"

"کامریڈ کلیما منافق ہیں،" سنہری بالوں والی عورت بولی۔

اس موقعے پر ایک عمر رسیدہ عورت، جس پر مستقل رعشہ طاری تھا، گفتگو میں شامل ہوئی (اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے وہ بے غرضانہ خیرسگالی کے ساتھ دوسروں کی زندگیوں کا جائزہ لینے کی عادی ہو) اس نے فوراً معاملے کے اصل مرکز کی نشان دہی کی۔ "ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ

Scanned with CamScanner

عورت کون تھی جس سے آپ کے گھر پر مسز زیجورسکی کی ملاقات ہوئی۔"

اب میں کسی غلط فہمی کے بغیر صاف صاف سمجھ گیا کہ معاملے کی مضحکہ خیز سنگینی کو ختم کرنا میرے بس سے باہر ہے، اور اس سے نمٹنے کا میرے پاس ایک ہی طریقہ ہے۔ سراغوں کو مبہم بنانا، ان لوگوں کو کلارا سے دور لے جانا، انھیں اس طرح بھٹکا کر غلط راستے پر ڈال دینا جیسے چکور بھیڑیے کو بھٹکا کر اپنے گھونسلے سے دور لے جاتا ہے، اور اپنے بچوں کو بچانے کے لیے اس کے سامنے اپنا جسم پیش کر دیتا ہے۔

"بڑا عجیب قصہ ہے، مجھے اس کا نام یاد نہیں،" میں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ جس عورت کے ساتھ رہتے ہوں اس کا نام ہی نہ جانتے ہوں؟" مستقل رعشہ زدہ عورت نے اعتراض کیا۔

"ایک وقت تھا جب میں یہ سب تفصیلات لکھ لیا کرتا تھا، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ یہ حماقت ہے، اس لیے لکھنا چھوڑ دیا۔ اور آدمی کا اپنی یادداشت پر بھروسا کرنا بہت دشوار ہے۔"

"کامریڈ کلیما، شاید عورتوں سے آپ کے تعلقات بہت مثالی قسم کے ہیں،" سنہری بالوں والی عورت نے کہا۔

"دیکھیے شاید مجھے یاد آ جائے، لیکن اس کے لیے مجھے اپنے دماغ پر زور ڈالنا ہوگا۔ کیا آپ لوگ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مسز زیجورسکی میرے گھر کب آئے تھے؟"

"وہ تاریخ تھی... ایک منٹ ٹھہریے،" دبی ہوئی ٹھوڑی والے آدمی نے اپنے کاغذوں پر نگاہ ڈالی۔ "چودہ تاریخ، بدھ کے دن۔"

"بدھ... چودہ تاریخ... ٹھہریے..." میں نے اپنا سر تھام لیا اور کچھ دیر سوچا۔ "ہاں، یاد آ گیا! وہ میلینا تھی۔" میں نے دیکھا کہ وہ سب میرے الفاظ کو بڑے اشتیاق سے سن رہے ہیں۔

"میلینا کون؟"

"کیا؟ معاف کیجیے گا، مجھے اس کا خاندانی نام معلوم نہیں۔ میں اس سے پوچھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ دراصل، صاف بات یہ ہے کہ مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اس کا نام واقعی میلینا تھا۔ میں اسے میلینا اس لیے کہتا تھا کہ اس کا شوہر مجھے سرخ بالوں والے مینے لاؤس سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر بہر حال، اسے اس نام سے پکارا جانا کافی پسند تھا۔ منگل کی شام کو ایک وائن کی دکان میں میری اس سے ملاقات ہوئی،

Scanned with CamScanner

اور جب اس کا مہینہ لاؤس کونیاک لینے بار تک گیا تو مجھے اس سے کچھ دیر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اگلے دن وہ میرے کمرے پر آئی اور پوری سہ پہر وہیں رہی۔ صرف شام کو میں چند گھنٹوں کے لیے اسے چھوڑ کر گیا کیونکہ یونیورسٹی میں ایک میٹنگ تھی۔ جب میں واپس آیا تو وہ بے حد برہم تھی کیونکہ کسی پستہ قد آدمی نے اس پر دست درازی کی تھی ور اسے گمان تھا کہ اسے میں نے ایسا کرنے پر اکسایا تھا؛ اس نے سخت برا مانا تھا اور اب وہ مجھ سے مزید واقفیت پیدا کرنے پر تیار نہ تھی۔ اور اس طرح، دیکھا آپ نے، میں اس کا اصل نام تک معلوم نہ کر سکا۔"

"کامریڈ کلیما، خواہ آپ سچ کہہ رہے ہوں یا جھوٹ،" سنہری بالوں والی عورت نے کہا، "ایک بات میرے لیے مکمل طور پر ناقابلِ فہم ہے، وہ یہ کہ آپ جیسا شخص ہماری آئندہ نسل کو تعلیم کس طرح دے سکتا ہے۔ کیا ہماری زندگی آپ کو اس کے سوا کسی چیز پر نہیں اکساتی کہ آپ عورتوں کو پٹانے اور استعمال کرنے کے کام میں لگے رہیں؟ آپ یقین رکھیے کہ ہم اپنی یہ رائے متعلقہ حلقوں تک ضرور پہنچائیں گے۔"

"چوکیدار نے کسی ہیلینا کا ذکر نہیں کیا،" مستقل رہنے والی عمر رسیدہ عورت بول اٹھی، "لیکن یہ ضرور بتایا کہ ملبوسات کے کارخانے میں کام کرنے والی ایک لڑکی، بغیر رجسٹریشن کرائے، ایک مہینے سے آپ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ یہ بات مت بھولیے کامریڈ، کہ آپ ایک اقامت خانے میں رہ رہے ہیں۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آپ کسی کو یوں اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے اس جگہ کو قحبہ خانہ سمجھ رکھا ہے؟"

اچانک میری نگاہوں کے سامنے وہ دس کراؤن چمکے جو میں نے چند دن پہلے چوکیدار کو رشوت کے طور پر دیے تھے، اور جان لیا کہ محاصرہ مکمل ہو چکا ہے۔ مقامی کمیٹی کی رکن عورت نے اپنی بات جاری رکھی، "اگر آپ اس کا نام نہیں بتانا چاہتے تو پولیس خود معلوم کر لے گی۔"

۱۱

زمین میرے پیروں تلے سے کھسکتی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی میں مجھے وہ معاندانہ ماحول رفتہ رفتہ محسوس ہونے لگا جس کا تذکرہ پروفیسر نے کیا تھا۔ فی الحال مجھے کسی انٹرویو کے لیے نہیں بلایا گیا، لیکن

Scanned with CamScanner

کبھی کبھی مجھے بات چیت میں کوئی اشارہ محسوس ہو جاتا، اور کبھی کبھی میری کوئی بات کیونکہ شعبے کے استاد اس کے دفتر میں آ کر کافی پیتے تھے اور بات چیت کرنے میں زیادہ احتیاط سے کام نہ لیتے تھے۔ چند روز بعد شعبے کی کمیٹی کا، جو ہر طرف سے شہادتیں جمع کر رہی تھیں، اجلاس ہونے والا تھا۔ میں نے تصور کیا کہ اس کے ارکان مقامی کمیٹی کی رپورٹ پڑھ چکے ہیں، یعنی وہ رپورٹ جس کے بارے میں میں صرف اتنا جانتا تھا کہ یہ خفیہ ہے اور میں اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔

زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جب انسان مدافعانہ انداز میں پسپا ہونے لگتا ہے، جب اسے میدان چھوڑنا پڑتا ہے، جب اسے کم اہم مورچوں کو زیادہ اہم مورچوں کی خاطر تج دینا پڑتا ہے۔ لیکن جب معاملہ بالکل آخری مورچے پر پہنچ جائے، تب آدمی کو رک کر اپنے قدم مضبوطی سے گاڑ لینے پڑتے ہیں، اگر وہ اپنی زندگی کو ساکن ہاتھوں اور جہاز کی غرقابی کے احساس کے ساتھ نئے سرے سے شروع نہ کرنا چاہتا ہو۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرا واحد، اہم ترین مورچہ میری محبت ہے۔ ہاں، ان پریشان کن دنوں میں مجھے یکلخت احساس ہونے لگا تھا کہ میں اپنی نازک اور بدقسمت درزن سے محبت کرتا ہوں، جسے زندگی نے زدوکوب بھی کیا تھا اور جس کے ناز بھی اٹھائے تھے، اور یہ کہ میں اس کے ساتھ پوری طرح پیوست ہوں۔

اس روز کلارا مجھے میوزیم پر ملی۔ نہیں، گھر پر نہیں۔ کیا آپ اب بھی گھر کو گھر سمجھتے ہیں؟ کیا شیشے کی دیواروں والے کمرے کو گھر کہتے ہیں؟ ایسا کمرہ جس کا دوربینوں سے جائزہ لیا جا رہا ہو؟ ایسا کمرہ جہاں آپ اپنی محبوبہ کو ممنوعہ اشیا سے زیادہ چھپا کر رکھنے پر مجبور ہوں؟

گھر گھر نہیں رہا تھا۔ وہاں ہم خود کو بلا اجازت گھسا ہوا محسوس کرتے جنھیں کسی بھی لمحے پکڑا جا سکتا ہو۔ راہداری میں قدموں کی چاپ ہمیں خوفزدہ کر دیتی: ہم ہر وقت کسی کے آ کر زور زور سے دروازہ پیٹنے کی توقع کرتے رہتے۔ کلارا اب چیل کو وتس کے محلے سے کام پر آیا جایا کرتی اور ہمیں تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے غیر لگنے والے گھر میں ملنے کی خواہش نہ ہوتی۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک آرٹسٹ دوست سے رات کو اس کا اسٹوڈیو استعمال کرنے کی اجازت لے لی تھی۔ اس روز وہاں کی چابی مجھے پہلی بار ملی تھی۔

اس طرح ہم دونوں نے خود کو وینو ہرادی کے علاقے میں ایک اونچی چھت کے نیچے، ایک بہت

Scanned with CamScanner

وسیع وعریض کمرے میں پایا جہاں صرف ایک چھوٹا سا دیوان تھا اور ایک بہت بڑی ترچھی کھڑکی جس میں سے پورے پراگ کی روشنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ دیواروں سے لگا کر رکھی ہوئی بہت سی پینٹنگز، کمرے کی بے ترتیبی اور ایک بے پروا آرٹسٹ کی مفلسی کے درمیان میرا آزادی کا مبارک احساس پھر سے لوٹ آیا۔ میں دیوان پر پھیل کر لیٹ گیا، اور کاگ کھولنے والا پیچ کش پھنسا کر وائن کی بوتل کھولی۔ میں خوش دلی اور آزادی سے خوب باتیں کر رہا تھا اور ایک حسین شام اور رات کی امید میں تھا۔

لیکن وہ دباؤ، جو مجھے اب محسوس نہیں ہو رہا تھا، کلارا پر اپنے پورے بوجھ کے ساتھ آ پڑا تھا۔

میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ کلارا کس طرح بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اور انتہائی فطری انداز میں میرے کمرے میں رہا کرتی تھی۔ لیکن اب، جب ہم نے خود کو تھوڑی دیر کے لیے کسی اور کے اسٹوڈیو میں پایا، تو وہ بجھ سی گئی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ: "یہ بہت توہین آمیز ہے،" اس نے کہا۔

"کیا توہین آمیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہ ہمیں کسی اور کا فلیٹ مانگنا پڑ رہا ہے۔"

"اس میں کیا توہین آمیز بات ہے کہ ہم نے کسی اور کا فلیٹ مانگ لیا ہے؟"

"کیونکہ اس میں کوئی توہین آمیز بات ہے،" اس نے جواب دیا۔

"لیکن ہم اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔"

"ہاں،" اس نے جواب دیا، "لیکن مانگے ہوئے فلیٹ میں میں خود کو ایک طوائف جیسا محسوس کرتی ہوں۔"

"اوہ خدایا! تم خود کو مانگے ہوئے فلیٹ میں طوائف جیسا کیوں محسوس کرتی ہو؟ طوائفیں تو زیادہ تر اپنے فلیٹوں میں کاروبار کرتی ہیں، نہ کہ مانگے ہوئے فلیٹوں میں..."

لیکن عقل کی مدد سے اس غیر عقلی احساس کی موٹی دیوار پر حملہ کرنا بے سود تھا، جس پر نسوانی ذہن، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، مشتمل ہوتا ہے۔ ہماری گفتگو ابتدا ہی سے غیر خوش آئند تھی۔

میں نے کلارا کو وہ سب کچھ بتایا جو پروفیسر نے مجھ سے کہا تھا، وہ سب کچھ بتایا جو مقامی کمیٹی میں پیش آیا تھا، اور اسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اگر ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑتے تو آخر میں جیت ہماری ہی ہوگی۔

Scanned with CamScanner

کلارا کچھ دیر چپ رہی اور پھر اس نے مجھے قصوروار قرار دیا۔

''کیا تم مجھے ان درزنوں کے گھیرے سے باہر نکال سکتے ہو؟''

میں نے اسے بتایا کہ کم از کم عارضی طور پر ہمیں برداشت سے کام لینا ہوگا۔

''دیکھا،'' کلارا بولی، ''تم وعدہ کر لیتے ہو اور پھر اسے پورا کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ اب میں کسی اور کی مدد سے بھی وہاں سے نکل نہیں پاؤں گی، کیونکہ تمھاری وجہ سے میری شہرت خراب ہو گئی ہے۔''

میں نے کلارا کو پورا یقین دلایا کہ مسٹر زیتورتسکی والا معاملہ اسے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

''میری یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا،'' کلارا نے کہا، ''کہ تم تبصرہ لکھ کیوں نہیں دیتے۔ اگر تم تبصرہ لکھ دو تو ایک دم سکون ہو جائے گا۔''

''اب بہت دیر ہو چکی ہے،'' میں نے کہا، ''اگر اب میں نے تبصرہ لکھا تو وہ لوگ کہیں گے کہ میں انتقاماً اس مضمون کو رگید رہا ہوں، اور مزید طیش میں آ جائیں گے۔''

''تو رگیدنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اس کے حق میں تبصرہ لکھ دو!''

''یہ میں نہیں کر سکتا، کلارا؛ وہ مضمون لغویت کا پلندا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ تم اچانک اتنے سچے کیسے بن گئے؟ جب تم نے اس چھوٹے آدمی کو یہ بتایا تھا کہ جریدے والے تمھاری رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تو کیا یہ جھوٹ نہیں تھا؟ اور جب تم نے کہا کہ اس نے مجھے بہکانے کی کوشش کی تھی تو کیا یہ جھوٹ نہیں تھا؟ اور جب تم نے ہیلینا کو ایجاد کیا تو کیا یہ جھوٹ نہیں تھا؟ جب تم اتنے سارے جھوٹ بول سکتے ہو تو ایک اور جھوٹ بولنے سے، تعریفی تبصرہ لکھ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہی ایک راستہ ہے جس سے معاملات سیدھے ہو سکتے ہیں۔''

''دیکھو کلارا،'' میں نے کہا، ''تم سمجھتی ہو کہ جھوٹ بس جھوٹ ہوتا ہے، اور بظاہر تمھاری بات درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ میں کچھ بھی ایجاد کر سکتا ہوں، کسی کو بے وقوف بنا سکتا ہوں، عملی مذاق کر سکتا ہوں، اور میں خود کو جھوٹا محسوس نہیں کرتا اور نہ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ یہ سارے جھوٹ، اگر تم انھیں یہی نام دینے پر مصر ہو، مجھے اسی طرح پیش کرتے ہیں جیسا دراصل میں ہوں۔ یہ جھوٹ بول کر میں کسی بناوٹ سے کام نہیں لے رہا ہوتا، ان کے ذریعے دراصل میں سچ بول رہا

ہوتا ہوں۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں میں جھوٹ نہیں بول سکتا، وہ چیزیں جن میں میں اندر تک اترا ہوا ہوں، جن کے معنی کو میں اپنی گرفت میں لایا ہوں، جن سے میں محبت کرتا ہوں اور جن کے بارے میں سنجیدہ ہوں۔ یہ ناممکن ہے، مجھ سے ایسا کرنے کو مت کہو، میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔"

ہم ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکے۔

لیکن مجھے کلارا سے سچ مچ محبت تھی اور میں نے اپنے بس بھر سب کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ اس کے پاس مجھے ملامت کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اگلے دن میں نے مسز زیتورتسکی کے نام ایک خط لکھا اور اس میں کہا کہ تیسرے دن دو بجے دوپہر کو اپنے دفتر میں اس کا انتظار کروں گا۔

۱۲

اپنی دہشت ناک باقاعدگی کے ساتھ مسز زیتورتسکی نے ٹھیک معینہ وقت پر دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کو کہا۔

تب میں نے آخرکار اسے دیکھا۔ وہ لمبے قد کی عورت تھی، بہت لمبے قد کی، پتلے دہقانی چہرے اور زردی مائل نیلی آنکھوں والی۔ "اپنا کوٹ وغیرہ اتار دیجیے" میں نے کہا، اور اس نے بازوؤں کی عجیب حرکات سے اپنا لمبا، گہرے رنگ کا کوٹ اتارا جو کمر پر سے تنگ تھا اور عجیب نمونے کا سلا ہوا تھا، ایک ایسا کوٹ جسے دیکھ کر خدا جانے کیوں قدیم گریٹ کوٹ کا خیال آتا تھا۔

میں فوری حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا؛ پہلے میں اپنی حریف کے پتے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب مسز زیتورتسکی بیٹھ گئی تو میں نے ادھر ادھر کی ایک بات کر کے اسے بولنے پر اکسایا۔

"مسٹر کلیما،" اس نے سنجیدہ آواز میں، لیکن کسی جارحیت کے بغیر، کہا، "آپ جانتے ہیں میں آپ سے کیوں ملنا چاہتی تھی۔ میرے شوہر نے ہمیشہ آپ کا اپنے شعبے کے ماہر اور ایک باکردار شخص کے طور پر احترام کیا ہے۔ ہر چیز آپ کے تبصرے پر منحصر تھی اور آپ یہ تبصرہ نہیں لکھنا چاہتے تھے۔ میرے شوہر کو یہ مقالہ لکھنے میں تین سال لگے ہیں۔ اس نے آپ سے زیادہ دشوار زندگی گزاری ہے۔ وہ ٹیچر تھا، ہر روز پراگ سے بیس میل دور آیا جایا کرتا تھا۔ پچھلے سال میں نے اسے یہ ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا تا کہ وہ اپنی پوری توجہ تحقیق پر لگا سکے۔"

Scanned with CamScanner

"مسز زیتورتسکی باروزگار نہیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں..."

"پھر ان کی گذر بسر کیسے ہوتی ہے؟"

"فی الحال مجھے زیادہ محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ تحقیق، مسٹر کلیما، میرے شوہر کے دل کی لگن ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح ایک ایک چیز کا مطالعہ کیا۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ اس نے کتنے صفحے بار بار لکھے۔ وہ ہمیشہ کہتا ہے کہ سچا محقق وہ ہے، جو تین سو صفحے لکھے اور تیس صفحوں کے سوا باقی سب کو ضائع کر دے۔ اور پھر ہر چیز سے بڑھ کر یہ عورت۔ یقین کیجیے، مسٹر کلیما، میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں، مجھے یقین ہے اس نے یہ حرکت نہیں کی، پھر اس عورت نے اس پر الزام کیوں لگایا؟ میں اسے نہیں مان سکتی۔ میں چاہتی ہوں وہ میرے اور میرے شوہر کے منھ پر یہ بات کہہ دے۔ میں عورتوں کو جانتی ہوں، شاید وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے اور آپ اس کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ شاید وہ آپ میں حسد کا جذبہ ابھارنا چاہتی ہو۔ لیکن مجھ پر یقین کیجیے، مسٹر کلیما، میرے شوہر کی ہرگز یہ مجال نہیں ہو سکتی۔"

میں مسز زیتورتسکی کی بات سن رہا تھا اور اچانک میرے ساتھ ایک عجیب سی بات ہوئی۔ میں اس احساس سے بیگانہ ہو گیا کہ یہ وہ عورت ہے، جس کے باعث مجھے یونیورسٹی چھوڑنی پڑ رہی ہے، اور جس کی وجہ سے میرے اور کلارا کے درمیان رنجش پیدا ہو گئی ہے، اور جس کے سبب میرے اتنے دن غصے اور کوفت کے عالم میں گزرے ہیں۔ اس واقعے سے اس کا تعلق جس میں ہم دونوں نے اپنا اپنا غم انگیز کردار ادا کیا، اچانک مبہم، اتفاقی، حادثاتی معلوم ہونے لگا، جیسے اس میں ہم دونوں کا کوئی قصور نہ ہو۔ ایک دم میری سمجھ میں آ گیا کہ یہ محض ہمارا فریب نظر ہے کہ ہم واقعات کے گھوڑوں پر سواری کرتے اور انھیں اپنی راہ پر چلاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرے سے ہماری کہانیاں ہی نہیں ہوتیں بلکہ کہیں اور سے، باہر سے، ہم پر لاد دی جاتی ہیں؛ یہ کسی بھی طرح ہماری نمائندگی نہیں کرتیں؛ یہ جو راہ اختیار کرتی ہیں ان کے سلسلے میں ہمیں قصوروار ٹھہرایا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ہمیں لے اڑتی ہیں، کیونکہ انھیں دوسری قوتیں کنٹرول کرتی ہیں؛ نہیں، میری مراد ماورائے فطرت قوتوں سے نہیں، بلکہ انسانی قوتوں سے ہے، ان افراد کی قوتیں جو ایک جگہ جمع ہو کر بھی ایک دوسرے سے اجنبی رہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

جب میں نے مسز زیتور تسکی کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ آنکھیں میری حرکات کے نتائج کو نہیں دیکھ سکتیں، جیسے یہ آنکھیں کچھ دیکھ ہی نہیں رہیں، جیسے یہ چمک اس کے چہرے پر تیر رہی ہیں: اس چہرے پر چمک چپکی ہوئی ہیں۔

''شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں مسز زیتور تسکی،'' میں نے صلح جوئی کے لہجے میں کہا، ''شاید میری دوست نے سچ نہیں بولا تھا، لیکن آپ جانتی ہیں کہ جب کسی مرد میں حسد کا جذبہ جاگ اٹھے تو پھر کیا ہوتا ہے... میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا اور اس ریلے میں بہہ گیا۔ ایسا کسی کے بھی ساتھ ہو سکتا ہے۔''

''ہاں یقیناً،'' مسز زیتور تسکی نے کہا، اور یہ ظاہر تھا کہ اس کے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ ''یہ اچھا ہے کہ آپ خود ہی اس بات کو محسوس کر رہے ہیں۔ ہمیں خوف تھا کہ کہیں آپ اس عورت کی بات پر یقین نہ کرتے ہوں۔ یہ عورت تو میرے شوہر کی ساری زندگی کی نیک نامی کو برباد کر سکتی تھی۔ میں اس کے اخلاقی اثرات کی بات نہیں کر رہی۔ لیکن میرا شوہر آپ کے خیالات کی قسم کھاتا ہے۔ مدیروں نے اسے یقین دلایا تھا کہ سب کچھ آپ کی رائے پر منحصر ہے۔ میرے شوہر کو یقین ہے کہ اگر اس کا یہ مقالہ چھپ جائے تو اسے آخر کار ایک سائنسی کارکن تسلیم کر لیا جائے گا۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں، اب جبکہ سارا معاملہ صاف ہو گیا ہے، کیا آپ اس کے لیے تبصرہ لکھ دیں گے؟ اور کیا آپ اسے جلدی لکھ سکتے ہیں؟''

اب وہ لمحہ آیا جب میں اپنا انتقام لے سکتا اور اپنے غصے کی آگ کو بجھا سکتا تھا، اگرچہ اس موقعے پر مجھے غصہ محسوس نہیں ہو رہا تھا، اور جب میں نے مسز زیتور تسکی کو جواب دیا تو اس لیے کہ اس سے فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ ''مسز زیتور تسکی، تبصرے کے سلسلے میں ایک مسئلہ ہے۔ میں آپ سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ کس طرح پیش آیا۔ میں لوگوں کے منہ پر ناخوشگوار باتیں کہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔ میں مسٹر زیتور تسکی سے ملنے سے گریز کرتا رہا، اور میرا خیال تھا وہ بھانپ جائیں گے کہ میں کیوں ایسا کر رہا ہوں۔ اس کا مضمون بہت کمزور ہے۔ اس کی کوئی سائنسی قدر و قیمت نہیں۔ کیا آپ کو میری بات کا یقین آ رہا ہے؟''

''میرے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے۔ نہیں، میں آپ کی بات پر یقین نہیں کر سکتی،'' مسز زیتور تسکی نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تحریر اور یجنل نہیں ہے۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے، محقق کا کام یہ ہے کہ کسی نئے نتیجے پر پہنچے، محقق ان باتوں کو نقل نہیں کر سکتا جو ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں، جو دوسرے لوگوں نے پہلے ہی سے لکھ رکھی ہیں۔''

''میرے شوہر نے کسی کی نقل نہیں کی۔''

''مسز زیتورتسکی، آپ نے یقیناً اپنے شوہر کا مضمون پڑھ رکھا ہوگا...'' میں آگے بولنا چاہتا تھا لیکن مسز زیتورتسکی نے میری بات کاٹ دی۔ ''نہیں، میں نے نہیں پڑھا۔'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''تو آپ پڑھ کر خود دیکھ لیجیے۔''

''میں دیکھ نہیں سکتی۔'' مسز زیتورتسکی نے کہا۔ ''مجھے صرف روشنی اور سائے دکھائی دیتے ہیں، میری آنکھیں خراب ہیں۔ میں نے پانچ سال سے ایک سطر بھی نہیں پڑھی، لیکن مجھے یہ جاننے کے لیے کہ میرا شوہر ایماندار آدمی ہے یا نہیں، کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات دوسرے طریقوں سے بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں، جیسے ماں اپنے بچوں کو جانتی ہے، میں اس کے بارے میں ہر بات جانتی ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے ایمانداری سے کرتا ہے۔''

مجھے اس سے بدتر حالات سے گزرنا پڑا۔ میں نے مسز زیتورتسکی کو میتے چک، چیپر کا اور میچک کے وہ پیراگراف پڑھ کر سنائے جن کے خیالات اور نظریات مسٹر زیتورتسکی نے اپنے مضمون میں پیش کر دیے تھے۔ یہ دانستہ چربہ سازی کا سوال نہیں تھا بلکہ ان ماہرین فن کے سامنے ایک غیر شعوری نیازمندی کا اظہار تھا جن کے خیالات نے مسٹر زیتورتسکی کے اندر مخلصانہ اور شدید احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن کوئی بھی شخص ان پیراگرافوں کا تقابل کر کے آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ کوئی سنجیدہ علمی جریدہ مسٹر زیتورتسکی کے مضمون کو شائع نہیں کر سکتا۔

میں نہیں جانتا کہ مسز زیتورتسکی نے میری توضیحات کو کتنے غور سے سنا، اور کس حد تک سمجھا؛ وہ انکسار کے ساتھ کرسی پر بیٹھی رہی، کسی سپاہی کے سے انکسار اور تابعداری کے ساتھ، جس اس بات کا علم ہو کہ اسے کسی حالت میں اپنا مورچہ نہیں چھوڑنا ہے۔ اس کام میں ہمیں کوئی آدھ گھنٹہ لگا۔ مسز زیتورتسکی کرسی سے اٹھی، اپنی شفاف آنکھیں مجھ پر جما دیں اور دبی ہوئی آواز میں مجھ سے معذرت چاہی، لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کا اپنے شوہر پر بھروسا اب بھی قائم ہے، اور وہ میرے دلائل کی، جو اس کے لیے مبہم

اور نا قابل فہم تھے، مزاحمت نہ کر پانے کے لیے اپنے سوا کسی کو قصوروار نہیں سمجھتی۔ اس نے اپنی فوجی وضع کی برساتی پہن لی اور میں جان گیا کہ یہ عورت جسمانی اور روحانی طور پر سپاہی ہے، ایک افسردہ اور وفادار سپاہی، لانگ مارچوں سے تھکا ہوا سپاہی، ایسا سپاہی جسے کسی حکم کا مدعا سمجھ میں نہیں آتا پھر بھی وہ کسی اعتراض کے بغیر اسے بجا لاتا ہے، ایسا سپاہی جو شکست کھا کر بھی اپنا وقار کھوئے بغیر واپس لوٹتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد اس کی تھکن، اس کی وفاداری اور افسردگی کا کچھ حصہ میرے دفتر میں باقی رہ گیا۔ میں اچانک اپنے آپ کو اور اپنے دکھوں کو بھول گیا۔ اس لمحے میں جس دکھ کے نرغے میں تھا وہ کہیں زیادہ پاکیزہ تھا، کیونکہ اس کا منبع میری اپنی ذات میں نہیں بلکہ باہر کہیں، بہت دور واقع تھا۔

۱۳

"تو اب تمھیں کسی بات سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں،" میں نے ڈالماشین کی وائن کی دکان میں کلارا کو مسز زیتور تسکی کے ساتھ ہونے والی پوری گفتگو سنانے کے بعد کہا۔

"مجھے تو ویسے بھی کسی بات کا ڈر نہیں،" کلارا نے ایسے اعتماد کے ساتھ کہا جس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

"کیا مطلب، کسی بات کا ڈر نہیں؟ تمھاری ہی وجہ سے تو مجھے مسز زیتور تسکی سے ملنا پڑا۔"

"تم نے اچھا کیا کہ اس سے مل لیے کیونکہ تم نے ان لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بہت ظالمانہ تھا۔ ڈاکٹر کلوسک کا کہنا ہے کہ کسی بھی ذہین آدمی کے لیے تمھارے اس رویے کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"

"تم کلوسک سے کب ملیں؟"

"میں مل چکی ہوں،" کلارا نے کہا۔

"اور تم نے اسے سب کچھ بتا دیا؟"

"کیوں؟ تو کیا یہ کوئی راز ہے؟ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم اصل میں کیا ہو۔"

"ہوں۔"

"تمھیں بتاؤں تم کیا ہو؟"

"ضرور۔"

"ایک عام قسم کے کلبی۔"

"یہ تم نے کلوسک سے سنا ہوگا۔"

"کلوسک سے کیوں؟ کیا تمھارا خیال ہے میں خود یہ بات نہیں سمجھ سکتی؟ اصل میں تمھارا خیال یہ ہے کہ مجھ میں اتنی اہلیت نہیں کہ تمھارے بارے میں خود اپنی رائے قائم کر سکوں۔ تم لوگوں کو نکیل ڈال کر چلانا چاہتے ہو۔ تم نے مسز زیتورتسکی سے تبصرہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"یہ تو ایک بات ہوئی۔ پھر تم نے مجھ سے ملازمت دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے مجھے مسٹر زیتورتسکی کے لیے ایک بہانے کے طور پر استعمال کیا اور مسز زیتورتسکی کو میرے لیے بہانے کے طور پر۔ لیکن اتنا یقین رکھو کہ ملازمت مجھے مل جائے گی۔"

"کلوسک کے ذریعے سے؟" میں نے طنزیہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی۔

"تمھارے ذریعے سے نہیں۔ تم نے اپنا اتنا کچھ داؤ پر لگا دیا ہے اور تم جانتے تک نہیں کہ تم کیا کچھ ہار چکے ہو۔"

"اور تم جانتی ہو؟"

"ہاں۔ یونیورسٹی تمھارے معاہدے کی تجدید نہیں کرے گی، اور اگر تمھیں کسی گیلری میں کلرک کی نوکری بھی مل جائے تو تم خوش قسمت ہو گے۔ لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب تمھاری اپنی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں تمھیں ایک مشورہ دوں: آئندہ ہمیشہ ایمانداری سے کام لینا اور کبھی جھوٹ مت بولنا کیونکہ عورت جھوٹ بولنے والے مرد کی عزت نہیں کرتی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، مجھ سے (یہ ظاہر تھا کہ آخری بار) ہاتھ ملایا، مڑی اور چلی گئی۔

کچھ دیر بعد ہی مجھے خیال آیا (اگرچہ میرے چاروں طرف سرد خاموشی کا گھیرا تھا) کہ میری کہانی دراصل الیہ نہیں بلکہ طربیہ کہانیوں کے زمرے سے تعلق رکھتی ہے۔

اور اس خیال نے مجھے کسی قدر تسکین پہنچائی۔

❁❁

Scanned with CamScanner

سوزن سونٹاگ

دوسروں کی اذیت کا نظارہ

انگریزی سے ترجمہ:

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

سوزن سونٹاگ (Susan Sontag) امریکہ کے ممتاز ترین معاصر ادیبوں میں شمار ہوتی ہیں۔ انھوں نے ناولوں اور کہانیوں کے علاوہ ادبی اور معاشرتی تنقید کے مختلف موضوعات پر مضامین اور کتابیں تحریر کی ہیں جنھوں نے دورِ حاضر کے اہم مسائل اور موضوعات پر غور کرنے کے عمل کو مہمیز کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ''آج'' کے شمارہ ۱۷ (''سرائیوو سرائیوو''، خزاں ۱۹۹۴ء) میں ان کے ایک مضمون کا ترجمہ شامل تھا جس میں انھوں نے جنگ زدہ اور محصور بوسنیائی شہر سرائیوو میں اپنے طویل قیام کے دوران سیموئل بیکٹ کا کھیل ''گودو کا انتظار'' پیش کرنے کا، اور اس کے حوالے سے اس شہر کی المناک ابتلا کا، حال بیان کیا تھا۔ یہ سونٹاگ کے اس زندگی بھر کے طرزِ عمل کا حصہ تھا کہ ان کے نزدیک ادیب کے منصب میں یہ بات شامل ہے کہ معاصر انسانی زندگی کے حقائق کو غور سے سمجھنے کی کوشش کرے اور صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز پر مبنی ایک واضح موقف اختیار کرے۔ یہ وہ طرزِ عمل ہے جو سارتر کے گزر جانے کے بعد کئی تخلیقی، ذہنی اور اخلاقی طور پر زندہ ادیبوں نے اختیار کیا اور اس طرح سرد جنگ کے بعد رونما ہونے والی دنیا کی اخلاقی تنقید کی راہیں متعین کیں۔ ان میں سونٹاگ کے علاوہ، مثال کے طور پر، اُرن دھتی رائے بھی شامل ہیں اور برطانوی ڈراما نگار ہیرلڈ پنٹر (Harold Pintor) کی ۲۰۰۵ء کا نوبل ادبی انعام قبول کرنے کے موقعے کی تقریر اس طرزِ عمل کی تازہ ترین مثال ہے۔

آئندہ صفحات میں آپ سونٹاگ کی ایک مختصر کتاب *Regarding the Pain of Others* (۲۰۰۳ء) کا مکمل اردو ترجمہ ملاحظہ کریں گے جس میں انھوں نے جدید دور کے اس مظہر کی پیچیدگی اور ہولناکی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کے تحت دنیا کے مختلف خطوں میں اذیتیں جھیلتے ہوئے انسانوں کو دکھانے والے مناظر پہلے اخباروں اور رسالوں اور اب ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کے بیشتر شہریوں کی روزمرہ زندگی کا جز بن گئے ہیں اور جس کے نتیجے میں مختلف اخلاقی ردعمل سامنے آئے ہیں۔

سونٹاگ (۱۹۳۳ء–۲۰۰۴ء) کی دیگر تصانیف میں ناول *The Benefactor*، *Death Kit*، *The Volcano Lover* اور *In America*، کہانیوں کا مجموعہ *I, Etcetra*، ادبی تنقید کی کتابیں *Against Interpretation* اور *Styles of Radical Will* اور معاشرتی موضوعات پر کتابوں میں *On Photography*، *Illness as Metaphor*، *Aids and its Metaphors* اور *Under the Sign of Saturn* شامل ہیں۔ سوزن سونٹاگ نے سرطان کے خلاف تیس برس سے زیادہ عرصے تک لڑنے کے بعد ۲۰۰۴ء میں وفات پائی۔

Scanned with CamScanner

1

جون ۱۹۳۸ء میں ورجینیا وولف کی کتاب "تھری گنیز" (Three Guineas) شائع ہوئی جس میں اس نے جنگ کے اسباب کے متعلق اپنے جرأت مندانہ، اور نامقبول، خیالات ظاہر کیے تھے۔ یہ کتاب جسے اس سے پہلے کے دو برسوں کے دوران لکھا گیا تھا، جب وہ اور اس کے بیشتر قریبی لوگ اور ساتھی لکھنے والے اسپین میں فاشزم کی زبردست پیش قدمی سے ہیبت زدہ تھے، لندن کے ایک وکیل کے تحریر کردہ ایک خط کے بہت تاخیر سے دیے گئے جواب کے پردے میں شائع کی گئی جس میں مذکورہ وکیل نے سوال کیا تھا: "آپ کی رائے میں ہم جنگ کو کیونکر روک سکتے ہیں؟" وولف کتاب کا آغاز اس چونکانے والے جملے سے کرتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان مکالمہ دراصل ناممکن ہے۔ وجہ یہ کہ گو وہ ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی "تعلیم یافتہ طبقے" سے، تاہم ان کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے: وکیل ایک مرد ہے اور وہ ایک عورت۔ مرد جنگ کرتے ہیں۔ مرد (بیشتر مرد) جنگ کو پسند کرتے ہیں، کیونکہ مردوں کے لیے "لڑنے کے عمل میں کچھ شان و شوکت، کچھ ضرورت، کچھ تسکین پنہاں ہوتی ہے"، عورتیں (بیشتر عورتیں) جس کو نہ محسوس کرتی ہیں اور نہ جس سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ اس جیسی تعلیم یافتہ — دوسرے لفظوں میں: مراعات یافتہ، خوش حال — عورت جنگ کے متعلق کیا جانتی ہے؟ کیا جنگ کی کشش سے اس کا تنفر اس مرد وکیل جیسا ہو سکتا ہے؟

اس "ابلاغ کی دشواری" کا جائزہ لینے کے لیے، وولف تجویز کرتی ہے، آیئے جنگ کے منظروں (images) پر مل کر نگاہ ڈالیں۔ یہ مناظر ان فوٹوگرافوں پر مشتمل ہیں جو محصور ہسپانوی حکومت ہفتے میں دو بار جاری کیا کرتی ہے؛ وولف کا فٹ نوٹ وضاحت کرتا ہے: "یہ تحریر ۱۹۳۶-۳۷ء کے موسم سرما میں لکھی گئی تھی۔" "آیئے دیکھیں،" وولف لکھتی ہے، "کہ آیا ان تصویروں پر نظر ڈالنے سے ہمیں ایک سی چیزوں کا احساس ہوتا ہے۔" وہ مزید لکھتی ہے:

> آج صبح بھیجی جانے والی ایک تصویر میں ایک مرد کی لاش دکھائی گئی ہے، یا شاید عورت کی، یہ اس قدر مسخ شدہ حالت میں ہے کہ کسی سؤر کی لاش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ یقیناً بچوں کی لاشیں ہیں، اور سامنے بلاشبہ کسی مکان کا ایک حصہ ہے۔ بم نے اس مکان کو پہلو سے پھاڑ ڈالا ہے؛ جو جگہ مکان کی بیٹھک رہی ہوگی وہاں اب تک یک پرندے کا پنجرہ لٹک رہا ہے۔

ان تصویروں کو دیکھنے سے جو اندرونی تلاطم پیدا ہوتا ہے اس کا فوری ترین، اور خشک ترین، اظہار اس تبصرے سے کیا جا سکتا ہے کہ ان میں دکھائے گئے موضوع کو پہچاننا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں دکھائی گئی در و دیوار اور زندہ وجودوں کی تباہی انتہائی شدید ہوتی ہے۔ اور اس نکتے سے چل کر وولف تیز رفتاری سے اپنے نتیجے تک پہنچتی ہے۔ ہمارا ردعمل یکساں ہوتا ہے، ''خواہ ہماری تعلیم، ہماری پشت پر کارفرما روایات کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں،'' وہ وکیل کو بتاتی ہے۔ اس کی شہادت یہ ہے ''ہم'' —— یہاں ''ہم'' سے مراد عورتیں ہیں اور آپ، دونوں ممکن ہے ایک ہی جیسے لفظوں میں اپنا ردعمل ظاہر کریں۔

> آپ، سر، اسے ہولناک اور مکروہ کہتے ہیں۔ ہم بھی اسے ہولناک اور مکروہ کہتے ہیں۔۔۔۔ جنگ، آپ کہتے ہیں، ایک بہیمیت ہے، ایک بربریت، جسے ہر قیمت پر روکا جانا ضروری ہے۔ اور ہم بھی آپ کے کہے ہوئے لفظ دہراتے ہیں۔ جنگ ایک بہیمیت ہے؛ ایک بربریت؛ جنگ کو روکا جانا ضروری ہے۔

آج کون ہے جو یہ مانتا ہو کہ جنگ کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ امن کے پرچارک (pacifists) تک نہیں۔ ہم صرف امید کرتے ہیں (جو ہنوز بے فائدہ ہے) کہ نسل کشی کو روک پائیں گے اور جو لوگ جنگ کے قوانین کی سنگین خلاف ورزیاں کرتے ہیں (کیونکہ جنگ کے بھی قوانین ہوتے ہیں جن کی فریقوں کو پابندی کرنی ہوتی ہے) ان کو سزا دیں گے، اور بعض مخصوص جنگوں کو، مذاکرات کے ذریعے طے کیے گئے پُرامن متبادل اختیار کرکے، روک سکیں گے۔ پہلی جنگ عظیم کے اثرات مابعد نے، جب اس بات کا احساس عام ہوا کہ یوروپ نے اپنے ہاتھوں اپنی کس قدر بربادی کی ہے، جس بے تابانہ عزم کو جنم دیا تھا، اس کو سراہنا قدرے مشکل ہے۔ جنگ کی بجائے خود مذمت کرنا اس قدر بے سود اور غیر متعلق عمل محسوس نہیں ہوتا اگر اس کا موازنہ ان کاغذی فیصلوں سے کیا جائے جو

Scanned with CamScanner

۱۹۲۸ء کے کیلوگ برائنڈ (Kellogg-Briand) معاہدے کی صورت میں سامنے آئی تھیں جس میں پندرہ ملکوں نے، بشمول امریکہ، فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی اور جاپان، قومی پالیسی کے حربے کے طور پر جنگ کو ترک کرنے کا عہد کیا تھا۔ فرائیڈ اور آئن اسٹائن تک اس بحث میں شامل ہو گئے اور انھوں نے ۱۹۳۲ء میں کھلے خطوں کا تبادلہ کیا جسے "جنگ کیوں؟" کا عنوان دیا گیا۔ ورجینیا وولف کی کتاب "تھری گنیز"، جو جنگ کی بلند آواز مذمت کے دو عشروں کے اختتام پر شائع ہوئی، اس تازہ خیالی کی مظہر تھی (جس کے باعث یہ کتاب اس کی سب سے زیادہ غیر مقبول کتاب ٹھہری) کہ اس میں اُس شے پر توجہ مرکوز کی گئی تھی جسے بالکل ظاہر اور پیش پا اُفتادہ، اور چنانچہ غور وفکر تو کجا، بیان تک سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا یعنی یہ کہ جنگ مردوں کا کھیل ہے — گویا ہلاکت کی اس مشین کی صنف بھی ہے، اور وہ مذکر ہے۔ تاہم، "جنگ کیوں؟" کی بحث میں وولف نے جو موقف پیش کیا وہ اپنی صاف گوئی کے باوصف، اپنی خطابت، اپنے اخذ کردہ نتائج اور بعض فقروں کی تکرار میں کسی بھی طرح کم روایتی نہیں ٹھہرتا۔ اور جنگ کا شکار ہونے والوں کی تصویریں بجائے خود اسی خطابت کی ایک نوع ہیں۔ وہ تاکید کرتی ہیں۔ واقعے کو سادہ بنا کر پیش کرتی ہیں۔ اشتعال دلاتی ہیں۔ اتفاقِ رائے کا التباس پیدا کرتی ہیں۔

اس مفروضہ مشترک تجربے کی نشان دہی کرتے ہوئے ("ہم اور آپ دونوں ایک ہی لاشیں، ایک ہی تباہ شدہ مکانات، دیکھ رہے ہیں") وولف بظاہر یہ یقین کرتی ہے کہ ان تصویروں سے پیدا ہونے والا صدمہ انگیز ردِعمل نیک نیت لوگوں میں اتحاد قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا ایسا ہوتا ہے؟ یہ بات یقینی ہے کہ وولف اور اس کتاب پر مشتمل لمبے خط کا مخاطب وکیل محض کوئی دو افراد نہیں ہیں۔ اگرچہ ان دونوں کے درمیان احساس اور عمل کے قدیم، اپنی اپنی صنف سے مخصوص، میلانات کی خلیج حائل ہے، جیسا کہ وولف نے وکیل کو یاد دہانی کرائی ہے، لیکن وکیل بھی کوئی پرچم لہراتا ہوا، جنگجو مرد نہیں ہے۔ اس کے جنگ مخالف خیالات بھی اتنے ہی شک سے بالا ہیں جتنے خود وولف کے۔ آخر اس کا سوال یہ تو نہیں تھا کہ جنگ کو روکنے کی بابت "آپ کے" خیالات کیا ہیں؟ بلکہ یہ کہ آپ کے خیال میں "ہم" جنگ کو کیونکر روک سکتے ہیں؟

یہی وہ "ہم" ہے جسے وولف اپنی کتاب کے آغاز پر چیلنج کرتی ہے۔ وہ وکیل کو یہ حق دینے کو تیار نہیں کہ اپنے مفروضہ "ہم" میں اسے بھی شامل کر لے۔ لیکن، نسائیت کے نکتے پر زور دینے والے

صفحات کے گزر جانے کے بعد، وہ خود کو اسی ''ہم'' میں شامل بھی کر لیتی ہے۔

جب معاملہ دوسرے لوگوں کی اذیت کا منظر دیکھنے کا ہو تو ''ہم'' کی کسی بھی تعریف کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

❁

وہ ''ہم'' کون ہے جسے ان صدمہ انگیز تصویروں کا مخاطب بنایا جاتا ہے؟ اس ''ہم'' میں صرف اس نسبتاً چھوٹی قوم یا بے زمین جمعیت کے حامی شامل نہیں ہوتے جو اپنی زندگی کے لیے لڑ رہی ہے، بلکہ — اس سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں — وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو کسی دوسرے ملک میں لڑی جانے والی اس ناگوار جنگ سے برائے نام ہی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ تصویریں ان معاملات کو ''حقیقی'' (یا ''زیادہ حقیقی'') بنانے کا ایک ذریعہ ہیں جنھیں مراعات یافتہ اور محفوظ لوگ ممکن ہے نظر انداز کرنے کو ترجیح دیں۔

''سو یہاں میز پر ہمارے سامنے فوٹو گراف رکھے ہیں،'' وولف اپنے فکری تجربے کے بارے میں لکھتی ہے جسے اس نے اپنے مخاطب ممتاز وکیل (جو، وولف کے بیان کے مطابق، اتنی امتیازی حیثیت کا حامل ہے کہ اس کے نام کے لاحقے کے طور پر K.C. یعنی کنگز کاؤنسل کا لقب لکھا جاتا ہے) اور اپنی کتاب کے قاری، دونوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ جدا جدا تصویروں کے میز پر پھیلے ہوئے ہونے کا تصور کیجیے جو آج صبح کی ڈاک میں موصول ہونے والے لفافے سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان میں بالغ لوگوں اور بچوں کی مسخ شدہ لاشیں دکھائی گئی ہیں۔ ان میں دکھایا گیا ہے کہ جنگ کیونکر تغیر شدہ دنیا میں بے دخلی، توڑ پھوڑ، مسماری اور بربادی پیدا کرتی ہے۔ ''ایک بم نے اس مکان کو پہلو سے پھاڑ ڈالا ہے،'' وولف ان میں سے ایک تصویر میں دکھائے گئے مکان کی بابت کہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شہروں کے درودیوار گوشت اور خون سے بنے ہوئے نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود ٹوٹی پھوٹی عمارتیں اسی طرح اظہار پر قادر ہوتی ہیں جس طرح سڑک پر بکھری ہوئی لاشیں۔ (کابل، سرائیوو، مشرقی موستار، گروزنی، ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد کا زیریں مین ہیٹن کا سولہ ایکڑ پر مشتمل رقبہ، جنین کا مہاجر کیمپ...) دیکھو، تصویریں کہتی ہیں، یہ سب ''ایسا'' دکھائی دیتا ہے۔ جنگ ''یہ'' کرتی ہے۔ اور ''وہ'' بھی۔ جنگ توڑتی ہے، ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ جنگ پھاڑ ڈالتی ہے، آنتیں باہر نکال دیتی ہے۔ جنگ جلا کر راکھ کر دیتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ جنگ اعضا کاٹ پھینکتی ہے۔ جنگ "تباہی" لاتی ہے۔

ان تصویروں کو دیکھ کر تکلیف میں مبتلا نہ ہونا، ان سے ناگواری محسوس نہ کرنا، اس تباہی، اس غارت گری کے اسباب کو ختم کرنے کا عزم نہ کرنا — یہ سب ردعمل وولف کے نزدیک کسی ایسے شخص کے ہی ہو سکتے ہیں جو اخلاقی اعتبار سے عفریت ہو۔ اور، وہ یہ کہہ رہی ہے، ہم، تعلیم یافتہ طبقے کے ارکان، عفریت نہیں ہیں۔ ہماری ناکامی دراصل ہمارے تخیل کی ناکامی ہے، ذہنی مناسبت کی ناکامی ہے: ہم اس حقیقت کو اپنے ذہن میں پوری طرح بٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔

لیکن کیا یہ سچ ہے کہ یہ تصویریں، جو غیر جنگجو شہریوں کے قتل کی دستاویزی شہادتیں ہیں نہ کہ فوجوں کے تصادم کی، محض جنگ کے استرداد کے جذبے کو تحریک دیتی ہیں؟ وہ ریاست کی جانب سے زیادہ جنگجوئی کو بھی تو ابھار سکتی ہیں۔ کیا انھیں اسی اصل مقصد سے تیار نہیں کیا گیا تھا؟ وولف اور وکیل کے درمیان اتفاق رائے قطعی طور پر مفروضہ قسم کا معلوم ہوتا ہے، جس میں یہ دہشت ناک تصویریں اسی رائے کی تصدیق کرتی ہیں جو پہلے سے مشترک تصور کر لیا گیا ہے۔ اگر سوال یہ ہوتا کہ ہم مسلح اور کلیسائی فاشزم سے ہسپانوی ریپبلک کو بچانے کے لیے خود کیا کردار ادا کر سکتے ہیں، تو یہی تصویریں اپنی جدوجہد کے مبنی بر انصاف ہونے کے بارے میں ان کے عقیدے کو مستحکم کرتیں۔

وولف کی جمع کی ہوئی تصویریں درحقیقت وہ کچھ نہیں دکھاتیں جو جنگ، بحیثیت جنگ، کرتی ہے۔ وہ جنگ آزمائی کا ایک مخصوص طریقہ پیش کرتی ہیں، جسے اُس دور میں "وحشیانہ" کے لفظ کے ذریعے بیان کیا جانا عام تھا، یعنی وہ طریقہ جس میں شہریوں کو نشانہ بنایا جائے۔ جنرل فرانکو بمباری، قتل عام، ایذا رسانی، اور قیدیوں کو ہلاک کرنے اور ان کی لاشوں کو مسخ کرنے پر مشتمل وہی حربے استعمال کر رہا تھا جن میں اس نے ۱۹۲۰ء کے عشرے میں مراکش میں مہارت حاصل کی تھی۔ تب، حکمراں قوتوں کے لیے زیادہ قابلِ قبول طور پر، اس کے ان حربوں کا نشانہ اسپین کے نوآبادیاتی غلام بنتے تھے، جن کی رنگت کالی تھی اور جو اس پر طرہ یہ کہ لادین بھی تھے؛ اب اس کے انھی حربوں کا نشانہ اس کے ہم وطن بن رہے تھے۔ ان تصویروں میں وہی کچھ پڑھنا، جیسا کہ وولف کرتی ہے، جس سے جنگ سے عمومی قسم کی نفرت کے جذبے کی تصدیق ہوتی ہو، دراصل اسپین سے ایک ایسے ملک کے طور پر نبرد آزما ہونے سے نپٹنے کے مترادف ہے جو اپنی پوری تاریخ رکھتا ہے۔ اس عمل کا مطلب سیاست کو مسترد کرنا ہے۔

وولف کے لیے، اور اس کے علاوہ دوسرے جنگ مخالف بحث کنندگان کے لیے، جنگ ایک عمومی حیثیت رکھتی ہے اور جن مناظر کو وہ بیان کرتی ہے وہ جنگ کا شکار ہونے والے عام، بے نام انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میڈرڈ کی حکومت کی جانب سے بھیجی جانے والی تصویریں، غیر اغلب طور پر، بلا عنوان معلوم ہوتی ہیں۔ (یا شاید وولف یہ سادہ سا مفروضہ قائم کر لیتی ہے کہ ہر تصویر کو خود بولنا چاہیے۔) لیکن جنگ مخالف موقف کون، کب اور کہاں جیسی اطلاعات پر انحصار نہیں کرتا؛ قتل وغارت گری کا اندھادھند تسلسل بجائے خود کافی شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے جنھیں یقین ہے کہ حق ایک طرف ہے اور جبر اور ناانصافی دوسری طرف، اور جن کا موقف یہ ہے کہ جدوجہد جاری رہنی چاہیے، اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ کون مارا گیا ہے اور کس کے ہاتھوں۔ کسی اسرائیلی یہودی کے لیے یروشلم کے مرکزی کاروباری علاقے میں واقع سبارو پیزا خانے پر کیے جانے والے حملے میں ہلاک ہونے والے بچے کی تصویر سب سے پہلے ایک یہودی بچے کی تصویر ہے جو ایک فلسطینی خودکش بمبار کے ہاتھوں مارا گیا۔ کسی فلسطینی کے لیے غزہ میں کسی ٹینک کے گولے سے ہلاک ہونے والے بچے کی تصویر سب سے پہلے ایک فلسطینی بچے کی تصویر ہے جو اسرائیلی بارود کا نشانہ بنا۔ جنگجو شخص کے لیے شناخت ہی سب کچھ ہے۔ اور تمام تصویریں تب تک منتظر رہتی ہیں جب تک عنوان ان کی وضاحت نہ کرے یا ان کے بارے میں غلط اطلاع مہیا نہ کرے۔ بلقان کے خطے میں ہونے والی حالیہ جنگوں کے آغاز پر سربوں اور کروٹوں کے درمیان جھڑپوں کے دوران کسی گاؤں پر ہونے والی گولاباری میں مارے جانے والے بچوں کی ایک ہی تصویریں سرب اور کروٹ دونوں کی پروپیگنڈا بریفنگ میں تقسیم کی گئیں۔ عنوان بدل کر، بچوں کی موت کو ایک بار، اور بار بار، استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہلاک شدہ شہریوں اور تباہ شدہ مکانوں کے مناظر مخالف فریق کے خلاف نفرت کو تیز کرنے کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں، اسی طرح جیسے قطر میں قائم عرب سیٹلائٹ ٹیلی وژن نیٹ ورک الجزیرہ کی نشریات میں جنین میں اپریل ۲۰۰۲ء میں کیے جانے والے قتل عام کے مناظر بار بار دکھائے گیا۔ یہ مناظر یوں تو دنیا بھر میں الجزیرہ کی نشریات دیکھنے والے بہت سے لوگوں کے لیے آتش انگیز تھے، لیکن وہ اسرائیلی فوج کے بارے ایسی کوئی اطلاع فراہم نہیں کرتے تھے جسے ماننے پر وہ پہلے سے آمادہ نہ ہوں۔ اس کے برعکس، ایسے مناظر کو جن سے تسلیم شدہ نیک خیالات کی تردید ہوتی ہو، ہمیشہ

کیمرے کے لیے اسٹیج کیے گئے جعلی مناظر قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اپنی جانب سے کیے جانے والے مظالم کی تصدیق کرنے والی تصویروں کے سامنے آنے پر پہلا ردعمل یہی ہوتا ہے کہ ان تصویروں کو جعلی ٹھہرایا جائے اور یہ کہا جائے کہ ایسا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا؛ کہ تصویروں میں دکھائی جانے والی لاشیں وہ ہیں جنھیں مخالف فریق نے مردہ خانوں سے لا کر سڑک پر بکھیر دیا تھا۔ یا پھر ردعمل یہ ہوتا ہے کہ ہاں، یہ واقعہ پیش آیا تھا، لیکن مخالف فریق کے ہاتھوں، جبکہ نشانہ بننے والے لوگ اس طرف کے تھے۔ چنانچہ جنرل فرانکو کی قوم پرستانہ بغاوت کے پروپیگنڈا کے سربراہ کا کہنا یہی تھا کہ باسک (Basque) قوم کے افراد نے خود اپنے قدیم شہروں کو تباہ کیا تھا، اور ۲۶ اپریل ۱۹۳۷ء کو سابقہ دارالحکومت گوئرنیکا (Guernica) کے گٹروں میں ڈائنامائٹ لگا کر اسے ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا (بعد میں اس بیان میں تبدیلی کر کے یہ کہا گیا کہ اسے ان بموں سے تباہ کیا گیا جو باسک علاقے میں تیار کیے گئے تھے) تاکہ بیرون ملک اشتعال پیدا کیا جائے اور ریپبلک کی جانب سے مزاحمت کو تقویت دی جائے۔ اور اسی طرح سربیا میں، اور بیرون ملک، رہنے والے سربوں کی اکثریت سرائیوو کے محاصرے کے آخری لمحے تک، بلکہ اس کے بعد تک، اسی موقف پر اڑی رہی کہ مئی ۱۹۹۲ء میں روٹی کی قطار میں کھڑے لوگوں کے قتل عام، اور فروری ۱۹۹۴ء میں بازار میں ہونے والے قتل عام کے ہولناک واقعات خود بوسنیا والوں نے، اپنے دارالحکومت کے مرکز میں بڑے تاپ کے گولے پھینک کر یا بارودی سرنگیں نصب کر کے، اس مقصد سے کروائے تھے کہ غیر ملکی خبرنگاروں کے کیمروں کو غیر معمولی طور پر دردناک مناظر مہیا کیے جائیں اور اس طرح بوسنیا کے لیے مزید بین الاقوامی حمایت پیدا کی جائے۔

مسخ کردہ لاشوں کی تصویریں بلاشبہ اس طرح استعمال کی جا سکتی ہیں، جیسے وولف نے کیں، کہ ان سے جنگ کی مذمت میں نئی جان ڈالی جائے، اور ایسے لوگوں کو جو جنگ کے تجربے سے بالکل نہیں گزرے، اس کی حقیقت کی ہلکی سی جھلک دکھائی جائے۔ لیکن جو شخص یہ تسلیم کرتا ہو کہ موجودہ، تقسیم شدہ دنیا میں جنگ کا وجود ناگزیر، بلکہ حق بجانب، ہو سکتا ہے، جواباً کہہ سکتا ہے کہ یہ تصویریں جنگ کو مسترد کرنے کے حق میں قطعی کوئی شہادت پیش نہیں کرتیں — ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے لیے جواں مردی اور قربانی کے تصورات بے معنی اور ناقابل قبول ہو چکے ہیں۔ جنگ کی تباہ کاری — بجز اس کے کہ وہ مکمل تباہی ہو، جو در اصل جنگ نہیں بلکہ خودکشی ہوگی — بجائے خود جنگ کرنے کے عمل کے خلاف کوئی

Scanned with CamScanner

دلیل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ انسان یہ مانتا ہو، جو مشکل ہی سے کوئی مانتا ہوگا، کہ تشدد ہمیشہ بے جواز ہوتا ہے، کہ طاقت کا استعمال ہر صورت میں اور ہر موقعے پر غلط ہے — غلط اس وجہ سے کہ، جس طرح سیمون ویل (Simone Weil) اپنے بلند پایہ مضمون Iliad, or The Poem of Force (۱۹۴۰ء) میں زور دے کر کہتی ہے، طاقت اپنی زد میں آنے والے ہر شخص کو ایک شے میں بدل ڈالتی ہے۔* نہیں، جو لوگ کسی مخصوص صورت حال میں مسلح جدوجہد کے سوا کوئی متبادل نہیں دیکھتے، جواباً کہتے ہیں، تشدد نشانہ بننے والوں کو شہید یا ہیرو کا بلند درجہ عطا کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید زندگی دوسرے لوگوں کی اذیت کا نظارہ کرنے — دور سے، فوٹوگرافی کی وساطت سے دیکھنے — کے جو بے شمار مواقع مہیا کرتی ہے، ان کو کئی طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی ظالمانہ کارروائی کا منظر دکھانے والی تصویریں متضاد ردعمل پیدا کر سکتی ہیں۔ امن کی اپیل۔ انتقام کی طلب۔ یا محض اس بات کی ہیبت خیز آگہی (جسے تصویری اطلاعات سے متواتر تقویت ملتی رہتی ہے) کہ دنیا میں ہولناک چیزیں پیش آیا کرتی ہیں۔ ٹائیلر ہکس (Tylor Hicks) کی کھینچی ہوئی ان تین تصویروں کو کون بھول سکتا ہے جنھیں ''نیویارک ٹائمز'' نے ۱۳ نومبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کی نئی جنگ کے لیے مخصوص اپنے روزانہ ضمیمے (A Nation Challenged) کے پہلے صفحے کے بالائی نصف حصے پر شائع کیا تھا؟ ان تین سلسلہ وار تصویروں میں طالبان کے ایک باوردی زخمی سپاہی کا انجام دکھایا گیا تھا جسے کابل کی طرف پیش قدمی کرتی ہوئی شمالی اتحاد کی فوجوں نے ایک خندق سے برآمد کیا تھا۔ پہلا پینل: اسے پکڑنے والے سپاہیوں میں سے ایک نے اس کا ایک بازو اور دوسرے نے ایک ٹانگ دبوچ رکھی ہے اور اسے پشت کے بل پتھریلی سڑک پر گھسیٹ رہے ہیں۔ دوسرا پینل (کیمرا اس کے بہت نزدیک ہے) اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا جا رہا ہے جبکہ وہ اپنے گرد گھیرا ڈال

---

* اپنی جنگ کی مذمت سے قطع نظر، سیمون ویل نے اسپانوی ریپبلک کے دفاع میں اور ہٹلر کے جرمنی کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۶ء میں وہ ایک بین الاقوامی بریگیڈ میں شامل ہو کر ایک غیر جنگجو رضاکار کے طور پر اسپین گئی۔ ۱۹۴۲ء میں اور ۱۹۴۳ء کے اوائل میں لندن میں، پناہ گزینی اور بیماری کی حالت میں اس نے ''فری فرنچ'' کے دفتر میں کام کیا اور امید کرتی رہی کہ اسے مقبوضہ فرانس میں مشن پر بھیجا جائے گا۔ (اگست ۱۹۴۳ء میں ایک انگلستانی سینے ٹوریم میں اس کی وفات ہو گئی۔)

Scanned with CamScanner

کر کھڑے سپاہیوں کو دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ تیسرا پینل. موت کے لمحے کے روبرو، بازو پھیلائے اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا، برہنہ اور کمر سے نیچے خون میں لت پت، فوجیوں کی اس ٹولی کے ہاتھوں ختم کیے جاتے ہوئے جو اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے اس کے گرد جمع ہے.

ریکارڈ کے اس عظیم اخبار پر ہر صبح نگاہ ڈالنے کے لیے، رواقیوں جیسے صبر اور بردباری کے ذخیرے کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ ایسی کسی تصویر پر نظر پڑنے کا غالب امکان رہتا ہے جس سے انسان رونے پر مجبور ہو جائے۔ اور عکس کی کھینچی ہوئی تصویر جیسے مناظر رحم اور کراہت کے جو تاثرات پیدا کرتے ہیں، انھیں اس سوال کے ذہن میں اٹھنے کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے کہ کون سی تصویریں، کن لوگوں کے مظالم، اور کن لوگوں کی ہلاکتیں ہیں جن کو نہیں دکھایا جا رہا۔

❁

بہت طویل عرصے تک بعض لوگ یہ یقین کرتے رہے کہ گر ہولن کی کو کافی حد تک واضح صورت میں پیش کیا جا سکے تو آخرکار بیشتر لوگ جنگ کے ظالمانہ پن، اس کے جنونی پن کا احساس کرنے لگیں گے۔

وولف کی کتاب "تھری گنیز" کی اشاعت سے چودہ سال پہلے — ۱۹۲۴ء میں، جرمنی میں پہلی جنگِ عظیم کے لیے برپا کی جانے والی قومی تحریک کی دسویں سالگرہ کے موقعے پر — باضمیر نکتہ چیں ارنسٹ فریڈرخ (Ernst Friedrich) نے اپنی کتاب "جنگ کے خلاف جنگ!" (War Against War!) شائع کی تھی۔ اس میں فوٹوگرافی کو شاک تھیراپی کے طور پر استعمال کیا گیا تھا: ایک سو اسی سے زیادہ تصویروں کا ایک البم جو بیشتر جرمن فوجی اور طبی ذخیروں سے حاصل کی گئی تھیں، جن میں سے بیشتر کو جنگ کے دوران سرکاری سنسر نے ناقابلِ اشاعت قرار دیا تھا۔ کتاب کا آغاز کھلونا سپاہیوں، کھلونا توپوں اور ایسی چیزوں کی تصویروں سے ہوتا ہے جو ہر کہیں نوعمر لڑکوں کی مسرت کا سامان ہوتی ہیں، اور خاتمہ ان تصویروں پر جو فوجی قبرستانوں میں لی گئیں۔ کھلونوں اور قبروں کے درمیان پڑھنے والا تباہی، قتل و غارت اور زوال کے چار برسوں کے اذیت ناک تصویری سفر سے گزرتا ہے: تباہ کیے اور لوٹے ہوئے گرجا گھروں اور محلوں، مٹا دیے گئے گاؤوں، برباد کر دیے گئے جنگلوں، تارپیڈو سے ڈبو دی گئی مسافر بردار اسٹیمروں، تباہ شدہ گاڑیوں، پھانسی پائے ہوئے باضمیر نکتہ چینوں، فوجی قحبہ خانوں میں پائی جانے والی نیم برہنہ طوائفوں، زہریلی گیس کے حملے کے بعد جاں کنی کے عذاب سے گزرتے

سپاہیوں، ڈھانچا بنے آرمینی بچوں کی تصویریں۔ ''جنگ کے خلاف جنگ!'' میں شامل تقریباً تمام ہی سلسلہ وار تصویریں بہت دشواری سے دیکھی جا سکتی ہیں، خصوصاً مختلف فوجوں سے تعلق رکھنے والے سپاہیوں کی کھیتوں میں، سڑکوں پر، اور محاذ جنگ کی خندقوں میں سڑتی ہوئی لاشوں کی تصویریں۔ لیکن بلاشبہ اس کتاب میں، جو دہشت زدہ اور بے حوصلہ کرنے ہی کے مقصد سے تیار کی گئی ہے، سب سے زیادہ ناقابل برداشت صفحات وہ ہیں جنھیں ''جنگ کا چہرہ'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ ان سپاہیوں کے چوبیس کلوز اپ جن کے چہروں کو گہرے زخموں نے مسخ کر دیا ہے۔ اور فریڈرخ نے یہ فرض کرنے کی غلطی نہیں کی کہ یہ دل ہلا دینے والی، کریہناک تصویریں خود اپنے منھ سے بولیں گی۔ ہر فوٹوگراف کے نیچے چار زبانوں (جرمن، فرانسیسی، ولندیزی اور انگریزی) میں جذبات سے بھری سرخی درج ہے، اور ہر صفحے پر جنگجویانہ نظریے میں مضمر خباثت کی چمڑی اتاری گئی ہے اور اس کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ فریڈرخ کے جنگ کے خلاف اس اعلانِ جنگ کو ایک طرف حکومت، تجربہ کار جنگ بازوں کی اور دیگر محبِ وطن تنظیموں کی طرف سے فوراً مذموم ٹھہرایا گیا — بعض شہروں میں پولیس نے کتابوں کی دکانوں پر چھاپے مارے، اور ان تصویروں کی عوامی نمائش کے خلاف مقدمے دائر کیے گئے۔ اور دوسری طرف بائیں بازو کے ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں، اور متعدد جنگ مخالف تنظیموں نے اس کتاب کو اپنا لیا اور پیش گوئی کی کہ یہ رائے عامہ پر فیصلہ کن اثر مرتب کرے گی۔ ۱۹۳۰ء تک جرمنی میں ''جنگ کے خلاف جنگ!'' کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے، اور بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جا چکا تھا۔

۱۹۳۸ء میں، جس سال وولف کی کتاب ''تھری گینیز'' شائع ہوئی، عظیم فرانسیسی ہدایت کار ایبل گانس (Abel Gance) نے اپنی فلم *J'accuse* کے نئے ورژن کے کلائمکس میں پہلی جنگِ عظیم کے سابق سپاہیوں کے کلوز اپ شامل کیے جن کے چہرے مسخ ہو چکے تھے — انھیں فرانسیسی میں the broken mags کا ہم معنی لقب دیا گیا تھا اور جن کو بیشتر لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ (گانس نے اس بے مثال جنگ مخالف فلم کا ایک ابتدائی، خام کارانہ ورژن، اسی معنی خیز عنوان سے ۱۹-۱۹۱۸ء میں بنایا تھا۔) فریڈرخ کی تیار کردہ کتاب کی طرح، گانس کی فلم کا اختتام بھی ایک نئے فوجی قبرستان میں ہوتا ہے، نہ صرف ہمیں یہ یاد دلانے کے لیے کہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیانی عرصے میں ہونے والی جنگ کے دوران (جسے ''تمام جنگوں کا خاتمہ کر دینے والی جنگ'' کا لقب دیا گیا

Scanned with CamScanner

تھا) کتنے جوان لوگ جنگجوئی اور بھونڈے پن کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئے، بلکہ اس مقدس فیصلے کو سامنے لانے کی غرض سے بھی جو یہ تمام مرنے والے یورپ کے سیاست کاروں اور سپاہ سالاروں کے خلاف صادر کرتے اگر انھیں علم ہوتا کہ بیس برس بعد ایک اور عظیم جنگ ہونے والی ہے۔ ''ورڈن (Verdun) کے مُردو، اٹھ کھڑے ہو!'' ذہنی اختلال کا شکار سابق فوجی، جو اس فلم کا مرکزی کردار ہے، فرانسیسی زبان میں چلا کر کہتا ہے، اور اپنا خطاب جرمن اور انگریزی میں دہراتا ہے ''تمھاری قربانیاں رائیگاں گئیں!'' وسیع میدانی قبرستان اپنی زیرِ زمین آبادی کو اگل دیتا ہے: پھٹی پرانی وردیاں پہنے، لڑکھڑا کر چلتے سپاہیوں کی فوج جن کے چہرے مسخ ہیں، جو اپنی قبروں سے اٹھ کر مختلف سمتوں میں چلنے لگتے ہیں اور ملک کی اس آبادی میں ہلچل مچا دیتے ہیں جو ایک اور براعظم گیر جنگ کے لیے صف بندی کر رہی ہے۔ ''اس ہونا کی کو اپنی آنکھوں میں بھر لو! یہی واحد شے ہے جو تمھیں روک سکتی ہے!'' پاگل شخص اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے زندہ انسانوں سے پکار کر کہتا ہے، جو اسے انعام کے طور پر شہید کی موت عطا کرتے ہیں، جس کے بعد وہ اپنے مردہ ساتھیوں میں شامل ہو جاتا ہے: جذبات سے عاری روحوں کے اس سمندر میں جو مستقبل کے خوفزدہ جنگ بازوں اور آنے والی کل کی جنگ کا شکار ہونے والوں کو اپنے سیلاب کی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ مردے قبروں سے اٹھ کر جنگ کو شکست دے دیتے ہیں۔

اور اس کے اگلے برس جنگ شروع ہو گئی۔

۲

کسی دوسرے ملک میں پیش آنے والے مصائب کا تماش بین ہونا ایک بنیادی طور پر جدید تجربہ ہے، خبرنگار کے نام سے پہچانے جانے والے پیشہ ور، اختصاص کے حامل سیاحوں کی ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے کی کوششوں کا مجموعی حاصل۔ جنگیں اب رہنے کے کمروں کے منظروں اور آوازوں میں شامل ہو چکی ہیں۔ کہیں اور رونما ہونے والے واقعات کی اطلاعات، جنھیں ''خبریں'' کہا جاتا ہے، تصادم اور تشدد کو پیش کرتی ہیں — ''اگر خبر خون آلود ہے تو اس کی سرخی جمے گی!'' (If it bleeds, it leads.) ٹیبلائڈ اخباروں اور چوبیس گھنٹے چلنے والے ہیڈ لائن نیوز شوز کے واجب التعظیم ہدایت

نامے میں بتایا جاتا ہے— اور ان ایک کے بعد ایک نظروں کے سامنے آنے والے مناظر کا ردعمل رحم، یا اشتعال، یا گدگدی، یا قبولیت، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

جنگ کی اذیتوں کے بارے میں اطلاعات کے متواتر بڑھتے ہوئے بہاؤ کا کیسے سامنا کیا جائے، یہ سوال انیسویں صدی ہی میں ایک مسئلے کا روپ اختیار کر گیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی کے صدر گستاو موئینئر (Gustav Moynier) نے لکھا

> اب ہمیں علم رہتا ہے کہ ہر روز دنیا بھر میں کیا کچھ پیش آتا ہے۔ روزناموں کے خبر نگار جنگ کے محاذ پر جانکنی میں مبتلا لوگوں کو گویا [اخبار] پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے لا ڈالتے ہیں اور ان کی کراہیں ان کے کانوں تک پہنچا دیتے ہیں...

موئینئر ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی اس بڑھتی ہوئی تعداد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو مختلف فریقوں سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے مصائب کا غیر جانبداری سے ازالہ کرنے کے مقصد سے ریڈ کراس کی تنظیم وجود میں آئی تھی۔ جنگ کریمیا (۵۶-۱۸۵۴ء) کے فوری بعد متعارف کرائے جانے والے ہتھیاروں، مثلاً بریچ لوڈنگ رائفل اور مشین گن، کی بدولت جنگ میں شریک فوجوں کی ہلاکت خیزی کی استعداد میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن اگرچہ محاذوں پر پیش آنے والی اذیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ کر ان لوگوں کے سامنے آنے لگی تھی جو اس کے بارے میں صرف اخبار میں پڑھا کرتے تھے، ۱۸۹۹ء میں یہ بات کہنا واضح طور پر مبالغہ تھا کہ انھیں علم رہتا ہے کہ "ہر روز دنیا بھر میں کیا کچھ پیش آتا ہے"۔ اور اگرچہ دور افتادہ سرزمینوں پر جاری جنگوں میں اٹھائی جانے والی اذیتیں اب ہماری آنکھوں اور ہمارے کانوں پر تقریباً اپنے واقع ہونے کے ساتھ ساتھ حملہ آور ہوتی ہیں، یہ بات کہنا اب بھی مبالغہ ہوگا۔ خبروں کی زبان میں جس شے کو "دنیا" کہا جاتا ہے— "ہمیں بائیس منٹ دیجیے، ہم آپ کو دنیا فراہم کریں گے،" ایک ریڈیو نیٹ ورک ہر گھنٹے میں کئی بار یہ اعلان دہراتا ہے۔ دراصل (دنیا کے برعکس) ایک بہت چھوٹی سی جگہ ہے، جغرافیائی اعتبار سے بھی اور تفہیم کے لحاظ سے بھی، اور اس کے بارے میں جو کچھ جاننے کے قابل سمجھا جاتا ہے اسے کڑے پن سے اور تاکید کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

کہیں اور پیش آنے والی منتخب جنگوں میں مجموعی طور پر رونما ہونے والے مصائب کی آگہی ایک ساختہ (structured) شے ہے۔ اکثر کیمرے کی طے کردہ شکل میں وہ اچانک سامنے آتی ہے،

بہت سارے لوگ اسے مشترکہ طور پر انگیز کرتے ہیں، اور پھر وہ دھندلی ہو کر نظر سے غائب ہو جاتی ہے۔ تحریری روداد کے برعکس — جسے، اس کے خیالات کی پیچیدگی، حوالے اور ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے، پڑھنے والوں کی وسیع یا قلیل تعداد حاصل ہوتی ہے — تصویر کی صرف ایک زبان ہوتی ہے اور وہ امکانی طور پر تمام لوگوں سے خطاب کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

پہلی اہم جنگوں میں جن کی فوٹوگرافروں کی تیار کردہ روداد دستیاب ہے — جنگِ کریمیا اور امریکی سول وار، اور پہلی جنگِ عظیم سے پہلے پیش آنے والی اور جنگیں — جنگی کارروائی بجائے خود کیمرے کے دائرے سے باہر رہتی تھی۔ جہاں تک ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کے عرصے میں شائع ہونے والی جنگی تصویروں کا تعلق ہے، تقریباً تمام بے نام فوٹوگرافروں کی کھینچی ہوئی، وہ سب ہولناکی اور تباہی کو پیش کرنے کے لحاظ سے رزمیہ (epic) نوعیت کی حامل ہیں اور بیشتر صورتوں میں جنگ کے بعد کے مناظر پیش کرتی ہیں: بکھری ہوئی لاشیں، یا خندقوں کی جنگ کے بعد کا چاند کی سطح جیسا منظر، فرانس کے جلے ہوئے گاؤں جہاں سے جنگ کے آتشیں قدم گزر گئے۔ جنگ کی لمحہ بہ لمحہ تصویری روداد جس سے ہم اب واقف ہیں، اس کے آنے میں ابھی کچھ برسوں کی دیر تھی جن کے دوران پیشہ ورانہ آلات میں زبردست ترقی ہوئی تھی: کم وزن کے کیمرے، مثلاً لائیکا، اور ان میں استعمال ہونے والی ۳۵ ملی میٹر کی فلم جسے کیمرے میں لوڈ کرنے کے بعد ۳۶ بار ایکسپوز کیا جا سکے۔ اب تصویریں ٹھیک محاذِ جنگ کے درمیان کھینچی جا سکتی تھیں، بشرطیکہ فوجی سنسرشپ کی اجازت حاصل ہو، اور جنگ کا شکار ہونے والے شہریوں اور کالک پُتے چہروں والے سپاہیوں کا کلوز اپ میں مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔ ہسپانوی خانہ جنگی (۱۹۳۶-۳۹ء) وہ پہلی جنگ تھی جس کا جدید معنوں میں مشاہدہ کیا گیا (یا جسے ''کور'' کیا گیا)، اور یہ کام لڑائی کی صف بندیوں کے درمیان اور بمباری کا نشانہ بنتے ہوئے شہروں میں ان پیشہ ور فوٹوگرافروں نے انجام دیا جن کی کھینچی ہوئی تصویریں اسپین میں اور اسپین سے باہر اخباروں اور رسالوں میں فوری طور پر شائع ہو گئیں۔ ویت نام میں امریکہ نے جو جنگ لڑی، اور جو پہلی جنگ تھی جس کا، روز بہ روز، ٹیلی وژن کیمروں نے تعاقب کیا، اس کے باعث موت اور تباہی سے گھروں کی ایک ٹیلی قربت (tele-intimacy) قائم ہوئی۔ اس کے بعد سے آج تک ٹھیک اس وقت رونما ہوتے ہوئے قتلِ عام اور جنگوں کی فلمیں مستقل طور پر چھوٹی اسکرین کی ہلکی تفریح کا حصہ بن چکی ہیں۔

Scanned with CamScanner

ایسے ناظرین کے ذہنوں میں جو ہر طرف پیش آتے ہوئے ڈراموں کی زد میں ہیں، کسی مخصوص تصادم کے لیے کوئی مخصوص جگہ پیدا کرنا اس تصادم کے چیدہ چیدہ مناظر کی روزانہ اور بار بار ترسیل کا تقاضا کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے درمیان جو کبھی جنگ کے تجربے سے نہیں گزرے، جنگ کی فہم اب انھی مناظر کی اثر انگیزی کی مصنوع (product) ہے۔

کوئی شے — ان لوگوں کے لیے جو دور بیٹھے اس شے کو "خبر" کے طور پر انگیز کر رہے ہیں — حقیقت بن جاتی ہے، کیونکہ اس کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ لیکن وہ سانحہ جو لوگوں پر حقیقت میں گزرا ہے، بجائے خود اپنی پیش کش سے مماثل دکھائی دینے لگتا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو ہونے والے حملے کو، بہت سے ایسے لوگوں کی زبانی جو اس عمارت کے ٹاوروں سے جان بچا کر نکلے یا جنھوں نے قریب سے اسے ہوتے ہوئے دیکھا، پہلے پہل "غیر حقیقی"، "سرریلی"، "فلم کی طرح" کے الفاظ میں بیان کیا گیا۔ (خطیر بجٹ والی ہالی وڈ کی "ڈزاسٹر" فلموں کے چار عشروں کے بعد "یہ بالکل فلم کی طرح لگا" نے اس تبصرے کی جگہ لے لی ہے جو اس سے پہلے کسی بڑے سانحے سے بچ کر نکلنے والے لوگوں کی زبان سے، پہلے پہل کی بے یقینی کے احساس کو بیان کرنے کے لیے ادا ہوتا تھا: "یہ بالکل خواب جیسا لگا۔")

منظروں کا ایک نہ تھمنے والا سیلاب (ٹیلی وژن، مسلسل چلتے ہوئے وڈیو، فلمیں) ہمارے اردگرد ہے، لیکن جب یاد رکھنے کا سوال آتا ہے تو فوٹوگراف ان سب پر سبقت لے جاتے ہیں۔ یاد ساکت منظروں کو محفوظ کر لیتی ہے؛ واحد منظر اس کی بنیادی اکائی ہے۔ اطلاعات کے اوورلوڈ کے اس دور میں فوٹوگراف کسی شے کا ذہنی احاطہ کرنے کا تیز رفتار طریقہ اور اسے یادداشت میں محفوظ کرنے کی مختصر (compact) ہیئت فراہم کرتا ہے۔ فوٹوگراف کسی اقتباس، مقولے یا ضرب المثل کی طرح ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے ذہن میں سیکڑوں فوٹوگراف محفوظ رکھتا ہے، جو فوری طور پر یاد کیے جا سکتے ہیں۔ ہسپانوی خانہ جنگی کے دوران کھینچے گئے مشہور ترین فوٹوگراف کا ذکر کیجیے، جس میں ایک رپبلیکن سپاہی بیک وقت دشمن کی گولی اور رابرٹ کاپا (Robert Capa) کے کیمرے کی زد میں ہے، اور تقریباً ہر شخص جس نے اس جنگ کے بارے میں سن رکھا ہے، اپنے ذہن میں اس شخص کی سیاہ وسفید دانے دار شبیہ کو اپنے ذہن میں تازہ کر لے گا جس نے سفید قمیص پہن رکھی تھی، آستینیں موڑ رکھی

تھیں اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر پیچھے کی طرف گر رہا تھا جبکہ اس کے پیچھے کو مڑے ہوئے داہنے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر گر رہی تھی؛ مردہ حالت میں اپنی پرچھائیں پر گر پڑنے سے بس لمحہ بھر پہلے۔

یہ ایک صدمہ انگیز منظر ہے، اور یہی اصل نکتہ ہے۔ صحافت کا حصہ بنا دیے جانے کے نتیجے میں کیمرے سے کھینچی گئی تصویروں سے یہی توقع کی جاتی تھی کہ وہ لوگوں کو متوجہ کریں، چونکائیں، حیرت میں ڈال دیں۔ ۱۹۴۹ء میں جاری ہونے والے رسالے ''پیرس میچ'' (Paris Match) کا اشتہاری نعرہ ہوا کرتا تھا:

The weight of words, the shock of photos.

زیادہ سے زیادہ ڈرامائی (یہ صفت اس سلسلے میں اکثر استعمال کی جاتی ہے) مناظر کی تلاش فوٹوگرافی کے کاروبار کو تحریک دیتی ہے، اور ایک ایسے کلچر کے نارمل پن کا حصہ ہے جس میں صدمہ (shock) صارفیت کا ایک نمایاں محرک اور قدر کا ایک بڑا منبع بن چکا ہے۔ ''حسن ہیجان انگیز ہوگا، ورنہ ہوگا ہی نہیں،'' آندرے بریتوں (Andre Breton) نے اعلان کیا تھا۔ وہ اس جمالیاتی آدرش کو ''سرریئل'' کا نام دیتا تھا، لیکن ایک ایسے کلچر میں جسے تجارتی اقدار کی بالادستی نے بالکل منقلب کر ڈالا ہے، کسی منظر سے چونکانے والا، شورش انگیز، آنکھیں کھول دینے والا ہونے کا مطالبہ نہ صرف بنیادی طور پر حقیقت پسندی پر مبنی معلوم ہوتا ہے بلکہ تجارتی طور پر بھی معقول دکھائی دیتا ہے۔ آخر اپنے پروڈکٹ یا اپنے فن کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کا اور کون سا طریقہ ہے؟ منظروں کے نہ تھمنے والے سیلاب، اور مٹھی بھر منظروں کی بے تحاشا تکرار کی اس صورت حال میں اور کس طرح رخنہ ڈالا جا سکتا ہے؟ منظر بطور صدمہ و منظر بطور کلیشے، ایک ہی وجود کے دو پہلو ہیں۔ چینسٹھ برس پہلے تمام فوٹوگراف کسی نہ کسی حد تک نئے پن کی خصوصیت رکھتے تھے۔ (یہ بات ورجینیا وولف کے لیے ناقابل تصور رہی ہوگی — جس کی تصویر بلاشبہ ۱۹۳۷ء میں ''ٹائم'' کے سرورق پر شائع ہوئی تھی — کہ ایک دن اس کا چہرہ ایک بے حد دہرایا ہوا منظر بن کر ٹی شرٹوں، کافی کے مگوں، کتابوں کے لفافوں، فرج پر لگے ہوئے مقناطیسوں، اور کمپیوٹر کے ماؤز پیڈوں پر ظاہر ہو جائے گا۔) ۳۷-۱۹۳۶ء کے موسم سرما میں مظالم کی تصویر کشی کرنے والے فوٹوگراف خال خال ہی ہوتے تھے۔ ''تھری گنیز'' میں وولف نے جنگ کی ہولناکی کو پیش کرنے والی جن تصویروں کا ذکر کیا ہے وہ کم و بیش خفیہ (clandestine)

Scanned with CamScanner

علم کا درجہ رکھتی تھیں۔ ہماری صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ اذیت اور تباہی کو پیش کرنے والی انتہائی مانوس، انتہائی مشہور تصویریں جنگ کے بارے میں کیمرے کی مدد سے حاصل کیے گئے ہمارے علم کا ناگزیر حصہ بن چکی ہیں۔

*

۱۸۳۹ء میں کیمرے کی ایجاد کے بعد سے فوٹوگرافی موت کی متواتر صحبت میں رہی ہے۔ چونکہ کیمرے سے کھینچی گئی تصویر کسی بھی ایسی شے کا ہو بہو عکس ہوتی ہے جسے اس کے عدسے کے سامنے لایا گیا ہو، اس لیے فوٹوگراف معدوم ہو جانے والے ماضی یا گزرے ہوئے عزیزوں کی یادگار کے طور پر موقلم سے بنائی گئی تصویروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ البتہ مرنے کے عمل کو کیمرے کی گرفت میں لے آنا ایک الگ معاملہ تھا جب تک کیمرے کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا، تپائی پر رکھا جاتا اور تصویر کھینچنے کے لیے تیار کیا جاتا ایک سست، زحمت طلب عمل رہا، تب تک کیمرے کی رسائی بھی محدود رہی۔ لیکن جب کیمرا تپائی سے آزاد ہوا، اسے لیے پھرنا حقیقی معنوں میں آسان ہو گیا، اور رینج فائنڈر اور مختلف قسم کے عدسوں کی مدد سے فاصلے پر رہتے ہوئے کسی شے کا قریبی مطالعہ کرنا ممکن ہو گیا، تو تصویر کشی نے ایسی فوری اور مستند نوعیت اختیار کر لی جو بڑے پیمانے پر پیدا کردہ موت کی ہولناکی کی ترسیل کرنے کے معاملے میں کسی بھی لفظی روداد پر فوقیت رکھتی تھی۔ اگر کسی واحد سال کا ذکر کرنا ہو جس میں نفرت انگیز حقائق کو نہ صرف ریکارڈ کرنے بلکہ ان کی تعریف متعین کرنے کے معاملے میں کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویروں کی طاقت ہر قسم کے پیچیدہ بیانوں پر غالب آ گئی، تو وہ یقیناً ۱۹۴۵ء کا سال ہوگا، جب اپریل اور وائل مئی میں برگن بیلسن، بوخن والڈ اور داخاؤ کے نازی ہلاکت کیمپوں کو آزاد کرائے جانے کے بعد وہاں کی تصویریں کھینچی گئیں، اور اگست میں یوسوکے یاماہاتا (Yosuke Yamahata) جیسے جاپانی گواہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی پوری آبادیوں کو جلا دیے جانے کے بعد کے مناظر کی تصویر کشی کی۔

یورپ کے لیے صدمے کا یہ دور تین عشروں پہلے ۱۹۱۴ء میں شروع ہو چکا تھا۔ ''جنگِ عظیم'' (اسے کچھ عرصے تک اسی نام سے یاد کیا جاتا رہا) شروع ہونے کے سال بھر کے اندر اندر بہت کچھ جسے ناتغیر پذیر سمجھا جاتا تھا، مخدوش، بلکہ ناقابلِ مدافعت معلوم ہونے لگا۔ خودکشی کی حد تک مہلک فوجی جھڑپیں جن سے جنگ میں شریک ملک خود کو علاحدہ کرنے سے قاصر تھے — سب سے بڑھ کر مغربی محاذ

پر خندقوں میں ہر روز پیش آنے والی ہلاکتیں ـــ اکثر لوگوں کو اس قدر بھیانک معلوم ہوتی تھیں کہ لفظ انھیں بیان کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ * حقیقت کی نازک اور پیچیدہ تہہ داری کو لفظوں کی گرفت میں لانے کے ماہرِ فن استاد، فصاحت کے جادوگر، ہنری جیمز (Henry James) نے ۱۹۱۵ء میں "نیویارک ٹائمز" سے گفتگو کرتے ہوئے اعلان کیا: "اس تمام صورت حال کے درمیان آدمی کو اپنے لفظوں کو برتنا بھی اتنا ہی دشوار محسوس ہوتا ہے جتنا اپنے خیالوں کو سہارنا۔ جنگ نے لفظوں کی قوت چوس لی ہے، وہ کمزور پڑ گئے ہیں، ابتر ہو گئے ہیں۔" اور ۱۹۲۲ء میں والٹر لپمین (Walter Lippmann) نے لکھا: "فوٹوگراف آج تخیل پر اسی طرح حکمرانی کرتے ہیں جیسے کل چھپے ہوئے لفظ، اور اس سے بھی پہلے بولے ہوئے لفظ، کیا کرتے تھے۔ وہ مکمل طور پر حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔"

کیمرے سے کھینچی گئی تصویروں میں دو متضاد خوبیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ان کی معروضیت مستند حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے باوجود تصویر میں کسی زاویۂ نظر کا ہونا ناگزیر تھا۔ وہ کسی بھی پیمانے سے بڑھ کر، خواہ وہ کتنی ہی غیر جانبدارانہ کیوں نہ ہو، حقیقت کا ناقابلِ تردید ریکارڈ تھیں، کیونکہ ریکارڈ کرنے کا کام ایک مشین کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ اور وہ حقیقت کی گواہی بھی تھیں، کیونکہ ایک شخص تصویر کھینچنے کے لیے موقعے پر موجود رہا تھا۔

فوٹوگراف، ورجینیا وولف دعویٰ کرتی ہے، "دلیل نہیں ہوتے، وہ تو محض (simply) ایک خام سا بیان ہوتے ہیں جس کا مخاطب آنکھ کی جانب ہوتا ہے۔" سچ یہ ہے کہ وہ "محض" (simply) کوئی چیز نہیں ہوتے، اور انھیں کوئی شخص، وولف یا کوئی اور، صرف حقائق کے طور پر نہیں دیکھتا۔ کیونکہ، جیسا کہ وہ اس کے فوراً بعد مزید کہتی ہے، "آنکھ دماغ سے منسلک ہوتی ہے؛ اور دماغ اعصابی نظام سے۔ اس نظام کے بھیجے ہوئے پیغامات، لپکتے شعلے کی طرح، ماضی کی ہر یاد اور حال کے ہر احساس سے گزرتے ہیں۔" ہاتھ کی اسی صفائی کی بدولت کیمرے کی تصویریں بیک وقت معروضی ریکارڈ اور شخصی گواہی دونوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فوٹوگراف حقیقت کے کسی ایک مخصوص، سچ مچ گزرے ہوئے لمحے

---

* سوم (Somme) کی لڑائی کے پہلے دن، یکم جولائی ۱۹۱۶ء کو، ساٹھ ہزار برطانوی فوجی ہلاک یا شدید زخمی ہوئے ـــ اور ان میں سے تیس ہزار لڑائی شروع ہونے کے پہلے آدھ گھنٹے میں۔ ساڑھے چار مہینے کی اس لڑائی کے خاتمے پر دونوں فریقوں کے تیرہ لاکھ افراد ہلاک یا زخمی ہو چکے تھے اور برطانوی اور فرانسیسی محاذ پانچ میل آگے بڑھ گیا تھا۔

کی صحیح نقل بھی ہوتا ہے اور اس حقیقت کی ایک تعبیر بھی اور یہ وہ کارنامہ ہے جس کی جستجو ادب بہت عرصے سے کرتا آرہا تھا لیکن جسے لغوی معنوں میں کبھی انجام نہ دے سکا تھا۔

جو لوگ کیمرے سے خلق کیے ہوئے منظروں کی شاہدانہ قوت پر زور دیتے ہیں، انھیں ان منظروں کو خلق کرنے والے شخص کی موضوعیت کے سوال سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ مظالم کی فوٹوگرافی میں لوگ شہادت کا وزن تو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ہنرمندی (artistry) کے کسی شائبے کے بغیر، جسے عدم خلوص، یا محض مصنوعی پن کا مترادف خیال کیا جاتا ہے۔ جہنمی واقعات کی تصویریں اس وقت زیادہ مستند معلوم ہوتی ہیں جب ان میں وہ تاثر نہ ہو جو "درست" لائٹنگ یا کمپوزیشن سے پیدا ہوتا ہے، کیونکہ تصویر کھینچنے والا یا تو غیر پیشہ ور ہے یا ــ اتنے ہی کارآمد طور پر ــ کئی مانوس فن مخالف (anti-art) طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ ہنرمندی کے اعتبار سے کم درجے کا ہونے کے باعث ایسی تصویروں کو کم مصنوعی سمجھا جاتا ہے ــ کیونکہ اذیت دہی کے تمام وسیع طور پر نشر کیے جانے والے مناظر اب اس شک کی زد میں رہتے ہیں ــ اور ساتھ ہی سہل ہمدردی یا ستم رسیدہ شخص کے ساتھ خود کو شناخت کر پانے کا جذبہ ابھارنے کا امکان بھی ان میں کم خیال کیا جاتا ہے۔

کم ہنرمندانہ تصویروں کا ایک مخصوص قسم کے استناد کا حامل ہونے کی وجہ سے محض خیرمقدم ہی نہیں کیا جاتا، بلکہ یادگار، پر گو تصویر کے معیارات اس قدر لچکدار ہو گئے ہیں کہ ان میں سے بعض شاہکار تصویروں کے ساتھ مقابلے میں بھی رکھی جاتی ہیں۔ اس کی تصدیق ستمبر ۲۰۰۱ء میں مین ہیٹن کے سوہو (SoHo) کے اسٹور فرنٹ میں منعقد کی جانے والی ان تصویروں کی نمائش سے ہوئی جس میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو تباہ ہوتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ *Here is New York* کے عنوان سے منعقد ہونے والی اس نمائش کے منتظموں نے ہر شخص پیشہ ور اور شوقیہ فوٹوگرافی کرنے والے ــ کو جس کے پاس عمارت پر ہونے والے حملے اور اس کے بعد کے مناظر محفوظ ہوں، اپنی تصویریں نمائش کے لیے جمع کرانے کی عام دعوت دی تھی۔ اولین ہفتوں میں یہ دعوت ایک ہزار سے زائد افراد نے قبول کی، اور اپنی کھینچی ہوئی تصویریں جمع کرانے والے ہر شخص کی کم سے کم ایک تصویر نمائش میں ضرور شامل کی گئی۔ یہ تمام تصویریں، فوٹوگرافروں کے نام یا عنوان کے بغیر، دونوں تنگ کمروں کی دیواروں پر ٹنگی ہوئی، یا کمپیوٹر کے مانیٹر پر (اور نمائش کی ویب سائٹ پر) سب کی نظروں کے سامنے تھیں، اور اعلیٰ کوالٹی کے

Scanned with CamScanner

انک جیٹ پرنٹ آؤٹ کی صورت میں خریداری کے لیے بھی دستیاب تھیں اور ان کی قیمت محض پچیس ڈالر تھی (اس سے جمع ہونے والی رقم اا ستمبر کو مارے جانے والوں کے بچوں کی مدد کے لیے قائم کیے گئے فنڈ میں دی جانے والی تھی)۔ خریدنے کے بعد ہی خریدنے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ اس نے گیلس پیریس (Gilles Peress) کی کھینچی ہوئی تصویر خریدی ہے (جو نمائش کے منتظموں میں سے ایک تھا) یا جیمز ناچتوے (James Nachtwey) کی، یا کسی ریٹائرڈ اسکول ٹیچر کی کھینچی ہوئی، جس نے اپنے کم کرائے والے ولیج اپارٹمنٹ کی خوابگاہ کی کھڑکی سے جھک کر شمالی مینار کے گرنے کا منظر اپنے پوائنٹ اینڈ شوٹ کیمرے میں قید کر لیا تھا۔ نمائش کے ذیلی عنوان ''تصویروں کی جمہوریت'' سے اشارہ ملتا تھا کہ نمائش میں حصہ لینے والے غیر پیشہ ور، شوقیہ فوٹوگرافروں کا کام بھی اتنا ہی اچھا ہے جتنا پیشہ ور عکس گیروں کا۔ اور بلاشبہ یہ بات درست تھی — جس سے ثقافتی جمہوریت کے بارے میں نہ سہی، فوٹوگرافی کے بارے میں ایک بات ثابت ہوگئی۔ فوٹوگرافی نمایاں فنون میں واحد فن ہے جس میں پیشہ ورانہ تربیت اور برسوں کا تجربہ ایک ماہر فوٹوگرافر کو کسی غیر تربیت یافتہ، نا تجربہ کار فوٹوگرافر پر فوقیت نہیں دلاتا — اس کے کئی اسباب ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تصویر کے کھینچے جانے کے عمل میں اتفاق (یا قسمت) کا بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے، اور بے ساختگی، بھدے پن اور ناقص پن کو قابل ترجیح سمجھا جاتا ہے۔ (ادب میں اس سے مماثل کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی، اور وہاں اتفاق یا قسمت کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے اور زبان کی نفاست عموماً معیوب خیال نہیں کی جاتی؛ یہ خصوصیت مظاہراتی فنون میں بھی نہیں پائی جاتی جن میں مکمل تربیت اور روزانہ ریاض کے بغیر حقیقی کامیابی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ فلم سازی میں بھی نہیں جہاں ان فن مخالف تعصبات کا کوئی خاص چلن نہیں جو معاصر آرٹ فوٹوگرافی میں عام ہیں۔)

خواہ کسی فوٹوگراف کو کوئی سادہ خیال (naive) شے سمجھا جائے یا کسی تجربہ کار ماہر فن کا فن پارہ، اس کے معنی — اور دیکھنے والے کے ردعمل — کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے کس غلط یا صحیح طور پر شناخت کیا گیا ہے؛ گویا معنی اور ردعمل الفاظ پر منحصر ہیں۔ مذکورہ نمائش کو منعقد کرنے کے تصور، اس کے مخصوص وقت اور مقام، اور اسے دیکھنے والے گرویدہ لوگوں نے اسے اس اصول سے یک طرح کا استثنیٰ بخش دیا تھا۔ نیویارک کے سنجیدہ شہریوں کو، جو ۲۰۰۱ء کے پورے موسم خزاں کے دوران ہر روز پرنس اسٹریٹ پر Here is New York نامی نمائش دیکھنے کے لیے قطار میں کھڑے رہا کرتے تھے،

تصویروں کے عنوانات کی ضرورت نہ تھی۔ جو کچھ ان کی نظروں کے سامنے تھا اس سے وہ کم نہیں بلکہ بہت زیادہ مانوس تھے — ایک ایک عمارت، ایک ایک گلی سے — آگ، ریزہ ریزہ ہوتی چیزوں، خوف، تھکن، اور غمزدگی سے۔ لیکن، بلاشبہ، ایک دن آئے گا جب ان تصویروں کو عنوانات کی ضرورت ہوگی۔ اور انھیں دیکھنے یا ان مناظر کو یاد رکھنے کے نادرست انداز، اور ان تصویروں کے نئے نظریاتی استعمالات کا پیدا کردہ فرق نمایاں ہو جائے گا۔

عام طور پر، اگر موضوع سے کسی قدر فاصلہ موجود ہو، فوٹوگراف جو کچھ "کہتا" ہے اسے کئی طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ آخرکار ہر شخص اس میں وہی کچھ پڑھتا ہے جو اس کے خیال میں اسے "کہنا چاہیے"۔ جیسا کہ فلم کے پہلے نظریہ ساز لیو کولیشوف (Lev Kuleshov) نے ۱۹۲۰ء کے عشرے میں ماسکو میں کیے گئے اپنے مشہور تجربے میں دکھایا، اگر ایک اداکار کے کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری چہرے کے طویل شاٹ کے بیچ بیچ میں مختلف قسم کے شاٹ مثلاً بھاپ اڑاتا ہوا سوپ کا پیالہ، تابوت میں لیٹی ہوئی عورت، کھلونا ریچھ سے کھیلتا ہوا بچہ — ڈالے جائیں تو دیکھنے والے اس اداکار کے چہرے کے تاثرات کی گہرائی اور وسعت کو بے حد سراہیں گے۔ ساکت تصویروں کے معاملے میں ہم اس انسانی ڈرامے کی بابت اپنے علم کو کام میں لاتے ہیں جس سے کسی تصویر کا تعلق ہوتا ہے۔ ڈیوڈ سیمور 'چم' (David Seymour 'Chim') کی کھینچی ہوئی مشہور اور بار بار چھاپی جانے والی تصویر جس کا عنوان "زمین کی تقسیم کی میٹنگ، ایکسٹریمادورا، اسپین، ۱۹۳۶ء" ہے، اور جس میں ایک دبلی، خستہ حال عورت کو دکھایا گیا ہے جو اپنے شیرخوار بچے کو سینے سے لگائے، اوپر آسمان کو دیکھ رہی ہے (عزم سے؟ اندیشے سے؟)، اکثر اس طرح یاد کی جاتی ہے کہ اس میں عورت آسمان پر حملہ آور بمبار جہازوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر، اور اس کے آس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر بھی، سراسیمگی کا تاثر دکھائی دیتا ہے۔ یادداشت نے، اپنی ضرورت کے مطابق، منظر میں تبدیلی پیدا کر لی ہے اور چم کی تصویر کو ایک علامتی درجہ عطا کر دیا ہے، اس شے کے سلسلے میں نہیں جو عنوان کے مطابق اس تصویر میں دکھائی گئی ہے — یعنی جنگ شروع ہونے سے چار مہینے پہلے کھلے آسمان تلے ہونے والی ایک سیاسی میٹنگ — بلکہ اس شے کے سلسلے میں جو اسپین میں بہت جلد واقع ہونے والی تھی اور جس کے زبردست اثرات پیدا ہونے والے تھے۔ یعنی یورپ میں پہلی بار جنگ کے ایک باقاعدہ حربے کے طور پر شہروں اور دیہاتوں کو

تباہ و برباد کرنے کی غرض سے کی جانے والی ہوائی بمباری۔* بہت جلد آسمان سچ مچ ان لڑاکا طیاروں سے بھر گیا جو اسی قسم کے بے زمین کسانوں پر، جو چم کی کھینچی ہوئی تصویر میں دکھائے گئے تھے، ہوائی بمباری کے لیے آئے تھے۔ (اس تصویر میں دکھائی گئی عورت کے چہرے پر، اس کی سکڑی ہوئی بھنووں، آدھی مچی ہوئی آنکھوں اور ذرا سے کھلے ہوئے منہ پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیے۔ کیا اس کے چہرے کا تاثر

---

* فرانکو کی ہسپانیہ جنگ بازی کے سلسلے میں کوئی اور بات اس قدر یاد نہیں رکھی گئی جتنے یہ ہوائی حملے، جو بیشتر جرمن ایرفورس کے اس خصوصی دستے نے کیے تھے جنھیں ہٹلر نے فرانکو کی مدد کے لیے بھیجا تھا، اور جن کو پکاسو نے اپنے شاہکار "گورنیکا" میں یادگار بنا دیا۔ لیکن یہ ہوائی بمباری کی پہلی مثال نہیں تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران کہیں کہیں، نسبتاً کم اثر نوعیت کی، ہوائی بمباری کی گئی تھی۔ مثلاً جرمنوں نے پہلے زیپلنوں (Zeppelins) سے اور پھر طیاروں سے کئی شہروں پر حملے کیے تھے جن میں لندن، پیرس اور آنتورپ شامل تھے۔ اس سے کہیں زیادہ ہلاکت خیز حملے — جن کا آغاز اکتوبر ۱۹۱۱ء میں طرابلس کے نزدیک اطالوی لڑاکا طیاروں کے حملے سے ہوا — یوروپی ملک اپنی نوآبادیات پر کرتے چلے آ رہے تھے۔ برطانیہ کی جن نوآبادیوں میں زیادہ شورش برپا تھی وہاں ان حملوں کو، جنھیں "ایر کنٹرول آپریشن" کا نام دیا جاتا تھا، امن و اماں قائم رکھنے کے لیے کثیر زمینی فوج رکھنے کا ایک ارزاں اور قابل ترجیح متبادل سمجھا جاتا تھا۔ ان نوآبادیات میں سے ایک عراق تھا جو (فلسطین کے ساتھ) پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کی شکست و ریخت ہونے پر مال غنیمت کے طور پر برطانیہ کے قبضے میں آیا تھا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیانی عرصے میں تازہ قائم شدہ رائل ایرفورس عراقی دیہاتوں کو، عموماً دور افتادہ علاقوں میں، متواتر نشانہ بناتی رہی جہاں باغی مقامی باشندوں کے پناہ حاصل کرنے کا امکان تھا۔ ان حملوں کی حکمت عملی، جیسا کہ رائل ایرفورس کے ایک ونگ کمانڈر نے بیان کیا، یہ تھی کہ "مکانوں، مکینوں، کھیتوں اور مویشیوں پر مسلسل، دن رات" بمباری کی جاتی رہے۔

۱۹۳۰ء کے عشرے میں رائے عامہ جس بات سے دہشت میں مبتلا ہوئی وہ یہ تھی کہ ہوائی بمباری سے شہریوں کا قتل عام اسپین میں ہو رہا تھا۔ اس قسم کی چیزیں "یہاں" پیش نہیں آنی چاہئیں۔ جیسا کہ ڈیوڈ ریف (David Rieff) نے نشان دہی کی ہے، اسی قسم کے احساس نے ۱۹۹۰ء کے عشرے میں بوسنیا میں سربوں کے کیے ہوئے مظالم کی طرف توجہ مبذول کرائی جن میں جنگ کے اوائلی دنوں میں اومارسکا کے ہلاکت کیمپوں سے لے کر سربرینیکا میں ہونے والا قتل عام تک شامل تھا۔ موخر الذکر واقعے میں، جب اقوام متحدہ کی حفاظتی فوج کی ولندیزی بٹالین نے شہر کا پہرہ چھوڑ کر اسے جنرل راتکو ملاڈک کے حوالے کیا، اس کی تمام مردانہ آبادی کو جو فرار نہیں ہو سکی تھی (یعنی آٹھ ہزار سے زیادہ مردوں اور نوعمر لڑکوں کو) ایک جگہ جمع کر کے فائرنگ سے ہلاک کیا گیا اور اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔ اس سے پیدا ہونے والا احساس، ڈیوڈ ریف کے مطابق، کچھ یہ تھا ایسی چیزیں یہاں، یوروپ میں، "اب مزید" نہیں ہونی چاہییں۔

اب بھی سراسیمگی کا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں لگتا کہ اس نے آنکھوں پر پڑتی ہوئی سورج کی شعاعوں کے باعث آنکھیں بھینچ رکھی ہیں؟)

جو فوٹوگراف ورجینیا وولف کو موصول ہوئے، انھیں جنگ کی طرف کھلنے والی کھڑکی، یعنی اپنے موضوع کے شفاف مناظر، کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ وولف کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ ان میں سے ہر تصویر کا ایک "مصنف" ہے — یعنی یہ تصویریں "کسی شخص" کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہیں — حالانکہ ۱۹۳۰ء کے عشرے کے آخری چند برس ہی وہ زمانہ تھا جب کیمرے کی مدد سے جنگ اور جنگ میں ڈھائے جانے والے مظالم کی انفرادی گواہی دینے کا پیشہ وجود میں لایا گیا۔ ایک وقت تھا جب جنگ کے فوٹوگراف زیادہ تر روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں میں چھپتے تھے۔ (اخباروں میں فوٹوگراف شائع ہونے کا آغاز ۱۸۸۰ء میں ہوا تھا۔) بعد میں "نیشنل جیوگرافک" اور *Berliner Illustrierte Zeitung* جیسے جریدوں کے ساتھ ساتھ، جو کیمرے سے کھینچی گئی تصویروں کو السٹریشن کے طور پر شائع کرتے تھے، کثیرالاشاعت ہفتہ وار رسالوں کا آغاز ہوا، جن میں فرانس سے جاری ہونے والا رسالہ *Vu* (۱۹۲۹ء)، امریکہ کا *Life* (۱۹۳۶ء)، اور برطانیہ کا *Picture Post* (۱۹۳۸ء) نمایاں تھے، جو مکمل طور پر تصویروں (اور تصویروں کے ساتھ درج مختصر عبارتوں) اور "تصویری کہانیوں" پر مشتمل ہوتے تھے جن میں کم از کم چار پانچ سلسلہ وار تصویروں سے کوئی کہانی بیان کی جاتی تھی اور اس کے بعد آنے والی بیانیہ کہانی ان مناظر کے ڈرامائی اثر کو اور زیادہ ابھارتی تھی۔ اس کے برعکس اخباروں میں تصویر — صرف ایک تصویر — کسی خبری کہانی کے ساتھ شائع ہوتی تھی۔

مزید یہ کہ اخبار میں شائع ہونے والی کسی جنگ کی تصویر کے اردگرد الفاظ کا گھیرا ہوتا تھا (یعنی جس مضمون کی السٹریشن کے طور پر یہ تصویر شائع ہوتی تھی وہ اور دوسرے مضامین)۔ ان تصویری رسالوں میں زیادہ تر اس کی مسابقت کسی اور تصویر سے ہوتی تھی جو کچھ اور کہہ رہی یا بیچ رہی ہوتی تھی۔ جب کاپا (Capa) کی مشہور تصویر، جس میں ایک ریپبلکن فوجی کو موت کے لمحے میں دکھایا گیا ہے، "لائف" رسالے کے ۱۲ جولائی ۱۹۳۷ء کے شمارے میں داہنے ہاتھ کے پورے صفحے پر شائع ہوئی تو اس کے برابر والے صفحے پر مردانہ ہیر کریم Vitalis کا پورے صفحے کا اشتہار چھپا ہوا تھا جس میں ایک چھوٹی تصویر میں ایک شخص کو ٹینس کھیلتے اور بڑے پورٹریٹ میں اسی شخص کو سفید ڈنر جیکٹ میں ملبوس دکھایا گیا

تھا اور اس کے درست مانگ نکالے ہوئے بال قرینے سے سنورے ہوئے جگمگا رہے تھے۔* یہ آمنے سامنے کے صفحے — جن میں سے ہر ایک پر کیمرے کا مخصوص استعمال یہ فرض کیے ہوئے ہے کہ مقابل کے صفحے پر دوسری تصویر نظر نہیں آ رہی — اب نہ صرف بے ڈھنگے معلوم ہوتے ہیں بلکہ عجیب طور سے کسی گئے گزرے دور سے متعلق لگتے ہیں۔

ایسے نظام میں جو مناظر کی کثیر ترین پیداوار اور ترسیل پر بنیاد رکھتا ہو، گواہی دینے کا عمل ایسے ممتاز ترین گواہوں کا تقاضا کرتا ہے جو اہم، مضطرب کن تصویریں کھینچ کر لانے کے سلسلے میں اپنی دلیری اور جوش و خروش کی زبردست شہرت رکھتے ہوں۔ "پکچر پوسٹ" کے اولین شماروں میں سے ایک (۳ دسمبر ۱۹۳۸ء) میں کاپا کی کھینچی ہوئی اسپانوی خانہ جنگی کی تصویروں کا ایک پورٹ فولیو شائع کیا گیا، اور اس شمارے کے سرورق پر اس خوبرو فوٹوگرافر کا ہیڈ شاٹ چھاپا گیا جس میں اسے پروفائل میں اپنی آنکھ سے کیمرا لگائے دکھایا گیا تھا، اور اس کے ساتھ یہ عبارت درج تھی "دنیا کا عظیم ترین جنگی فوٹوگرافر: رابرٹ کاپا"۔ جنگ پر نکلنے کا وہ گلیمر جو جنگ مخالف گروہ میں اس وقت تک باقی تھا، جنگی فوٹوگرافروں کو ورثے میں ملا، خصوصاً اس وقت جب یہ احساس پیدا ہوا کہ جنگ ان نادر تنازعوں میں سے ہے جب آدمی کے ضمیر کو کسی فریق کا ساتھ دینے کے فیصلے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ (تقریباً ساٹھ برس بعد بوسنیا کی جنگ نے ان خبرنگاروں میں اس سے ملتا جلتا جوش و خروش پیدا کیا جنھوں نے محصور شہر سرائیوو میں کچھ وقت گزارا۔) اور ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ کے برعکس جو، جنگ کے بہت سے فاتحین کے خیال میں بھی، ایک زبردست غلطی تھی، دوسری "عالمی جنگ" جیتنے والوں کو ایک ضروری جنگ محسوس ہوئی، ایک ایسی جنگ جسے لڑا جانا لازمی تھا۔

تصویری صحافت (photojournalism) نے اپنے قدم ۱۹۳۰ء کے عشرے میں — یعنی

---

* کاپا کی یہ مذکورہ تصویر، جسے اس وقت تک خاصا سراہا جا چکا تھا، خود اس کے بیان کے مطابق ۵ ستمبر ۱۹۳۶ء کو کھینچی گئی تھی اور پہلی بار ۲۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو Vu رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے اسی زاویے سے اور اسی روشنی میں کھینچی ہوئی ایک اور تصویر تھی جس میں اسی پہاڑی کے اسی مقام پر ایک اور ریپبلکن فوجی کو اس حالت میں گرتے ہوئے دکھایا گیا تھا کہ اس کی رائفل اس کے داہنے ہاتھ سے چھوٹ کر گر رہی تھی۔ یہ دوسری تصویر کبھی دوبارہ شائع نہیں کی گئی۔ پہلی تصویر کچھ عرصے بعد ایک اخبار Paris-Soir میں بھی شائع کی گئی۔

جنگ کے زمانے میں — مضبوطی سے جمائے۔ یہ جنگ، جو جدید دور کی سب سے کم متنازعہ جنگ تھی، جس کے مبنی برانصاف ہونے پر ۱۹۴۵ء میں نازی شر کے مکمل انکشاف نے تصدیق کی مہر ثبت کر دی، تصویری صحافیوں کے لیے ایک نیا جائز مقام پیدا کر دیا، ایک ایسا مقام جو بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ان منحرفین کو حاصل نہیں تھا جنھوں نے ان دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں کیمرے سے کھینچی گئی تصویروں کو سنجیدگی سے استعمال کیا تھا: ان لوگوں میں "جنگ کے خلاف جنگ!" کا مصنف فریڈرخ بھی شامل تھا اور اپنی اولین تصویروں کا خالق رابرٹ کاپا بھی جو سیاسی طور پر وابستہ فوٹوگرافروں کی اس نسل کا محبوب ترین شخص تھا جو جنگ اور اس کا شکار ہونے والوں کو اپنے کام کا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ اس نئے مین اسٹریم روشن خیال اتفاق رائے کے ابھرنے کے بعد جس کی رو سے شدید سماجی مسائل قابل حل سمجھے جاتے تھے، فوٹوگرافر کے روزگار اور آزادی کے سوالات نے نمایاں اہمیت حاصل کر لی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ کاپا نے، اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر جن میں چم اور آنری کارتیئر بریسوں (Henri Cartuer-Bresson) بھی شامل تھے، ۱۹۴۷ء میں پیرس میں میگنم فوٹو ایجنسی کے نام سے ایک کوآپریٹو کی بنیاد رکھی۔ میگنم — جس نے بہت تیزی سے تصویری صحافیوں کے سب سے زیادہ موثر اور باوقار اتحاد کی حیثیت حاصل کر لی — کے قیام کا فوری مقصد عملی نوعیت کا تھا، یعنی یہ کہ ان تصویری رسالوں کے روبرو فری لانس فوٹوگرافروں کی نمائندگی کی جائے جو ان کو مختلف اسائنمنٹس پر بھیجتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ میگنم کے چارٹر میں، جو جنگ کے فوری بعد قائم کی جانے والی نئی بین الاقوامی تنظیموں اور ایجنسیوں کے چارٹروں کی طرح اخلاقی رنگ رکھتا تھا، تصویری صحافیوں کے لیے ایک وسیع تر، اخلاقی وژن کے حامل مشن کا بھی اعلان کیا گیا۔ ہر قسم کے شاونسٹ تعصبات سے آزاد ہو کر، منصف مزاج گواہوں کے طور پر اپنے دور کی روداد تیار کرنا، خواہ وہ دور جنگ کا ہو یا امن کا۔

میگنم کی آواز میں فوٹوگرافی نے اپنے عالمی منصوبے کا اعلان کیا۔ فوٹوگرافر کی قومیت اور قومی صحافیانہ وابستگی، اصولی طور پر، غیر اہم قرار پائی۔ فوٹوگرافر کہیں کا بھی ہو سکتا تھا۔ اور اس کا خاص موضوع (beat) "دنیا" تھی۔ فوٹوگرافر ایک سیلانی تھا جسے جنگوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی (کیونکہ بہت سی جنگیں جاری تھیں) اور محاذِ جنگ اس کی پسندیدہ منزل تھی۔

لیکن جنگ کی یاد، کسی بھی اور یاد کی طرح، بیشتر مقامی نوعیت کی ہوتی ہے۔ آرمینی باشندے، جن کی اکثریت جلاوطن ہے، آرمینیوں کے ۱۹۱۵ء کے قتلِ عام کی یاد کو زندہ رکھے ہوئے ہیں؛ یونان کے لوگ یونان کی اس خوں آشام خانہ جنگی کو نہیں بھولتے جو ۱۹۴۰ء کے عشرے کے آخری برسوں میں جاری رہی۔ لیکن کسی جنگ کے اپنے گرد و پیش سے بلند ہو کر بین الاقوامی توجہ کا مرکز بننے کے لیے ضروری ہے کہ اسے کسی نہ کسی طرح استثنائی حیثیت میں دیکھا جا رہا ہو، جیسا کہ جنگوں کو دیکھا جاتا ہے، اور جو متحارب فریقین کے متصادم مفادات سے بڑھ کر کسی چیز کی نمائندگی کرتی ہو۔ بیشتر جنگیں یہ مطلوبہ وسیع تر مفہوم حاصل نہیں کر پاتیں۔ اس کی ایک مثال: چاکو (Chaco) کی جنگ (۱۹۳۲-۳۵ء)، ایک ایسی قصابیت جس میں بولیویا (آبادی دس لاکھ) اور پیراگوے (آبادی ۳۵ لاکھ) نے حصہ لیا اور جس میں ایک لاکھ فوجی ہلاک ہوئے۔ اس جنگ کو جرمن تصویری صحافی ولی روگے (Willie Ruge) نے کور کیا جس کی نہایت عمدہ کلوز اپ تصویریں اس جنگ کی طرح بھلائی جا چکی ہیں۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے عشرے کے نصف آخر میں پیش آنے والی اسپانوی خانہ جنگی، ۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط میں ہونے والی بوسنیا کے خلاف سربوں اور کروٹوں کی جنگیں، اور ۲۰۰۰ء میں یکا یک شدید ہو جانے والا فلسطینی اسرائیلی تنازعہ — ان سب کو بہت سے کیمروں کی یقینی توجہ حاصل ہوئی کیونکہ ان میں وسیع تر جدوجہد کے معنی موجود تھے: اسپانوی خانہ جنگی اس لیے کہ اس میں فاشزم کے خطرے کے خلاف موقف اختیار کیا گیا تھا، اور اس لیے بھی (یہ بعد میں دیکھنے پر معلوم ہوا) کہ وہ آئندہ پیش آنے والی یورپی یا "عالمی" جنگوں کے لیے ایک طرح کی ڈریس ریہرسل تھی؛ بوسنیا کی جنگ اس لیے کہ اس میں جنوبی یورپ کے ایک ملک نے، جو اپنی آزادی اور اپنا کثیر ثقافتی رنگ برقرار رکھنا چاہتا تھا، اس خطے کی بالادست طاقت اور اس کے نسلی صفائی کے قسطائی پروگرام کے خلاف سرحمتی موقف اختیار کیا؛ اور جن علاقوں پر اسرائیلی یہودیوں اور فلسطینیوں دونوں کا دعویٰ ہے، ان کے کردار اور اندازِ حکمرانی کے سوال پر اب تک جاری تنازعہ کئی نازک نکات کی وجہ سے، جن میں یہودیوں کی قدیم شہرت یا بدنامی، نازیوں کے ہاتھوں یورپی یہودیوں کے قتلِ عام کی منفرد گونج، اسرائیل کو امریکہ کی طرف سے ملنے والی خصوصی حمایت، اور اسرائیل کو ایک نسلی امتیاز کے حامل اور ۱۹۶۷ء کی جنگ میں فتح کیے ہوئے علاقوں پر وحشیانہ طور پر قابض ملک کے طور پر شناخت کیا جانا شامل ہیں۔ اس دوران میں ان سے کہیں زیادہ ظالمانہ

جنگیں پیش آئی ہیں جن میں شہریوں کو ہوائی بمباری اور زمینی قتل عام کے ذریعے بڑی تعداد میں ہلاک کیا گیا ہے (سوڈان میں کئی عشروں سے جاری خانہ جنگی، کردوں کے خلاف عراقی مہم، چیچنیا پر روسی حملہ اور قبضہ) جن کی تصویریں نسبتاً بہت کم سامنے آئی ہیں۔

۱۹۵۰ء، ۱۹۶۰ء کے عشروں اور ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائلی برسوں میں پیش آنے والے جن مصائب کی قابلِ تعریف فوٹوگرافروں نے یادگار انداز میں تصویرکشی کی تھی — مثلاً ورنر بشوف (Werner Bischof) کی کھینچی ہوئی ہندوستان میں قحط کا شکار ہونے والوں کی تصویریں، ڈون میکیولن (Don McCullin) کی کھینچی ہوئی بیافرا میں جنگ اور قحط کا نشانہ بننے والوں کی تصویریں، ڈبلیو یوجین سمتھ (W. Eugene Smith) کی کھینچی ہوئی جاپانی ماہی گیر دیہات میں ہلاکت خیز آلودگی کے متاثرین کی تصویریں — وہ زیادہ تر ایشیا اور افریقہ میں رونما ہوئے تھے۔ ہندوستانی اور افریقی قحط محض ''قدرتی'' آفات نہیں تھے؛ انھیں پیش آنے سے روکا جا سکتا تھا؛ وہ بہت بڑے پیمانے پر کیے گئے جرائم تھے۔ اور میناماتا (جاپان) میں جو کچھ ہوا وہ تو واضح طور پر ایک جرم تھا؛ چیسو کارپوریشن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ جاپانی خلیج میں پارے سے آلودہ فضلہ ڈال رہی ہے۔ (یہ تصویریں کھینچنے کے ایک سال بعد چیسو کارپوریشن کے غنڈوں نے، جنھیں سمتھ کی تصویری تفتیش کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینے کے احکام دیے گئے تھے، اس پر حملہ کر کے اسے شدید اور مستقل طور پر زخمی کر ڈالا۔) لیکن جنگ سب سے بڑا جرم ہے، اور ۱۹۶۰ء کے عشرے کے وسط سے لے کر اب تک جنگوں کی کوریج کرنے والے مشہور ترین فوٹوگرافروں میں سے بیشتر یہ سمجھتے آئے ہیں کہ ان کا کام جنگ کا ''اصل'' چہرہ دکھانا ہے۔ تشدد کا نشانہ بننے والے ویت نامی دیہاتیوں اور جراً بھرتی کیے گئے زخمی امریکی سپاہیوں کی تصویروں نے، جو ۱۹۶۲ء کے بعد لیری بروز (Larry Burroughs) نے کھینچیں اور ''لائف'' رسالے نے شائع کیں، ویت نام میں امریکی موجودگی کے خلاف احتجاج کو یقیناً بہت تقویت دی۔ (بروز ۱۹۷۱ء میں، چار دوسرے فوٹوگرافروں کے ساتھ، اس وقت مارا گیا جب وہ سب ایک امریکی فوجی ہیلی کاپٹر پر سوار لاؤس میں واقع ہو چی منھ ٹریل کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ ''لائف'' رسالہ بھی ۱۹۷۲ء میں بند ہو گیا جس سے ان بہت سے لوگوں کو، جن میں میں بھی شامل تھی، سخت مایوسی ہوئی جنھوں نے اس میں چھپنے والی جنگ اور آرٹ کی تصویروں پر پرورش اور تعلیم پائی تھی۔) بروز پہلا اہم

Scanned with CamScanner

فوٹوگرافر تھا جس نے کسی پوری جنگ کی کوریج رنگین تصویروں میں کی، جو حقیقت سے مماثلت، یعنی صدمہ انگیزی، کی جانب ایک اور قدم تھا۔ موجودہ سیاسی موڈ میں، جو کئی عشروں بعد فوج کے حق میں دوستانہ ہے، کھُلی آنکھوں والے شوربخت امریکی فوجیوں کی تصویریں، جو کبھی فوج کشی اور سامراجیت کے خلاف بغاوت کا سبق دیتی تھیں، آج مثبت طور پر متاثر کن معلوم ہو سکتی ہیں۔ ان کا نظرثانی شدہ موضوع یہ ہے عام امریکی نوجوان، جو ناپسندیدہ ناگوار لیکن قابلِ فخر کردار انجام دے رہے ہیں۔

یوروپ کو چھوڑ کر، جسے اس امر میں استثنیٰ حاصل ہے کہ اس نے جنگ آزمائی کا انتخاب نہ کرنے کے حق کا دعویٰ کیا ہے، یہ بات ہمیشہ کی طرح آج بھی سچ ہے کہ حکومتیں جنگ چھیڑنے یا جاری رکھنے کا جو بھی جواز پیش کریں گی، بیشتر لوگ اس پر کوئی سوال نہیں اٹھائیں گے۔ کسی جنگ کے حقیقی معنوں میں غیر مقبول ہو جانے کے لیے بہت خاص قسم کے حالات درکار ہوتے ہیں۔ (خود اپنے مارے جانے کا خطرہ لازمی طور پر ان حالات میں شامل نہیں ہوتا۔) جب جنگ واقعی غیر مقبول ہوتی ہے تب فوٹوگرافروں کے جمع کیے ہوئے یہ تمام مناظر، جو ان کے خیال میں تنازعے کی پردہ کشائی کرتے ہیں، بہت کام آتے ہیں۔ لیکن جب جنگ کے خلاف احتجاج غیر موجود ہو تب یہی جنگ مخالف تصویریں اس انداز میں پڑھی جا سکتی ہیں کہ ان میں ایک ایسی ناگزیر جدوجہد کے مقابل جس کا خاتمہ صرف فتح یا شکست پر ممکن ہے، سورمائی، قابلِ تعریف سورمائی، یا رقت آفرینی کی عکاسی کی گئی ہے۔ فوٹوگرافر کا منشا اس کی کھینچی ہوئی تصویر کے معنی متعین نہیں کرتا: یہ معنی خود اپنی زندگی رکھتے ہیں، جس کی بنیاد لوگوں کے ان گروہوں کی مرضی اور عقیدے پر ہوتی ہے جو ان تصویروں کو استعمال کرتے ہیں۔

۳

مصائب کے خلاف احتجاج کرنے کا، ان کے وجود کا اعتراف کرنے سے ہٹ کر، کیا مطلب ہے؟

مصائب کو مرقعوں کی شکل دینے کا عمل اپنی طویل تاریخ رکھتا ہے۔ اکثر صورتوں میں فنی پیش کش کے قابل وہ مصائب سمجھے جاتے ہیں جنھیں قدرتی یا انسانی غضب ناکی کی پیداوار خیال کیا جاتا ہے۔ (قدرتی اسباب سے ہونے والی تکالیف، مثلاً بیماری یا زچگی، کو آرٹ کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی نمائندگی

Scanned with CamScanner

حاصل ہوئی ہے؛ حادثوں کے سبب ہونے والے مصائب کو تقریباً بالکل نہیں — جیسے غلطی یا سوئے اتفاق کے نتیجے میں ہونے والی تکلیف کا وجود ہی نہ ہو۔) اذیت میں تڑپتے ہوئے لاؤکون (Laocoon) اور اس کے بیٹوں کے اجتماعی مجسمے، پینٹنگز اور مجسموں کی شکل میں یسوع مسیح کے مصائب کے بے شمار روپ؛ مسیحی ولیوں کے شہید کیے جانے کے عفریتی منظروں کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ — ان سب کا مقصد بلاشبہ جذبے اور اشتعال کو تحریک دینا، اور ہدایت اور مثال فراہم کرنا ہے۔ دیکھنے والا اذیت اٹھانے والے کی تکلیف پر رنج کر سکتا ہے — اور مسیحی ولیوں کے سلسلے میں مثالی عقیدے اور ثابت قدمی سے اثر قبول کر سکتا ہے — لیکن یہ سب مصیبتیں ملامت یا کرنے یا سوال اٹھائے جانے سے ماوراہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسی تصویروں کی طلب جن میں انسانی جسموں کو اذیت میں دکھایا گیا ہو، کم وبیش اتنی ہی شدید ہے جتنی اس تصویروں کی خواہش جن میں انسانی جسموں کو برہنہ دکھایا گیا ہو۔ صدیوں تک مسیحی آرٹ میں دکھائے گئے دوزخ کے مناظر ان دونوں ضرورتوں کی تسکین کرتے رہے۔ بعض موقعوں پر اس کا جواز انجیل میں سرقلم کیے جانے کے واقعات (ہولوفرنس، یوحنا باپتیسمہ) یا قتل عام کے قصوں (نوزائیدہ عبرانی بچوں کے قتل، گیارہ ہزار دوشیزاؤں کے قتل، یا ایسی ہی کسی کہانی) سے پیش کیا جاتا، جسے حقیقی تاریخی واقعے اور ناتغیر پذیر تقدیر کا درجہ دیا جاتا تھا۔ قدیم کلاسیکوں میں دکھائے گئے سفاکی کے مناظر کا بھی ذخیرہ موجود تھا جنھیں نگاہ بھر کر دیکھنا دشوار تھا — پیگن زمانے کے اساطیر، مسیحی قصوں سے کہیں زیادہ، دونوں قسم کے مذاق کی تسکین کا سامان رکھتے ہیں۔ ان سفاکیوں کے مناظر کے ساتھ کسی قسم کا اخلاقی جواز بھی وابستہ نہیں ہے۔ محض اشتعال انگیزی: کیا آپ اسے دیکھ سکتے ہیں؟! ایک طرف اس بات کی تسکین ہے کہ ہم اسے جھجکے بغیر دیکھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف منھ پھیر لینے کی لذت ہے۔

گولزیوس (Goltzius) کی تخلیق "اژدہا کیڈمس کے ساتھیوں کو کھا رہا ہے" (۱۵۸۸ء) کے منظر کو دیکھ کر کانپ اٹھنا جس میں ایک شخص کا چہرہ چبایا جا رہا ہے، اس لرزے سے بہت مختلف ہے جو پہلی جنگ عظیم کے سابق سپاہی کی تصویر دیکھ کر طاری ہوتا ہے جس کا چہرہ گولی کی زد میں آ کر اڑ گیا۔ ایک وہ دہشت ہے جس کا منبع ایک پیچیدہ موضوع میں ہے — یعنی ایک لینڈ سکیپ میں دکھائی گئی شبیہیں، جن سے فنکار کے مشاہدے اور ہنرمندی کی قوت ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرا ایک کیمرے کا ریکارڈ کیا ہوا منظر

ہے جس میں، بہت نزدیک سے، ایک سچ مچ کے انسان کے جسم کو ناقابل بیان ہولناکی کے ساتھ مسخ ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے، بس، اور کچھ نہیں۔ تخیل کی ایجاد کردہ ہولناکی بہت ناقابل برداشت ہو سکتی ہے۔ (جیسے، مثال کے طور پر مجھے، ٹیشیان کی اس عظیم پینٹنگ کو، یا اس موضوع پر بنائی گئی کسی اور پینٹنگ کو، دیکھنا سخت دشوار معلوم ہوتا ہے جس میں مارسیاس کی کھال اتارے جانے کا منظر دکھایا گیا ہے۔) لیکن کسی حقیقی ہولناکی کو قریب سے دیکھنے سے صدمے کے ساتھ ساتھ شرمندگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کی انتہائی درجے کی اذیت کے مناظر پر نگاہ ڈالنے کا حق شاید صرف ایسے لوگوں کو ہے جو اس کے ازالے کے لیے کچھ کرنے کی قدرت رکھتے ہوں — مثلاً اس فوجی ہسپتال کے سرجنوں کو جہاں یہ تصویر کھینچی گئی — یا ان لوگوں کو جو اس سے کچھ سبق سیکھ سکیں۔ ان کے علاوہ ہم سب محض نظرباز ہیں، چاہے ہماری نیت نظربازی کی ہو یا نہ ہو۔

ان میں سے ہر مثال میں بھیانک منظر ہمیں یا تو تماش بین بننے کی دعوت دیتا ہے، یا بزدلی کا اعتراف کرنے کی، کہ ہم میں اس کو دیکھنے کی جرأت نہیں۔ جو لوگ اسے دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ ایک ایسا کردار ادا کرتے ہیں جو اذیت کے مناظر دکھانے والے بہت سے شاہکاروں کا منظور کردہ ہے۔ اذیت کو، جو آرٹ کا ایک بنیادی (canonical) موضوع ہے، پینٹنگ میں عموماً ایک نظارے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جسے [پینٹنگ میں موجود] کچھ لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں، یا نظرانداز کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کا مقدر مفہوم یہ ہے: نہیں، اسے روکا نہیں جا سکتا — اور متوجہ اور غیر متوجہ تماش بینوں کی بیک وقت موجودگی اس مفہوم کی تصدیق کرتی ہے۔ سفاکی کا شکار ہونے والوں کی اذیت کو اس طرح دکھایا جانا کہ دیکھنے والے اس پر ملامت کریں اور ممکن ہو تو اسے روکیں، یہ عمل منظرکشی کی تاریخ میں ایک مخصوص موضوع کے ساتھ داخل ہوتا ہے: قتل و غارت کرتی ہوئی فاتح فوج کے ہاتھوں شہری آبادی پر ڈھائی جانے والی اذیتیں۔ یہ ایک بنیادی طور پر سیکولر موضوع ہے، جس کا آغاز سترھویں صدی میں اس وقت ہوا جب اقتدار کی معاصر صف بندی فنکاروں کا موضوع بنی۔ ۱۶۳۳ء میں ژاک کالو (Jacques Callot) نے اٹھارہ اچنگز پر مشتمل مجموعہ *The Miseries and Misfortunes of War* کے عنوان سے شائع کیا، جن میں ۱۶۳۰ء کے عشرے میں اس کے آبائی وطن لورین پر فرانسیسی فوج کے حملے اور قبضے کے دوران شہریوں پر کیے جانے والے مظالم دکھائے گئے

Scanned with CamScanner

تھے۔(اسی موضوع پر چھ چھوٹی اچنگز جو کالو نے بڑی اچنگز کا مجموعہ تیار کرنے سے پہلے بنائی تھیں، ۱۶۳۵ء میں شائع ہوئیں، یعنی اس سال جب کالو کی وفات ہوئی۔) ان میں دکھایا گیا منظر وسیع اور گہرا ہے: کئی بڑے بڑے مناظر میں بہت سی شکلیں نظر آتی ہیں، منظر تاریخ سے لیے گئے ہیں، اور ان میں دکھائے گئے مختلف مظالم اور سفاکیوں پر منظوم تبصروں کو عنوان کے طور پر درج کیا گیا ہے کالو اپنی تصویر کشی کا آغاز فوجیوں کی بھرتی کے منظر سے کرتا ہے؛ پھر شدید مبارزت، قتل عام، تاراجی اور زنا بالجبر کو نظروں کے سامنے لاتا ہے، ایذا رسانی اور سزائے موت کے طریقوں (بلند مقام سے دی جانے والی پھانسی، درختوں سے لٹکایا جانا، فائرنگ اسکواڈ، زندہ جلایا جانا، پہیے سے کچلا جانا) کی عکاسی کرتا ہے؛ کسانوں کو فوجیوں سے انتقام لیتے دکھاتا ہے' اور آخر میں انعامات کی تقسیم کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک کے بعد ایک آنے والے نقش میں فاتح فوج کی سفاکی کے جو مناظر دکھائے گئے ہیں وہ نہایت چونکانے والے ہیں اور اس سے پہلے ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن فرانسیسی سپاہی محض تشدد کے اس جشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے مجرم ہیں، اور کالو کے مسیحی انسانیت پسند طرز احساس میں نہ صرف لورین کی آزاد ریاست (Duchy) کے خاتمے کے سوگ کی گنجائش موجود ہے بلکہ جنگ کے بعد اُنھی سپاہیوں کی حالت زار کو محفوظ کرنے کی بھی جنھیں سڑک کے کنارے بیٹھ کر بھیک مانگتے دکھایا گیا ہے۔

کالو کے کئی پیرو سامنے آئے، مثلاً ہانس اُلرخ فرانک (Hans Ulrich Franck)، جس نے ۱۶۴۳ء میں، یعنی تیس سالہ جنگ کے انجام کے قریب، اچنگز بنانے کا سلسلہ شروع کیا جو اپنے مکمل ہونے تک (یعنی ۱۶۵۶ء تک) چوبیس کی تعداد تک پہنچا، اور جس میں سپاہیوں کے ہاتھوں کسانوں کو قتل ہوتے دکھایا گیا تھا۔ لیکن جنگ کی ہولناکیوں اور سپاہیوں کی سفاکیوں پر توجہ مرکوز کرنے کا عمل انیسویں صدی کے اوائل میں گویا (Goya) کی مصوری میں انتہا کو پہنچا۔ *The Disasters of War* کے عنوان سے ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۰ء کے درمیان بنائی گئی تراسی نمبر وار اچنگز میں (جو پہلی بار، تین اچنگز کو چھوڑ کر، ۱۸۶۳ء میں یعنی گویا کی موت کے پینتیس برس بعد شائع ہوئیں) نپولین کے سپاہیوں کے کیے ہوئے مظالم کی تصویر کشی کی گئی ہے جو انھوں نے ۱۸۰۸ء میں اسپین میں فرانسیسی حکمرانی کے خلاف اٹھنے والی بغاوت کو کچلنے کے سلسلے میں کیے تھے۔ گویا کے نقش کیے ہوئے منظر دیکھنے والے کو ہولناکی کے بہت قریب لے آتے ہیں۔ ان مناظر کی شان و شوکت کا ہر شائبہ بالکل مٹا دیا گیا ہے: لینڈ سکیپ محض ایک

Scanned with CamScanner

فضا ہے، ایک تاریکی جسے بہت ہلکے سے خاکے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جنگ کوئی شان دار منظر نہیں۔ اور گویا کا بنایا ہوا پرنٹس کا سلسلہ کوئی کہانی بیان نہیں کرتا۔ ہر نقش، جس کے نیچے دیے گئے مختصر عنوان میں حملہ آوروں کی کینہ پروری اور ان کے کیے ہوئے مظالم کے بہیمانہ پن کو ظاہر کیا گیا ہے، دوسرے نقش سے الگ، تنہا دکھائی دیتا ہے۔ اور ان تمام مناظر کا مجموعی اثر نہایت تباہ کن ہے۔

گویا کے The Disasters of War میں دکھائی گئے منظروں کا مقصد دیکھنے والے کو جگانا، صدمہ پہنچانا، زخمی کرنا ہے۔ گویا کا فن — دستوئیفسکی کے فن کی طرح، اتنا ہی عمیق، اتنا ہی اور بے جگل، اتنا ہی توجہ طلب — اخلاقی احساس اور ملال کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا کے ساتھ، اذیت پر ہونے والے ردِعمل کا ایک نیا معیار آرٹ میں داخل ہوتا ہے۔ (اور اس کے ساتھ ہی رفاقت کے احساس سے متعلق نئے موضوعات بھی، مثلاً اس کی بنائی ہوئی وہ پینٹنگ جس میں ایک زخمی مزدور کو تعمیر کے مقام سے اٹھا کر لے جایا جا رہا ہے۔) جنگ کی سفاکیوں کا حال اس طرح نقش کیا گیا ہے کہ وہ دیکھنے والے کے احساس پر حملہ آور ہو۔ ہر نقش کے نیچے دیے گئے جاندار فقروں میں اسی اشتعال انگیزی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ایک طرف ہر منظر، کسی بھی اور منظر کی طرح، دیکھے جانے کی دعوت دیتا ہے؛ دوسری طرف اس کا عنوان، بیشتر صورتوں میں، ٹھیک اسی عمل کے دشوار ہونے پر زور دیتا ہے۔ ایک آواز، اغلباً فنکار کی اپنی آواز، دیکھنے والے پر طنز کرتی سنائی دیتی ہے: کیا تم اسے دیکھنا برداشت کر سکو گے؟ ایک منظر کا عنوان ہے: "اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔" ایک اور عنوان کہتا ہے: "یہ برا ہے۔" دوسرا عنوان جواب دیتا ہے: "یہ بدتر ہے۔" تیسرا عنوان چیختا ہے: "یہ بدترین ہے۔" ایک عنوان پکارتا ہے: "بربریت!" دوسرا جواباً چلاتا ہے "کیسا جنون!" ایک اور عنوان کہتا ہے: "یہ حد سے زیادہ ہے!" اور ایک عنوان ہے: "کیوں؟"

کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر کا عنوان روایتی طور پر غیر جانبدارانہ، اطلاعی ہوتا ہے: تاریخ، مقام، تصویر میں دکھائے گئے لوگوں کے نام۔ پہلی جنگ عظیم میں جائزہ لینے کی غرض سے کھینچی گئی ایک تصویر (وہ پہلی جنگ تھی جس میں کیمروں کو فوجی انٹیلی جنس کے لیے وسیع طور پر استعمال کیا گیا) کا یہ عنوان کہ "میں اسے تباہ کرنے کے لیے بے تاب ہوں!"، یا جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ایکسرے کا یہ عنوان کہ "مریض کی چال میں لنگڑاہٹ رہ جائے گی"، غیر اغلب معلوم ہوتا ہے۔ اور تصویر کے

Scanned with CamScanner

بارے میں فوٹوگرافر کی آواز بھی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے جو اس کے حقیقت پر مبنی ہونے کا یقین دلا رہی ہو، جیسے گویا اپنے بنائے ہوئے ایک منظر کے نیچے درج عنوان میں کہتا ہے "یہ میں نے خود دیکھا تھا"، اور دوسرے کے بارے میں "یہ سچ ہے!" یہ تو ظاہر ہی ہے کہ فوٹوگرافر نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور سوائے اس کے کہ تصویر میں کوئی تبدیلی کی گئی ہو، وہ سچ ہی ہوتی ہے۔

عام زبان میں ہاتھ سے بنائے گئے منظر، مثلاً گویا کی پینٹنگ، اور فوٹوگراف کے درمیان فرق کرنے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ فنکار ڈرائنگ یا پینٹنگ کو "بناتا" ہے جبکہ فوٹوگرافر تصویر "لیتا" ہے۔ لیکن فوٹوگرافک منظر، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ واحد عکس ہو جسے کئی تصویروں سے ملا کر تیار نہ کیا گیا ہو، کسی وقوعے کا محض شفاف بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمیشہ ایک ایسا منظر ہوتا ہے جسے کسی نے منتخب کیا؛ کیمرے سے تصویر کھینچنے کا مطلب فریم میں لانا ہے، اور کسی چیز کو فریم میں لانے کا مطلب باقی چیزوں کو فریم سے باہر رکھنا ہے۔ مزید یہ کہ تصویروں میں ردوبدل کرنے کا کام ڈیجیٹل فوٹوگرافی اور فوٹوشاپ کی ایجاد سے کہیں زیادہ پرانا ہے: فوٹوگراف کے لیے کسی وقوعے کی غلط عکاسی کرنا ہمیشہ ممکن رہا ہے۔ کسی پینٹنگ یا ڈرائنگ کو اس وقت جعلی قرار دیا جاتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اُس شخص کی بنائی ہوئی نہیں ہے جس سے اسے منسوب کیا جاتا ہے۔ کیمرے سے کھینچی گئی کوئی تصویر — یا ٹیلی وژن یا انٹرنیٹ پر دستیاب کوئی فلمی دستاویز — اس وقت جعلی قرار پاتی ہے جب وہ اس وقوعے کے بارے میں، جسے پیش کرنے کا وہ دعویٰ کرتی ہے، دیکھنے والے کو فریب دینے کی کوشش کرے۔

یہ بات کہ اسپین میں فرانسیسی فوجیوں کے ہاتھوں ہونے والے مظالم عین اس طرح پیش نہیں آئے تھے جیسے اچنگز میں دکھائے گئے ہیں — مثلاً مارے جانے والے کے خدوخال بالکل اس طرح کے نہیں تھے، یا یہ واقعہ درخت کے پاس نہیں ہوا تھا — گویا کی *The Disasters of War* کو کسی بھی طرح ناقص نہیں ٹھہرا سکتی۔ گویا کے بنائے ہوئے مناظر ایک ترکیب (synthesis) ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے: "اس جیسی" چیزیں پیش آئی تھیں۔ اس کے برعکس، کیمرے سے لی گئی تصویر یا فلم اسٹرپ ٹھیک اُس منظر کو پیش کرنے کی دعوے دار ہوتی ہے جو کیمرے کے عدسے کے سامنے تھا۔ فوٹوگراف سے کسی منظر کو ابھارنے کی نہیں بلکہ دکھانے کی توقع کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوٹوگراف، ہاتھ سے بنائے ہوئے منظروں کے برخلاف، شہادت کے طور پر قبول کیے جاتے ہیں۔ لیکن کس شے کی شہادت؟

Scanned with CamScanner

یہ شبہ کہ کاپا کی تصویر "ایک ریپبلکن سپاہی کی موت" — کاپا کے کام کے مستند مجموعے میں اس تصویر کا عنوان "گرتا ہوا سپاہی" ہے — وہ کچھ نہیں دکھاتی جو کہا جاتا ہے کہ اس میں دکھایا گیا ہے (ایک مفروضہ یہ ہے کہ اس میں محاذ جنگ کے نزدیک کی جانے والی کسی فوجی مشق کو ریکارڈ کیا گیا ہے) اب تک جنگی فوٹوگرافی کے بارے ہونے والے بحث مباحثے پر چھایا ہوا ہے۔ جب کیمرے سے کھینچی گئی تصویروں کی بات آتی ہے تو ہر شخص لغوی معنوں پر اصرار کرنے والا (literalist) بن جاتا ہے۔

❁

جنگ میں اٹھائی جانے والی اذیتوں کے مناظر آج اتنی بڑی تعداد میں نشر ہو چکے ہیں کہ یہ بات بھولنا بہت آسان ہے کہ کتنے کم عرصہ پہلے ان تصویروں نے وہ معیار متعین کیا تھا جس کی پابندی کی توقع اب ہر اہم فوٹوگرافر سے کی جاتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اول اول فوٹوگرافروں نے جنگ بازوں کے کاروبار کے زیادہ تر مثبت مناظر، اور جنگ شروع کرنے یا جاری رکھنے پر محسوس ہونے والے اطمینان کے مناظر پیش کیے تھے۔ اگر حکومتوں کے بس میں ہوتا تو جنگی فوٹوگرافی، جنگی نقش نگاری کی طرح، سپاہیوں کی قربانیوں کے لیے حمایت ابھارنے کا ذریعہ ہوتی۔

بلاشبہ جنگی فوٹوگرافی کا آغاز اسی مشن، اسی ذلت سے ہوا۔ یہ جنگ کریمیا کی جنگ تھی اور فوٹوگرافر راجر فینٹن (Roger Fenton)، جسے ہمیشہ پہلا جنگی فوٹوگرافر کہہ کر یاد کیا جاتا ہے، کسی بھی طرح جنگ کے "سرکاری" فوٹوگرافر سے کم نہ تھا، جسے اوائل ۱۸۵۵ء میں برطانوی حکومت نے پرنس البرٹ کی تحریک پر کریمیا بھیجا تھا۔ اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے کہ برطانوی فوجیوں کو درپیش غیر متوقع خطرات اور مصائب کے بارے میں گزشتہ برس بھیجی گئی اخباری رپورٹوں کا مقابلہ کیا جائے، حکومت نے اس معروف پیشہ ور فوٹوگرافر کو دعوت دی کہ وہ اس جنگ کا دوسرا، زیادہ مثبت رخ پیش کرے جو روز بروز غیر مقبول ہوتی جا رہی تھی۔

ایڈمنڈ گروس (Edmund Grosse) نے انیسویں صدی کے وسط کی انگلستانی بچپن کے زمانے کے بارے میں اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب *Father and Son* (۱۹۰۷ء) میں ذکر کیا ہے کہ جنگ کریمیا کس طرح اس کے نہایت جزرس طور پر پارسا، پلے متھ برادری نامی انجیلی فرقے سے وابستہ، اور دنیا سے زیادہ تعلق نہ رکھنے خاندان کی زندگی پر بھی اثر انداز ہونے لگی تھی:

روس کے ساتھ جنگ کے اعلان نے باہر کی دنیا کا پہلا جھونکا ہمارے گھر کے گھٹے ہوئے کالونسٹ (Calvinist) ماحول میں پہنچایا۔ میرے والدین ایک اخبار گھر میں لے کر آئے، جو انھوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا، اور قابلِ دید مقامات پر، جنھیں میں نے اور میرے باپ نے نقشے پر تلاش کر کے دیکھا، ہونے والے واقعات کا جوش و خروش سے ذکر ہونے لگا۔

جنگ سب سے زیدہ ناقابلِ مزاحمت — اور قابلِ دید — خبر تھی، اور اب تک ہے۔ (اس کا بے بہا متبادل بین الاقوامی اسپورٹس کی خبریں ہیں۔) لیکن یہ جنگ خبر سے بڑھ کر تھی۔ یہ بری خبر تھی۔ گروس کے والدین لندن کے جس مستند، بے تصویر اخبار سے متاثر ہوئے تھے وہ "دی ٹائمز" تھا، جس نے ملک کی فوجی قیادت پر شدید تنقید کی تھی کہ اس کی نااہلی جنگ کے جاری رہنے اور برطانوی باشندوں کی متواتر ہلاکت کا سبب بن رہی ہے۔ جنگی جھڑپوں کے سوا دوسرے اسباب سے ہلاک ہونے والے فوجیوں کی تعداد وحشت زدہ کر دینے والی تھی — بائیس ہزار بیماریوں سے مرے، ہزاروں کے اعضا سباستوپول کے طویل محاصرے کے دوران لمبے روسی جاڑوں میں پالا لگنے سے بیکار ہو گئے — اور اس کی کئی جنگی حکمتِ عملیاں تباہ کن ثابت ہوئی تھیں۔ جب فینٹن چار مہینے قیام کرنے کے لیے کریمیا پہنچا تب تک سردیاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اس کو معاہدے کی رو سے اپنی کھینچی ہوئی تصویریں (engravings کی شکل میں) نسبتاً کم معتبر اور کم نکتہ چیں اخبار *The Illustrated London News* میں شائع کرانی تھیں، پھر انھیں ایک گیلری میں نمائش کے لیے رکھنا تھا، اور پھر وطن لوٹ کر انھیں کتاب کی صورت میں بازار میں لانا تھا۔

ایک طرف محکمۂ جنگ کی ہدایات کے باعث کہ ہلاک اور زخمی ہونے والوں اور بیماروں کی تصویریں نہ کھینچی جائیں، اور دوسری طرف اس وجہ سے کہ تصویر لینے کے عمل کی زحمت طلب ٹیکنالوجی کے پیشِ نظر بیشتر دوسرے مناظر کی تصویر کھینچنا ممکن نہ تھا، فینٹن نے جنگ کو ایک پروقار مردانہ بیرونِ در تفریح کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ چونکہ ہر فوٹوگراف کو ڈارک روم میں الگ کیمیائی تیاری درکار ہوتی تھی، اور ایکسپوژر کی مدت بہت طویل یعنی پندرہ سیکنڈ ہوتی تھی، فینٹن کھلے آسمان تلے گپ شپ کرتے فوجی افسروں یا توپوں کی دیکھ بھال کرتے جوانوں کی تصویر اسی صورت میں کھینچ سکتا تھا کہ ان سے ایک ساتھ کھڑے یا بیٹھے رہنے، اس کی ہدایات پر عمل کرنے، اور ہلنے جلنے سے باز رہنے کی درخواست

کرے۔ اس کی کھینچی ہوئی تصویریں محاذ جنگ کی پہلی صف کے پیچھے کی فوجی زندگی کا ٹیبلو پیش کرتی ہیں، جبکہ جنگ — نقل وحرکت، بے ترتیبی، ڈراما — کیمرے کی زد سے باہر رہتی ہے۔ اس کی کریمیا میں کھینچی ہوئی واحد تصویر جس کی سطح اس موافق (benign) دستاویز سازی سے کسی قدر بلند ہے، ''موت کے سائے کی وادی'' کے عنوان والی تصویر ہے۔ یہ عنوان ایک طرف تو انجیلی مناجات نویس کی جانب سے ایک طرح کے دلاسے کی یاد جگاتا ہے اور دوسری طرف پچھلی اکتوبر کے اندوہناک واقعات کی جن میں چھ سو برطانوی سپاہیوں کو بلکلاوا کے اوپر کی سمت ایک میدان میں گھات لگا کر ہلاک کر دیا گیا تھا — ٹینی سن (Tennyson) نے اپنی یادگاری نظم The Charge of the Light Brigade میں اس مقام کو ''موت کی وادی'' کا نام دیا تھا۔ فینٹن کا یادگاری فوٹوگراف ایک عدم موجودگی کی تصویر ہے، جس میں موت دکھائی گئی ہے لیکن مرنے والوں کے بغیر۔ یہ اس کی کھینچی ہوئی واحد تصویر ہے جس کے لیے کچھ اسٹیج کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہوگی، کیونکہ اس میں صرف بکھرے ہوئے پتھروں اور توپ کے گولوں والی ایک چوڑی سڑک دکھائی گئی ہے جو ایک بنجر دائرہ نما میدان کے ساتھ ساتھ گھوم کر دور کے خالی پن میں غائب ہو رہی ہے۔

لڑائی کے بعد موت اور تباہی کے مناظر کا ایک نسبتاً زیادہ جرأت مندانہ پورٹ فولیو، جس میں نہ صرف برطانوی فوج کو ہونے والے نقصانات بلکہ برطانوی فوجی طاقت کے لرزہ خیز استعمال (exaction) کی بھی نشان دہی کی گئی تھی، کریمیا کے محاذ جنگ کا دورہ کرنے والے ایک اور فوٹوگرافر نے تیار کیا۔ فیلیس بیاتو (Felice Beato)، جو وینس میں پیدا ہوا اور بعد میں برطانوی شہریت حاصل کی، پہلا فوٹوگرافر تھا جس نے کئی جنگیں دیکھیں۔ ۱۸۵۵ء میں کریمیا کے محاذ پر موجود ہونے کے علاوہ، وہ ۵۸-۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں سپاہیوں کی بغاوت (جسے انگریز غدر کا نام دیتے ہیں)، ۱۸۶۰ء میں چین کی دوسری جنگِ افیون، اور ۱۸۸۵ء میں سوڈان کی نوآبادیاتی جنگوں میں موقعے پر موجود رہا۔ جب فینٹن نے ایک ایسی جنگ کے تسکین بخش مناظر تیار کیے جس میں برطانیہ کو بہت مشکل پیش آئی تھی، اس کے تین برس بعد بیاتو برطانوی فوج کے اپنے ماتحت مقامی سپاہیوں کی بغاوت کو (جو ہندوستان میں برطانوی تسلط کو پیش آنے والا پہلا اہم چیلنج تھی) کچل ڈالنے کا جشن منا رہا تھا۔ لکھنؤ کے سکندر باغ محل میں، جسے برطانوی بمباری نے جلا ڈالا تھا، بیاتو نے جو تصویریں کھینچیں ان میں باغیوں

کے ڈھانچوں کو کل کے احاطے میں بکھرا ہوا دکھایا گیا ہے۔

کسی جنگ کو فوٹو گرافی کے ذریعے دستاویزی شکل میں ریکارڈ کرنے کی پہلی کوشش اس کے چند برس بعد، امریکی خانہ جنگی کے دوران، شمالی علاقوں کے فوٹو گرافروں کی ایک فرم نے کی جس کی قیادت میتھیو بریڈی (Mathew Brady) کر رہا تھا، جو اس سے پہلے صدر لنکن کے کئی سرکاری پورٹریٹ بنا چکا تھا۔ بریڈی کی جنگی تصویروں میں — جو بیشتر الیگزینڈر گارڈنر (Alexander Gardener) اور ٹموتھی اوسلیون (Timothy O'Sullivan) کی کھینچی ہوئی تھیں، لیکن تمام تصویروں کا کریڈٹ فرم کے مالک کو دیا گیا — روایتی موضوعات، مثلاً افسروں اور جوانوں سے آباد چھاؤنیوں، جنگ کی راہ میں آنے والے قصبوں، توپ خانوں، جہازوں، کے علاوہ، بہت مشہور طور پر، گیٹس برگ اور لینٹیاٹم کے بارود کی زد میں آنے والے میدان میں یونین اور کنفیڈریٹ سپاہیوں کی لاشوں کو دکھایا گیا تھا۔ اگرچہ بریڈی اور اس کی ٹیم کو جنگ کے محاذ تک رسائی براہ راست لنکن کی عنایت سے حاصل ہوئی تھی، یہ سب فوٹو گرافر اس طرح کسی معاہدے میں شامل نہیں تھے جیسا کہ فینٹن کے معاملے میں تھا۔ ان کی حیثیت زیادہ امریکی طریقے سے متعین ہوئی جس میں برائے نام سرکاری اسپانسر شپ کے بعد تجارتی اور فری لانس محرکات کی طاقت کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

ہلاک شدہ فوجیوں کی بربریت کی حد تک واضح تصویروں کا، جو یقیناً ایک ٹیبو کو توڑتی تھیں، سب سے پہلا جواز یہ پیش کیا گیا کہ جو کچھ ہوا اس کو ریکارڈ کرنا فوٹو گرافروں کا فرض ہے۔ "کیمرا تاریخ کی آنکھ ہے۔" یہ قول بریڈی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور تاریخ کے دوش بدوش، جس کا تصور ایک ایسے سچ کی طرح پیش کیا گیا جس کے خلاف اپیل کی کوئی گنجائش نہیں، ایک اور تصور بھی موجود تھا، جس کی رو سے موضوعات کو مزید توجہ کی ضرورت تھی اور جسے حقیقت پسندی یا ریئلزم کا نام دیا جاتا تھا — بہت جلد حقیقت پسندی کے تصور کی مدافعت کرنے والے فوٹو گرافروں سے زیادہ ناول نگاروں کی صف سے اٹھنے والے تھے۔* حقیقت پسندی کے نام پر آدمی کو اجازت حاصل تھی — بلکہ اس سے مطالبہ کیا

---

* ہلاک شدہ فوجیوں کی تصویروں والی حقیقت پسندی، جس سے خود اعتمادی کے غبارے کی پھونک نکل جاتی تھی، The Red Badge of Courage میں ڈرامائی طور پر بروئے کار لائی گئی جس میں ہر چیز کو ایک ایسے شخص کے سٹپٹائے ہوئے، دہشت زدہ نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے جو ممکنہ طور پر ان ہلاک ہونے والے فوجیوں میں شامل ہو سکتا تھا۔ اسٹیفن

Scanned with CamScanner

جاتا تھا — کہ وہ ناخوشگوار، دشوار حقیقتوں کو منظرِ عام پر لائے۔ ایسی تصویریں ایک "کارآمد سبق" بھی پیش کرتی تھیں، کیونکہ ان میں "جنگ کی شان و شوکت کے برخلاف اس کی حقیقت اور اس کے بھیانک خلا" کی عکاسی کی جاتی تھی۔ اوسلیون کی کھینچی ہوئی جنگ میں کام آنے والے کنفیڈریٹ سپاہیوں کی تصویر، جس میں ان کے اذیت سے مسخ چہرے دیکھنے والے کی جانب ہیں، گارڈنر کی مرتب کردہ ایک البم میں شامل ہوئی جسے اس نے جنگ ختم ہونے کے بعد شائع کیا اور جس میں اس کی اور اس کے ساتھی فوٹوگرافروں کی کھینچی ہوئی تصویریں جمع کی گئی تھیں۔ (اس نے بریڈی کی ملازمت ۱۸۶۳ء میں چھوڑ دی تھی۔) گارڈنر نے اس تصویر کے ساتھ شائع ہونے والی عبارت میں کہا: "یہ ہیں وہ دہشت ناک تفصیلات۔ امید ہے ان سے قوم کو اس قسم کے کسی اور سانحے سے بچانے میں مدد ملے گی۔" لیکن اس مجموعے *Gardener's Photographic Sketch Book of the War* (۱۸۶۶ء) میں شامل یادگارترین تصویروں کی صاف گوئی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نے اور اس کے ساتھی فوٹوگرافروں نے اپنے موضوعات کو جیسا پایا لازمی طور پر ویسے کا ویسا اپنی تصویروں میں پیش کر دیا۔ تصویر کھینچنے کا مطلب منظر کو کمپوز کرنا تھا (جس کی صورت زندہ انسانوں کے معاملے میں یہ ہوتی تھی کہ ان سے پوز بنانے کو کہا جائے)، اور منظر کے اجزا کو تصویر میں کسی مخصوص ترتیب میں دیکھنے کی خواہش محض اس سبب سے معدوم نہیں ہو گئی تھی کہ یہ اجزا ساکت تھے، یا حرکت کے قابل نہ تھے۔

یہ تعجب کی بات نہیں کہ جنگی فوٹوگرافی کے ابتدائی دور میں شامل بہت سے مناظر یا تو اسٹیج کیے

کرین کا، چھپتے ہوئے بصری اسلوب کا حامل، صرف ایک کردار کی زبانی بیان کیا گیا یہ جنگ مخالف ناول — جو جنگ ختم ہونے کے تیس برس بعد، ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا (کرین ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوا تھا) — جنگ کے خونی کاروبار کے متعلق والٹ وٹمین (Walt Whitman) کے اسی زمانے کے لکھے ہوئے مختلف الصوت بیانیوں سے طویل جذباتی فاصلے پر ہے جس سے یہ معاملہ نسبتاً سادہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ وٹمین کی نظموں کا جو سلسلہ Drum-Taps کے عنوان سے ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا (اور جسے بعد میں اس کے مجموعے *Leaves of Grass* میں شامل کیا گیا)، اس میں مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اگرچہ وٹمین کو کسی بھی طرح جنگ کا حامی قرار نہیں دیا جا سکتا، کہ وہ جنگ کو برادرکشی کا نام دیتا ہے اور دونوں جانب ہونے والی ہلاکتوں پر رنجیدہ ہے، لیکن وہ جنگ کی رزمیہ اور سورمائی موسیقی پر کان دھرے بغیر نہیں رہ سکا۔ کن رس کے طور پر اس کی یہ دلچسپی اسے، گو اس کے مخصوص فراخدلانہ، تہہ دار اور پُرخواہش انداز میں، جنگ پسندی کا رنگ بخشتی ہے۔

ہوے نکلتے ہیں یا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں موضوع کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے۔ اپنے گھوڑا گاڑی والے ڈارک روم کے ساتھ بے تحاشا گولوں کا نشانہ بننے والی سباستوپول کی وادی میں پہنچنے کے بعد فینٹن نے کیمرے کو تپائی پر نصب کر کے اسی پوزیشن سے دو تصویریں لیں۔ جس تصویر کو بعد میں شہرت اور ''موت کے سائے کی وادی'' کا عنوان ملنے والا تھا (جو اس اعتبار سے غلط تھا کہ لائٹ بریگیڈ اپنے حملے کے دوران اس مخصوص لینڈ سکیپ سے نہیں گزرا تھا)، اس کے پہلے ورژن میں توپ کے گولے زیادہ بڑی تعداد میں سڑک کے بائیں کنارے پر پڑے دکھائی دیتے ہیں، لیکن دوسرے ورژن سے پہلے ــــ جسے بار بار اور ہمیشہ شائع کیا جاتا ہے ــــ اس نے گولوں کے سڑک پر بکھرائے جانے کے کام کی خود نگرانی کی۔ ایک ایسے مقام کی تصویر جہاں بڑی تعداد میں ہلاکتیں سچ مچ پیش آئی تھیں، یعنی بیاتو کی کھینچی ہوئی لکھنؤ کے سکندر باغ کی تصویر، کے سلسلے میں منظر کے اجزا کو ترتیب دینے کا عمل زیادہ تفصیل سے کیا گیا تھا، اور یہ جنگ میں پیش آنے والی ہولناکی کی اولین تصویروں میں سے تھی۔ سکندر باغ پر حملہ نومبر ۱۸۵۷ء میں کیا گیا تھا، جس کے بعد فاتح برطانوی فوجیوں اور وفادار مقامی یونٹوں نے محل کے ایک ایک کمرے کی تلاشی لے کر وہاں موجود اٹھارہ سو باغیوں کو، جو اب ان کے قیدی تھے، سنگینیں گھونپ کر ہلاک کیا اور ان کی لاشیں محل کے احاطے میں پھینک دیں؛ باقی کام کتوں اور گدھوں نے کیا۔ بیاتو نے جو تصویر مارچ یا اپریل ۱۸۵۸ء میں کھینچی، اس کے لیے اس نے ایک ایسے میدان کا منظر باقاعدہ تخلیق کیا جہاں لاشوں کو دفن کرنے کے بجائے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس نے مقامیوں کے چند ڈھانچوں کو پس منظر کے دو ستونوں سے ٹکا کر رکھا اور مارے گئے لوگوں کی ہڈیاں پورے احاطے میں پھیلا دیں۔

خیر یہ تو پھر بھی پرانی ہڈیاں تھیں۔ یہ بات اب معلوم ہو چکی ہے کہ بریڈی کی ٹیم نے گیٹس برگ کے میدان میں تازہ ہلاک شدگان کی لاشوں کو اپنی جگہ سے سرکا کر نئے سرے سے ترتیب دیا تھا۔ جس تصویر کو ''ایک باغی نشانہ باز کا گھر، گیٹس برگ'' کا عنوان دیا گیا اس میں درحقیقت ایک کنفیڈریٹ سپاہی کی لاش دکھائی گئی ہے جسے اس کے ہلاک ہونے کے مقام سے، جو باہر کوئی کھیت تھا، اس زیادہ فوٹوجینک مقام پر لایا گیا تھا جو بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان کی خالی جگہ تھی جس کے برابر میں پتھروں کی بنی ہوئی ایک رکاوٹی دیوار تھی، اور تصویر میں ایک نقلی رائفل بھی دکھائی گئی ہے جسے گارڈنر نے لاش کے

پاس دیوار سے ٹکا کر رکھ دیا تھا۔ (معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانہ بازوں کے استعمال میں آنے والی خصوصی رائفل نہیں بلکہ پیادہ فوجیوں کی عام رائفل ہے۔ گارڈنر کو اس کا علم نہیں تھا، یا پروا نہیں تھی۔) عجیب بات یہ نہیں ہے کہ ماضی کی بہت سی ایسی خبری تصویریں جنھیں علامتوں کی سی حیثیت حاصل ہوئی، جن میں دوسری جنگِ عظیم کی وہ تصویریں بھی شامل ہیں جو لوگوں کو بہت اچھی طرح یاد ہیں، اسٹیج کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں اس اطلاع پر حیرت ہوتی ہے، اور ہمیشہ مایوسی بھی ہوتی ہے۔

جن تصویروں کے مصنوعی طور پر پوز کیے جانے کی اطلاع پا کر ہم خاص طور پر افسردہ ہوتے ہیں وہ تصویریں ہیں جن میں بظاہر موت یا محبت کے نقطۂ عروج (climax) کو نہایت قریب سے ریکارڈ کیا گیا ہو۔ "ایک ریپبلکن سپاہی کی موت" نامی تصویر کی اہمیت ہی یہ ہے کہ یہ ایک حقیقی لمحہ ہے جو اتفاق سے کیمرے کی گرفت میں آ گیا؛ اگر یہ معلوم ہو کہ گرتا ہوا فوجی کاپا کے کیمرے کے سامنے اداکاری کر رہا تھا تو یہ تصویر اپنی قدر کھو بیٹھتی ہے۔ رابرٹ دوازنو (Robert Doisneau) نے اپنی کھینچی ہوئی اس تصویر کے اتفاقیہ ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جو اس نے ۱۹۵۰ء میں "لائف" رسالے کے لیے کھینچی تھی اور جس میں پیرس کے اوتیل دو وِی کے قریب ایک فٹ پاتھ پر ایک نوجوان مرد اور عورت کو بوسہ لیتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس کے باوجود جب چالیس برس بعد انکشاف ہوا کہ تصویر ہدایت کار کا بنایا ہوا ایک سیٹ اپ تھی جس میں دکھائی گئے جوڑے کو دوازنو کی تصویر کے لیے بوسے کی اداکاری کی غرض سے دن بھر کے لیے معاوضے پر رکھا گیا تھا، تو ان لوگوں میں سخت طیش کی لہر دوڑ گئی جن کے لیے یہ تصویر رومانی محبت اور رومانی پیرس کا ایک محبوب روپ تھی۔ ہم فوٹوگرافر کو محبت اور موت کے مکان میں ایک جاسوس کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں، اس طرح کہ تصویر کے فریم میں "سے" نے والے لوگوں کو کیمرے کے وجود کی خبر نہ ہو۔ فوٹوگرافی کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے، اس کا کوئی اجتماعی ترقی یافتہ احساس بھی ایسی تصویر سے پیدا ہونے والی تسکین کو کم نہیں کر سکتا جس میں کسی غیر متوقع واقعے کو، عین اس وقت جب وہ وقوع ہو رہا ہو، کوئی چوکس فوٹوگرافر کیمرے کے فریم میں قید کر لے۔

اگر ہم صرف انھی تصویروں کو مستند سمجھنے پر مصر ہوں جو محض کسی فوٹوگرافر کے اتفاق سے، ٹھیک درست لمحے پر، کھلے ہوئے شٹر کے ساتھ، موقعے پر موجود ہونے کا نتیجہ ہوں، تو فتح کا منظر دکھانے والی شاید ہی کوئی تصویر اس معیار پر پوری اتر سکے۔ کسی لڑائی کے اختتام کے قریب کسی اونچی جگہ پر جھنڈا

گاڑنے کے عمل کو لیجیے۔ وہ مشہور تصویر جس میں ۲۳ فروری ۱۹۴۵ء کو کوہ سوریباچی پر قبضے کے بعد ایوو جیما کے مقام پر امریکی پرچم کو بلند ہوتے دکھایا گیا ہے، دراصل ایسوسی ایٹڈ پریس کے فوٹوگرافر جو روزنتھال (Joe Rosenthal) کا بازساختہ (reconstructed) تھا، جبکہ اصل پرچم کشائی اس سے پہلے صبح کے وقت ہو چکی تھی، جس میں تصویر میں دکھائے گئے پرچم کے مقابلے میں چھوٹا پرچم استعمال کیا گیا تھا۔ یہی قصہ ایک اور اتنی ہی علامتی اہمیت رکھنے والی تصویر کا ہے، جس میں سوویت فوٹوگرافر یوجینی خالدئی (Yevgeny Khaldei) نے ۲ مئی ۱۹۴۵ء کو جلتے ہوئے شہر برلن میں روسی فوجیوں کو رائشٹاگ کی عمارت پر سرخ جھنڈا لہراتے دکھایا ہے، کہ اسے کیمرے کے لیے اسٹیج کیا گیا تھا۔ لندن میں ۱۹۴۰ء میں جرمن ہوائی حملوں (Blitz) کے دوران کھینچی گئی، بے تحاشا شائع شدہ، اور حوصلہ مندی کی آئینہ دار تصویر کا معاملہ نسبتاً زیادہ پیچیدہ ہے، کیونکہ اس کا فوٹوگرافر، اور چنانچہ تصویر کشی کے وقت کی تفصیلی صورت حال، نامعلوم ہے۔ تصویر میں ہالینڈ ہاؤس کی لائبریری کی مکمل طور پر تباہ شدہ، بے چھت عمارت کی ایک گری ہوئی دیوار کے رخنے میں سے تین آدمیوں کو کتابوں کی الماریوں والی دو دیواروں کے پاس، جو معجزانہ طور پر سلامت رہ گئی تھیں، ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کتابوں کو کچھ دور سے دیکھ رہا ہے، دوسرے کی انگلی شیلف میں رکھی ایک کتاب کے پشتے پر ہے جیسے وہ اسے نکالنے کو ہو، اور تیسرا ایک کتاب کو ہاتھ میں لیے ہے اور پڑھ رہا ہے — یہ نفاست سے کمپوز کیا منظر یقیناً ہدایت کار کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ یہ تصور کرنا خوش کن ہے کہ یہ تصویر مکمل طور پر کسی ایسے فوٹوگرافر کی ایجاد کی ہوئی نہیں ہوگی جو ہوائی حملے کے بعد کینسنگٹن کے علاقے میں کسی عمدہ تصویر کی تاک میں گھوم رہا تھا، اور جس نے تباہ شدہ لائبریری کی دو دیواروں کو سلامت پا کر تین شریف آدمیوں کو بلایا اور ان سے کتابیں پڑھنے کے بے پرواشائقین کی اداکاری کرنے کو کہا، بلکہ بات کچھ یوں ہوگی کہ فوٹوگرافر نے ان تینوں افراد کو تباہ شدہ عمارت میں اپنے مطالعے کے شوق کی تسکین کرتے پایا اور ان کو محض ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر کھڑا کر کے ان کی تصویر لے لی۔ دونوں صورتوں میں تصویر کی قدیم دلکشی قائم رہتی ہے اور اس کا یہ استناد بھی کہ اس میں قومی پامردی اور ہیجان انگیز حالات میں پرسکون رہنے کی ان خصوصیات کا جشن منایا گیا ہے جو اب رخصت ہو چکی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی اسٹیج کی ہوئی تصویریں دوبارہ تاریخی شواہد میں شامل ہو جاتی ہیں، البتہ انھیں پوری طرح خالص

شہادت نہیں سمجھا جاتا — جیسا کہ بیشتر تاریخی شواہد کے ساتھ ہوتا ہے۔

صرف ویت نام کی جنگ کے بعد سے اس بات کو قریب قریب یقینی درجہ حاصل ہوا کہ معروف ترین تصویریں مصنوعی طور پر تخلیق کی ہوئی نہیں ہیں۔ اور یہ بات ان مناظر کے اخلاقی استناد کے لیے بہت اہم ہے۔ ویت نام کی جنگ کی ہولناکی کو مجسم کرنے والی تصویر، جو ۱۹۷۲ء میں ہیونھ کانگ اُت (Huynh Cong Ut) نے کھینچی تھی، ان بچوں کی ہے جو ابھی ابھی امریکی نیپام بم کی زد میں آ کر جھلسے ہیں، اور اذیت سے چیختے ہوئے شاہراہ پر دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ان تصویروں میں سے ہے جنھیں پوز کروانا ممکن نہیں۔ یہی بات ان بیشتر جنگوں کی جانی پہچانی تصویروں کے بارے میں سچ ہے جن کا تصویری دستاویزی ریکارڈ موجود ہے۔ یہ حقیقت کہ ویت نام کی جنگ کے بعد بہت کم جنگی تصویریں ایسی ہوں گی جنھیں اسٹیج کیا گیا ہو، اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اب فوٹوگرافر صحافیانہ دیانت داری کے اعلیٰ تر معیار کی پابندی کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ جزوی طور پر یہ ہو سکتی ہے کہ ویت نام کی جنگ کے دوران ٹیلی وژن جنگ کے مناظر دکھانے کا بنیادی ذریعہ بن گیا، اور تنہا دلیر فوٹوگرافر کو جو اپنا لائیکا یا نیکون کیمرا اٹھائے سب کی نگاہوں سے اوجھل تصویریں کھینچتا پھرتا تھا، اب ٹیلی وژن کی مسابقت اور اپنے آس پاس ٹیلی وژن کے عملوں کی موجودگی کو برداشت کرنا تھا اب جنگ کا مشاہدہ کرنا کوئی تنہائی کا کام نہیں رہا۔ تکنیکی طور پر تصویروں میں الیکٹرانک طریقوں سے ردوبدل کرنے کے امکانات آج پہلے سے کہیں زیادہ، قریب قریب لامحدود، ہیں۔ لیکن ڈرامائی خبری تصویروں کو تخلیق کرنا، انھیں کیمرے کے لیے اسٹیج کرنا، اب معلوم ہوتا ہے جلد ہی ایک گم شدہ فن بن جائے گا۔

۴

حقیقت میں واقع ہوتی ہوئی موت کے منظر کو گرفت میں لانا اور اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا ایسا کام ہے جو صرف کیمرا ہی کر سکتا ہے، اور جو جنگی تصویریں فوٹوگرافروں نے جائے وقوع پر ٹھیک موت کے لمحے میں یا اس سے ذرا پہلے کھینچی ہوں انھیں سب سے زیادہ سراہا جاتا ہے اور بار بار شائع یا نشر کیا جاتا ہے۔ فروری ۱۹۶۸ء میں ایڈی ایڈمز (Eddie Adams) کی کھینچی ہوئی اس تصویر کے استناد کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا جس میں جنوبی ویت نام کی قومی پولیس کے سربراہ

بریگیڈیر جنرل نگوین نگوک لوآن (Nguyen Ngoc Loan) کو سائیگان کی ایک سڑک پر ایک مشتبہ ویت کانگ کو گولی مارتے دکھایا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے اسٹیج کیا گیا تھا۔ اور اسٹیج کرنے والا خود لوآن تھا، جو اپنے قیدی کو، جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، باہر سڑک پر لے کر آیا جہاں صحافی جمع تھے؛ اگر وہ لوگ وہاں اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے موجود نہ ہوتے تو وہ اس فوری سزائے موت پر وہاں عمل درآمد نہ کرتا۔ خود کو اپنے قیدی کے قریب لا کر، تاکہ اس کے پیچھے کھڑے ہوئے فوٹوگرافر کا کیمرا اس کے پروفائل اور قیدی کے چہرے کو ایک ساتھ فریم میں لا سکے، اس نے بہت قریب سے گولی چلائی۔ ایڈمز کی تصویر اس لمحے کی ہے جب گولی چلائی جا چکی ہے؛ مرنے والے نے، جس کا منھ ٹیڑھا ہو رہا ہے، ابھی گرنا شروع نہیں کیا۔ جہاں تک دیکھنے والے کا سوال ہے، میرا سوال ہے، اس تصویر کے کھینچے جانے کے اتنے برس بعد بھی۔ ۔ خیر، آدمی ایسی تصویروں کو بہت دیر تک تکتا رہے تب بھی اس مشترک تماش بینی (co-spectatorship) کے اسرار اور اس کی ناشائستگی کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

ان لوگوں کے چہرے دیکھنا جنھیں معلوم ہو کہ انھیں مارا جانے والا ہے، اور بھی زیادہ مضطرب کن ہوتا ہے وہ چھ ہزار تصویریں جو نام پنھ، کمبوڈیا، کے مضافات میں توول سلینگ کے مقام پر ایک سابق ہائی اسکول کی عمارت میں بنائی گئی خفیہ جیل میں کھینچی گئیں — یہ وہ جگہ تھی جہاں چودہ ہزار سے زیادہ کمبوڈین باشندوں کو "انٹلیکچول" یا "انقلاب دشمن" ہونے کے الزام میں ہلاک کیا گیا۔ کھمیر روژ (Khmer Rouge) کے ریکارڈ کیپر کا اکٹھا کیا ہوا ذخیرہ تھا، جو ان میں سے ہر ایک کو، مارے جانے سے ذرا پہلے، اسٹول پر بٹھا کر ان کی تصویر کھینچتا تھا۔ * ان میں سے کچھ منتخب تصویریں The Killing Fields نامی کتاب کے ایک سیکشن میں شائع ہوئی ہیں، جس کی بدولت ہے، کئی عشرے گزرنے کے بعد، ان چہروں پر نگاہ ڈالنا ممکن ہو گیا ہے جو کیمرے کی طرف — چنانچہ ہماری طرف — دیکھ رہے ہیں۔ اسپانوی ریپبلکن سپاہی ابھی ابھی مرا ہے، اگر ہم اس تصویر کے بارے میں کیے جانے والے

---

* سیاسی قیدیوں اور انقلاب دشمن ٹھہرائے جانے والوں کو سزائے موت دیے جانے سے ذرا پہلے ان کی تصویر کھینچنا ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے عشروں میں سوویت یونین میں باقاعدگی سے کیا جانے والا عمل تھا، جیسا کہ بالٹک اور یوکرین کے دستاویزی ذخیروں، اور لوبیانکا کے مرکزی ذخیرے میں محفوظ NKVD کی فائلوں پر کی جانے والی حالیہ تحقیق سے ظاہر ہوا ہے۔

دعوے کو تسلیم کریں جو کا پانے اپنے موضوع سے کچھ فاصلے پر رہ کر کھینچی تھی۔ اس کے کرتے ہوئے ہمیں ایک دانے دار شبیہ، سر اور دھڑ، ایک توانائی سی، کیمرے کی مخالف سمت میں حرکت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کمبوڈیا کے یہ باشندے، ہر عمر کی عورتیں اور مرد، اور بہت سے بچے بھی، جن کے اوپری دھڑ کی تصویریں چند فٹ کے فاصلے سے کھینچی گئی ہیں — بالکل اس طرح جیسے ٹیٹیان کی The Flaying of Marsyas میں اپولو کا چاقو مستقل طور پر اس حالت میں ہے جیسے ابھی نیچے آنے والا ہو — مسلسل موت پر نظریں جمائے ہوئے ہیں، ہمیشہ مارے جانے سے ذرا دیر پہلے کی حالت میں، متواتر ظلم رسیدہ۔ اور یہ تصویریں دیکھنے والا شخص ٹھیک اس پوزیشن میں ہے جس میں کیمرے کے پیچھے کھڑا ہوا کارندہ — یہ ایک بیمار کر دینے والا تجربہ ہے۔ اس قید خانے کے فوٹوگرافر کا نام معلوم ہے — نہیم آئن (Nhem Ein) — اور لیا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن تصویروں میں دکھائی دینے والے، اپنے دہشت سے ساکت چہروں اور سوکھے ہوئے اوپری دھڑوں کے ساتھ، محض ایک ڈھیر، ایک مجموعہ ہیں: مارے جانے والے گمنام لوگ۔

اور اگر ان کے نام معلوم بھی ہو جائیں تب بھی وہ "ہمارے" لیے اجنبی ہی رہیں گے۔ جب ورجینیا وولف بتاتی ہے کہ اس کو موصول ہونے والی ایک تصویر میں کسی مرد یا عورت کی لاش دکھائی گئی ہے جو اس حد تک مسخ ہو چکی ہے کہ کسی سؤر کی لاش بھی ہو سکتی ہے، تو وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ جنگ کی ہلاکت خیزی ہر اُس شناخت کو برباد کر ڈالتی ہے جو لوگوں کو فرد کے طور پر، بلکہ محض انسان کے طور پر بھی، حاصل رہی ہو گی۔ بلاشبہ جنگ کو جب دور سے، ایک منظر کے طور پر، دیکھا جائے تو وہ ایسی ہی دکھائی دیتی ہے۔

مارے جانے والے، ان کے ماتم گسار عزیز، خبروں کے صارفین — سب جنگ سے اپنی اپنی قربت، اپنا اپنا فاصلہ رکھتے ہیں۔ جنگ کے، اور کسی سانحے میں زخمی ہونے والے انسانی جسموں کے، صاف گو ترین مناظر اُن افراد کے ہوتے ہیں جو انتہائی اجنبی، انتہائی غیر (foreign) دکھائی دیں، چنانچہ جن کو جاننا انتہائی غیر اغلب ہو۔ جب موضوع زیادہ قریب کا ہو تو فوٹوگرافر سے زیادہ محتاط رہنے کی توقع کی جاتی ہے۔

جب ۱۸۶۲ء میں، اینٹیاٹم کی لڑائی کے ایک مہینے بعد، گارڈنر اور اوسلیون کی کھینچی ہوئی تصویریں

Scanned with CamScanner

بریڈی کی مین ہیٹن گیلری میں نمائش کے لیے رکھی گئیں، تو ''نیو یارک ٹائمز'' نے اس پر یہ تبصرہ کیا

> وہ زندہ لوگ جو جوق در جوق براڈوے پر آ رہے ہیں، شاید اینٹیٹم میں مرنے والوں کی ذرا سی بھی پروا نہیں کرتے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر خون میں لت پت چند لاشیں فٹ پاتھ پر ڈال دی جائیں تو وہ اس سڑک پر ذرا کم بے پروائی سے چلتے، ذرا کم اطمینان سے خوش خرامی کرتے۔ لوگ اپنے لباس کے پلو اور پائینچے اٹھا کر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے چلتے...

اس مستقل الزام سے اتفاق کرنے کے باوجود کہ جنگ سے محفوظ رہ جانے والے لوگ اپنے دائرے سے باہر کے لوگوں کی اذیت سے بے پروا اور بے حس رہتے ہیں، نامہ نگار کو ان تصویروں کے فوری پن کے بارے میں شکوک وشبہات لاحق رہے۔

> میدانِ جنگ میں مارے جانے والے ہمارے خوابوں میں بھی شاید ہی کبھی ہمارے پاس آتے ہوں۔ ہم صبح ناشتے کے وقت اخبار میں ان کے ناموں کی فہرست پڑھتے ہیں، لیکن کافی کے ساتھ ہی اس کی یاد کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتے ہیں۔ لیکن مسٹر بریڈی نے جنگ کی دہشت ناک حقیقت اور سنگینی کو ہمارے نزدیک لانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس نے لاشوں کو لا کر ہمارے دروازوں پر اور گلیوں میں نہیں ڈالا، لیکن جو کچھ اس نے کیا ہے وہ اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ..
>
> ان تصویروں میں ایک دہشت ناک صراحت موجود ہے۔ محدب عدسے کی مدد سے مرنے والوں کے چہروں کے نقوش تک شناخت کیے جا سکتے ہیں۔ خندق کے کھلے منھ میں دھکیل دیے جانے کی منتظر ان لاشوں کی تصویر کو دیکھنے کے لیے جھکی ہوئی کوئی عورت ان میں اپنے شوہر، بیٹے یا بھائی کو پہچان لے تو وہ ایسا موقع ہوگا کہ ہم اس وقت اس گیلری میں ہونا پسند نہیں کریں گے۔

اس تبصرے میں تصویروں کی تعریف اس بنا پر ناپسندیدگی سے آلودہ ہے کہ کہیں کسی مرنے والے کی عزیز خاتون کو اذیت نہ ہو۔ کیمرا دیکھنے والے کو قریب، بہت قریب لے آیا ہے؛ اگر اس میں محدب عدسے کو بھی جوڑ لیا جائے ـــــ کیونکہ یہ دوہرے عدسے کی کہانی ہے ـــــ تو ''دہشت ناک صراحت'' کی حامل یہ تصویریں غیر ضروری اور ناشائستہ اطلاعات فراہم کرتی ہیں۔ لیکن تصویروں میں دکھائے گئے منظر کی ناقابلِ برداشت حقیقت پسندی کی تحسین کرتے ہوئے، ''نیو یارک ٹائمز'' کا نامہ نگار اس میلوڈراما کی مزاحمت نہیں کر پاتا جو محض لفظوں سے پیدا ہوتا ہے (''خون میں لت پت لاشیں''، جو ''خندق کے

Scanned with CamScanner

کھلے منہ میں دھکیل دیے جانے کی منتظر" ہیں)۔

کیمروں کے دور میں حقیقت سے نئے نئے مطالبے کیے جاتے ہیں۔ حقیقت ممکن ہے کافی حد تک لرزہ خیز نہ ہو، چنانچہ اس میں اضافہ کرنا ضروری ہے' یا اسے زیادہ قابلِ یقین طور پر نئے سرے سے کھیلے جانے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا کسی لڑائی کو دکھانے والی پہلی نیوز ریل ــــ جس میں ۱۸۹۸ء کی اسپانوی امریکی جنگ کے دوران کیوبا میں ہونے والے ایک نہایت شہرت یافتہ واقعے، یعنی سان حوان پہاڑی کی لڑائی دکھائی گئی تھی ــــ دراصل اس حملے کا منظر دکھاتی ہے جو لڑائی کے بعد کرنل تھیوڈور روز ویلٹ اور اس کے رضاکار گھڑسوار دستے، دی رف رائیڈرز، نے وٹاگراف کیمرامین کی خاطر اسٹیج کیا تھا، کیونکہ اصل حملہ، فلمائے جانے کے بعد، ناکافی ڈرامائیت کا حامل قرار دیا گیا تھا۔ یا پھر اصلی مناظر بہت زیادہ دہشت ناک ہو سکتے ہیں جنھیں شائستگی یا حب الوطنی کے نام پر دبایا جانا ضروری ہو ــــ مثلاً ایسے مناظر جن میں، مناسب جزوی پردہ پوشی کے بغیر، ہمارے مرنے والے دکھائے گئے ہوں۔ کیونکہ مُردوں کی نمائش ایسی چیز ہے جو دشمن کرتے ہیں۔ [جنوبی افریقہ میں] بوئروں کی جنگ (۱۸۹۹ء-۱۹۰۲ء) میں اسپیون کوپ (Spion Kop) کے مقام پر اپنی فتح کے بعد بوئروں نے خیال کیا کہ اگر وہ ہلاک ہونے والے برطانوی سپاہیوں کی ایک ہولناک تصویر تقسیم کریں تو اس سے ان کے اپنے سپاہیوں کے عزم اور حوصلے میں اضافہ ہوگا۔ برطانوی فوج کی شکست کے دس دن بعد، جس میں اس کے تیرہ سو سپاہی ہلاک ہوئے تھے، ایک نامعلوم بوئر فوٹوگرافر کی کھینچی ہوئی اس تصویر میں کیمرا لاشوں سے پٹی ہوئی ایک لمبی تنگ خندق میں اوپر سے جھانک رہا ہے۔ اس تصویر کی ایک خاص طور پر جارحانہ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سے لینڈسکیپ بالکل غائب ہے۔ خندق میں بھری لاشیں پوری تصویر پر چھائی ہوئی ہیں۔ بوئروں کی طرف سے کی جانے والی اس تازہ ترین زیادتی پر ہونے والا برطانوی ردِعمل گہری تکلیف کا تھا، اگرچہ اسے پرتکلف انداز میں ظاہر کیا گیا تھا: ایسی تصویروں کی نمائش کرنے سے، *Amateur Photographer* نامی رسالے نے اعلان کیا، "کوئی کارآمد مقصد پورا نہیں ہوتا، اور محض انسانی فطرت کے مریضانہ پہلو کو تحریک ملتی ہے۔"

سنسرشپ کا وجود ہمیشہ رہا ہے، لیکن یہ ایک طویل عرصے تک نامربوط رہی اور جرنیلوں اور ریاست کے سربراہوں کی مرضی پر منحصر رہی۔ محاذِ جنگ پر کی جانے والی صحافتی فوٹوگرافی پر باقاعدہ

پابندی پہلی بار پہلی جنگ عظیم کے دوران لگائی گئی، جرمن اور فرانسیسی دونوں جانب کی ہائی کمان نے صرف چند منتخب فوجی فوٹوگرافروں کو لڑائی کے قریب جانے کی اجازت دی۔ (برطانوی جنرل اسٹاف کی جانب سے صحافتی سنسر شپ نسبتاً زیادہ لچک دار تھی۔) یہ بات پچاس سال گزرنے کے بعد، اور پہلی بار ٹیلی وژن کے ذریعے جنگ کی کوریج ہونے کے بعد، پوری طرح سمجھ میں آسکی کہ صدمہ انگیز تصویروں کا مقامی پبلک پر کس قسم کا اثر ہوسکتا ہے۔ ویت نام کے زمانے میں جنگی فوٹوگرافی نے عموماً جنگ پر تنقید کی صورت اختیار کی۔ اس کے نتائج نکلنے ناگزیر تھے۔ مین اسٹریم ذرائع ابلاغ کا یہ منشا نہیں ہوتا کہ لوگوں کو جس جنگ میں شامل ہونے کے لیے ابھارا جارہا ہو ان میں اُسی جنگ کی بابت بے چینی پیدا کی جائے، اور اس سے بھی کم یہ کہ جنگ آزمائی کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈا کو نشر کیا جائے۔

اس وقت سے لے کر سنسر شپ کو — موثر ترین شکل یعنی سیلف سنسر شپ، اور فوج کی عائد کی ہوئی سنسر شپ، دونوں صورتوں میں — بڑی تعداد میں اور بہت بارسوخ حامی میسر آگئے ہیں۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں فاک لینڈ پر برطانوی حملے کے آغاز پر مارگریٹ تھیچر کی حکومت نے صرف دو تصویری صحافیوں کو لڑائی کی کوریج کی اجازت دی — جن لوگوں کو اجازت نہیں دی گئی ان میں جنگی فوٹوگرافی کا ماہرِ فن استاد ڈون میکیولن بھی شامل تھا — اور مئی میں جزیرے پر دوبارہ قبضہ ہوجانے تک فلم کے صرف تین بیچ (batches) لندن پہنچے تھے۔ ٹیلی وژن کی براہ راست نشریات کی اجازت نہیں دی گئی۔ جنگ کریمیا کے بعد سے کسی برطانوی فوجی کارروائی کی رپورٹنگ پر ایسی کڑی پابندیاں عائد نہیں کی گئی تھیں۔ امریکی حکام کے لیے اپنے غیر ملکی فوجی ایڈونچروں کے سلسلے میں تھیچر حکومت جیسے کنٹرول عائد کرنا زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ تاہم ۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج کے دوران امریکی فوج نے جس قسم کے مناظر کی ترویج کی وہ ٹیکنو وار (techno war) کے مناظر تھے۔ مرنے والوں کے سروں پر پھیلا، میزائلوں اور توپ کے گولوں کی چھوڑی ہوئی روشنیوں سے بھرا ہوا آسمان — ایسے مناظر جن سے دشمن پر امریکہ کی مطلق فوجی برتری کا اظہار ہوتا تھا۔ امریکی ٹیلی وژن ناظرین کو اس برتری کے نتیجے میں ہونے والی بربادی کے مناظر دیکھنے کی اجازت نہیں دی گئی جن کی فلمیں این بی سی نے خریدی تھیں (اور بعد میں جنھیں دکھانے سے انکار کردیا)۔ جبری بھرتی کے تحت آئے ہوئے ان عراقی فوجیوں کا حشر جنھیں ۲۷ فروری کو کویت سے عراقی فوج کی پسپائی کے بعد شمال میں بصرہ کی سمت پیدل بھاگتے ہوئے راستے

Scanned with CamScanner

میں آتش گیر مادوں، نیپام، تابکار ڈپلیٹڈ یورینیم کے گولوں اور کلسٹر بموں کی کارپٹ بمباری سے ہلاک کیا گیا— اس قتل عام کو ایک امریکی فوجی افسر نے ''ٹرکی شوٹنگ'' کا مشہور نام دیا۔ ۲۰۰۱ء کے اواخر میں افغانستان میں کیے جانے والے بیشتر امریکی فوجی آپریشنوں سے اخباری فوٹو گرافروں کو دور رکھا گیا۔

جیسے جیسے جنگ ایک ایسی کارروائی کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، جس میں بصری آلات کی مدد سے دشمن کے محل وقوع کا درست اندازہ لگایا جاتا ہے، محاذِ جنگ پر غیر فوجی مقاصد کے لیے کیمروں کے استعمال کی شرائط زیادہ سے زیادہ سخت ہوتی جا رہی ہیں۔ کوئی جنگ فوٹو گرافی کے بغیر نہیں ہوتی، جنگ کے نامور ماہرِ جمالیات ارنسٹ جنگر (Ernst Junger) نے یہ بات ۱۹۳۰ء میں کہی تھی، اور اس طرح کیمرے اور بندوق کی مماثلت، اور کسی موضوع کی ''شوٹنگ'' اور کسی انسان کی ''شوٹنگ'' کی مماثلت کو زیادہ باریک بینی سے واضح کیا تھا۔ جنگ آزمائی اور تصویر کشی دونوں ایک دوسرے کے موافق عمل ہیں: ''یہ ایک ہی قسم کی ذہنی جنس ہے جس کے تباہ کن ہتھیار دشمن کی موجودگی کے وقت اور مقام کا سیکنڈوں اور میٹروں کی حد تک درست اندازہ لگا سکتے ہیں،'' جنگر نے لکھا تھا، ''اور اسی کی مدد سے عظیم تاریخی واقعات کو انتہائی باریک تفصیل کے ساتھ بصری شکل میں محفوظ کیا جاتا ہے۔'' *

آج کل جنگ کا پسندیدہ امریکی طریقہ اسی ماڈل کو ترقی دے کر تیار کیا گیا ہے۔ ٹیلی وژن، جس کی منظر تک رسائی سرکاری کنٹرول اور سیلف سنسرشپ کے باعث محدود ہو چکی ہے، جنگ کو محض قابلِ دید مناظر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو، جنگ کو ایک فاصلے پر رہ کر، ہوائی بمباری کے ذریعے لڑا جاتا ہے، اور اس بمباری کے ہدف، دیکھنے اور اطلاع فراہم کرنے کی ٹیکنالوجی

---

* چنانچہ گورنیکا کی تباہی سے تیرہ سال پہلے، آرتھر ہیرس (Arthur Harris) نے، جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران رائل ایئر فورس کی بمباری کی کمان کا سربراہ تھا، اور جب عراق میں رائل ایئر فورس کا ایک اسکواڈرن لیڈر تھا، اس نے حاصل شدہ نوآبادی میں بغاوت کو کچلنے کے لیے کیے جانے والے ہوائی حملوں کو اسی طرح بیان کیا تھا، جس کے ساتھ اس مشن کی کامیابی کا فوٹو گرافک ثبوت بھی موجود تھا۔ ''عرب اور کرد،'' اس نے ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا، ''اب جانتے ہیں کہ اصل بمباری کیا ہوتی ہے اور کتنی ہلاکت اور تباہی لا سکتی ہے؛ اب انھیں معلوم ہے کہ پینتالیس منٹ کے اندر اندر ایک اچھا بڑا گاؤں (جیسا کہ منسلک تصویروں میں دکھایا گیا کشان الاجازہ کا گاؤں) مکمل طور پر مٹایا جا سکتا ہے اور اس کے ایک تہائی باشندوں کو چار یا پانچ مشینوں کے ذریعے سے ہلاک کیا جا سکتا ہے، جس میں ان ، کوئی ہدف دکھائی نہ دے، جنگ بازوں کا وقار حاصل نہ ہو، اور فرار کا کوئی موثر راستہ نہ ملے۔''

کی مدد سے، براعظموں کے پار سے منتخب کیے جا سکتے ہیں: ۲۰۰۱ء کے آخر اور ۲۰۰۲ء کے اوائل میں افغانستان میں کیے جانے والے بمباری کے روزانہ آپریشنوں کی ہدایت کاری ٹیمپا، فلوریڈا، میں موجود امریکی مرکزی کمان سے کی جاتی تھی۔ اس کا مقصد مخالف فریق کے لوگوں کو کافی تعداد میں ہلاک کر کے اسے سزا دینا اور دشمن کی طرف سے جواباً اس طرف کے کسی شخص کو ہلاک کرنے کے مواقع کو کم سے کم رکھنا ہے: جو امریکی اور اتحادی فوجی، گاڑیوں کے حادثوں یا ''دوستانہ فائرنگ'' (جیسا کہ یہ پُرفریب اصطلاح بیان کرتی ہے) میں ہلاک ہوتے ہیں، انھیں اہمیت دی بھی جاتی ہے اور نہیں بھی۔

اس دور میں جبکہ امریکی طاقت کے دشمنوں کے خلاف ٹیلی کنٹرول کے ذریعے جنگ لڑی جاتی ہے، یہ پالیسیاں ابھی تیاری کی منزل میں ہیں کہ پبلک کو کیا کچھ دیکھنے دیا جائے اور کیا کچھ ان کی نظروں سے اوجھل رکھا جائے۔ ٹیلی وژن خبروں کے پروڈیوسر اور اخباروں رسالوں کے فوٹو ایڈیٹر ہر روز ایسے فیصلے کر رہے ہیں جن سے ان کے درمیان موجود مبہم اتفاق رائے رفتہ رفتہ مستحکم ہوتا جا رہا ہے کہ عوام کے علم کو کن حدود کے اندر رکھا جائے۔ بیشتر صورتوں میں ان کے فیصلوں کو ''خوش ذوقی'' پر مبنی بتایا جاتا ہے — اور یہ ایک ایسا معیار ہے جس کا نتیجہ، اداروں کی جانب سے پیش کیے جانے کی صورت میں، ہمیشہ اطلاعات پر پابندی کے طور پر نکلتا ہے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والے حملے میں مرنے والوں کی دہشت انگیز تصویروں کو، جو اس کے فوراً بعد لی گئی تھیں، منظر عام پر نہ لائے جانے کے حق میں یہی ''خوش ذوقی'' کی دلیل استعمال کی گئی تھی۔ (ٹیبلوائڈ اخبار پریشان کن تصویریں چھاپنے کے معاملے میں بڑے سائز کے اخباروں کی نسبت عموماً زیادہ دلیر ہوتے ہیں: ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ملبے میں پڑے ہوئے ایک مُردہ ہاتھ کی تصویر نیویارک کے اخبار ''ڈیلی نیوز'' کے شام کے ایڈیشن میں، حملے کے کچھ دیر بعد، شائع ہوئی تھی: غالباً اسے کسی اور اخبار نے شائع نہیں کیا۔) اور ٹیلی وژن کی خبریں، جن کے دیکھنے والے بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں اور اسی اعتبار سے ان پر مشتہرین کا دباؤ بھی زیادہ ہوتا ہے، اس سے بھی زیادہ کڑی، بیشتر خود اپنی عائد کردہ، حدود میں رہتی ہیں کہ کیا چیز نشر کرنا ''مناسب'' ہے اور کیا نہیں۔ ایک ایسے کلچر میں جو بدمذاقی کے فروغ کے تجارتی فوائد سے لبالب بھرا ہوا ہے، خوش ذوقی پر یہ انوکھا اصرار سمجھ میں آنے والا نہیں۔ لیکن یہ اس وقت بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے اگر اسے عوامی امن اور عوام کے مورال سے متعلق فکر اور تشویش کے ایک پردے کے طور پر دیکھا جائے (اس فکر اور تشویش کو

Scanned with CamScanner

باقاعدہ نام نہیں دیا جا سکتا) اور اس طور پر کہ فیصلہ کرنے والوں کو سوگ منانے کے روایتی طریقوں کو برقرار رکھنے اور ان کا دفاع کرنے کی کوئی راہ نہیں سوجھ رہی۔ کیا چیز دکھائی جا سکتی ہے، کیا چیز نہیں دکھائی جانی چاہیے — یہ موضوع عوامی طور پر جتنا ہنگامہ خیز ہے اتنا کوئی اور موضوع نہیں۔

تصویروں پر پابندی کے حق میں جو دوسری دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے متاثرہ افراد کے لواحقین کی حق تلفی ہوتی ہے۔ جب بوسٹن کے ایک ہفتہ وار اخبار نے پاکستان میں تیار کی گئی ایک پروپیگنڈا ویڈیو فلم کو بہت مختصر مدت کے لیے اپنی ویب سائٹ پر رکھا جس میں ۲۰۰۲ء میں کراچی میں قتل کیے جانے والے صحافی ڈینیئل پرل (Daniel Pearl) کو "اعتراف" کرتے (کہ وہ یہودی ہے) اور بعد میں اس کا سر قلم ہوتے ہوئے دکھایا گیا تھا، تو ایک زبردست بحث چھڑ گئی جس میں پرل کی بیوہ کے مزید اذیت سے محفوظ رہنے کے حق کو اخبار کے کسی شے کو چھاپنے یا منظر عام پر لانے کے حق اور عوام کے اطلاعات حاصل کرنے کے حق کے مقابلے پر لایا گیا تھا۔ وڈیو کو فوراً ویب سائٹ سے ہٹا یا گیا۔ خاص بات یہ ہے کہ بحث کے دونوں فریقوں نے ساڑھے تین منٹ کی اس دہشت ناکی کو محض ایک اصلی قتل کو دکھانے والی فلم سمجھا۔ اس تمام بحث سے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس فلم میں کچھ اور چیزیں بھی شامل ہیں، مثلاً کچھ جانے پہچانے الزامات (جیسے آریئل شیرون کو وائٹ ہاؤس میں جارج ڈبلیو بش کے ساتھ بیٹھے اور فلسطینی بچوں کو اسرائیلی حملے میں ہلاک ہوتے دکھایا گیا ہے)، اور اس کے علاوہ وہ ایک ملامتی تقریر پر بھی مبنی ہے جس کا خاتمہ سنگین دھمکیوں اور واضح مطالبات کی ایک فہرست پر ہوتا ہے — یعنی وہ تمام چیزیں جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہو کہ اس فلم کو دیکھنے کی اذیت برداشت کرنا (اگر آپ اسے برداشت کر سکتے ہوں) اس لحاظ سے کارآمد ہو سکتا ہے کہ اس سے پرل کی قاتل طاقتوں کی شرانگیزی کا بہتر طور پر مقابلہ کرنے کی کوئی راہ سوجھ سکتی ہے۔ دشمن کے بارے میں یہ تصور کر لینا بہت سہل ہے کہ وہ محض قتل پر تلا ہوا وحشی ہے، جو اپنے شکار کا سر قلم کرنے کے بعد اسے بالوں سے پکڑ کر ہوا میں بلند کرتا ہے تاکہ سب لوگ اس کا نظارہ کر سکیں۔

جہاں تک ہمارے اپنے مُردوں کا معاملہ ہے، ان کے کھلے چہروں کے دکھائے جانے کے خلاف بندش ہمیشہ موجود رہی ہے۔ گارڈنر اور او سلیوان کی کھینچی ہوئی تصویریں اب بھی صدمہ پہنچاتی ہیں کیونکہ ان میں یونین اور کنفیڈریٹ سپاہیوں کو چت پڑے ہوئے دکھایا گیا ہے اور ان میں سے بعض

Scanned with CamScanner

کے چہرے واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد سے میدان جنگ میں کام آنے والے امریکی سپاہیوں کے چہرے بڑی جنگوں کے بارے میں شائع ہونے والی کسی نمایاں کتاب یا اخبار میں سامنے نہیں لائے گئے، لیکن ستمبر ۱۹۴۳ء میں "لائف" نے اس ٹیبو کو توڑتے ہوئے جارج اسٹرک (George Struck) کی کھینچی ہوئی تصویر شائع کی۔ اس تصویر کو اس وقت تک فوجی سنسر نے اشاعت سے روک رکھا تھا۔ جس میں نیوگنی کے ایک ساحل پر جہاز کی لینڈنگ کے دوران ہلاک ہونے والے تین امریکی فوجیوں کو دکھایا گیا تھا۔ (اگرچہ "ہلاک شدہ فوجی، بونا کے ساحل پر" کا عنوان پانے والی اس تصویر کو ہمیشہ اس طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں تین فوجیوں کو گیلی ریت پر اوندھے منہ پڑے دکھایا گیا ہے، لیکن دراصل ان میں سے ایک فوجی چت پڑا ہوا ہے، مگر تصویر اس زاویے سے کھینچی گئی ہے کہ اس کا سر دکھائی نہیں دیتا۔) ۶ جون ۱۹۴۴ء کو فرانس میں ہونے والی لینڈنگ کے واقعے تک ہلاک شدہ گمنام امریکی فوجیوں کی تصویریں بہت سے خبری رسالوں میں شائع ہو چکی تھیں، جن میں انھیں ہمیشہ اوندھے منہ پڑے ہوئے، یا کفن میں لپٹے ہوئے، یا چہرہ دوسری طرف پھیرے ہوئے دکھایا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی عزت ہے جس کا مستحق ہلاک ہونے والے دوسرے لوگوں کو لازمی طور پر نہیں سمجھا جاتا۔

وقوعے کی جگہ جس قدر دور اور ہمارے لیے اجنبی ہوگی، مرے ہوئے اور مرتے ہوئے لوگوں کی واضح، سامنے سے لی گئی تصویروں کے منظرِ عام پر لائے جانے کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ چنانچہ دولت مند دنیا کے باشندوں کے ذہنوں میں نوآبادیاتی دور کے بعد کے افریقہ کا وجود — وہاں کی جنسی طور پر ہیجان انگیز موسیقی کو چھوڑ کر — بڑی بڑی ابلی ہوئی آنکھوں والے ستم زدہ لوگوں کی ناقابلِ فراموش تصویروں پر مشتمل ہے، جن کا سلسلہ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں بیافرا میں قحط کا شکار ہونے والوں کی تصویروں سے شروع ہو کر ۱۹۹۴ء کے روانڈا میں دس لاکھ توتسیوں کے قتلِ عام میں زندہ بچ جانے والوں کے چہروں تک پہنچتا ہے، اور اس کے چند سال بعد سیرالیون کے ان بالغ اور نابالغ باشندوں کی تصویروں تک جاتا ہے جن کے ہاتھ پیر باغی ملیشیا (RUF) کی دہشت پھیلانے کی مہم کے دوران کلھاڑوں سے کاٹ ڈالے گئے تھے۔ (اور ابھی حال ہی میں افریقہ کے مفلس دیہاتیوں کے پورے پورے خاندانوں کو ایڈز سے مرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔) ان مناظر میں دوہرا پیغام پوشیدہ ہے۔ یہ ایک ایسی اذیت کو دکھاتے ہیں جو غیر معمولی اور غیر منصفانہ ہے اور جس کا خاتمہ کیا جانا چاہیے۔ اور وہ اس بات کی تصدیق

بھی کرتے ہیں کہ ایسی چیزیں "وہاں" پیش آتی ہیں۔ ان مناظر، اور ان ہولناکیوں، کی کثرت اس یقین کو تقویت دیے بغیر نہیں رہ سکتی کہ دنیا کے ایسے تاریک یا پسماندہ — دوسرے لفظوں میں غریب — خطوں میں ایسے المناک واقعات کا پیش آنا ناگزیر ہے۔

اس سے ملتی جلتی سفاکیاں اور بدبختیاں یوروپ میں بھی پیش آیا کرتی تھیں؛ ایسی سفاکیاں جو اپنی وسعت اور گہرائی میں اس قسم کے کسی ایسے واقعے سے، جسے آج ہم دنیا کے کسی غریب خطے میں ہوتا ہوا دیکھ سکتے ہیں، کہیں زیادہ بڑی تھیں، یوروپ میں ابھی ساٹھ برس پہلے ہی پیش آچکی ہیں۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے گویا ہولناکی یوروپ سے رخصت ہو چکی ہے، اتنا عرصہ پہلے رخصت ہو چکی ہے کہ موجودہ پرامن حالت ناگزیر محسوس ہونے لگی ہے۔ (بوسنیا کی جنگ اور کوسووو میں سربوں کی قتلِ عام کی مہم سے جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ دوسری جنگِ عظیم کے پچاس برس بعد بھی یوروپ میں ہلاکت کے کیمپوں اور شہروں کے محاصروں کا ہونا ممکن ہے اور لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں ہلاک کیا جا سکتا ہے، تو ان تنازعات سے خاص، اور اگلے وقتوں کی سی، دلچسپی پیدا ہو گئی۔ لیکن ۱۹۹۰ء کے عشرے میں جنوب مشرقی یوروپ میں پیش آئے ان جنگی جرائم کو انگیز کرنے کا ایک بڑا طریقہ یہ دیکھنے میں آیا کہ کہا جائے کہ دراصل بلقان کبھی بھی یوروپ کا حصہ نہیں تھا۔) عموماً اندوہناک طور پر مجروح انسانی جسموں کی شائع ہونے والی تصویریں ایشیا یا افریقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ صحافیانہ قاعدہ دور دراز کے — یعنی نوآبادیات کے — انسانوں کی نمائش کے صدیوں پرانے رواج کی باقیات ہے۔ سولھویں صدی سے بیسویں صدی کے اوائل تک افریقیوں اور ایشیا کے دور افتادہ علاقوں کے باشندوں کو لندن، پیرس اور دوسرے یوروپی دارالحکومتوں میں ہونے والی بشریاتی (anthropological) نمائشوں میں چڑیا گھر کے جانوروں کی طرح دکھایا جاتا تھا۔ شیکسپیئر کے *The Tempest* میں کالیبان (Caliban) کا سامنا ہونے پر جو پہلا خیال ٹرنکولو (Trinculo) کے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے انگلستان میں نمائش کے لیے رکھا جا سکتا ہے: "... تفریح پر نکلا ہوا کوئی احمق ایسا نہ ہوگا جو اس کے لیے چاندی کا سکہ دینے کو راضی نہ ہو جائے... جو لوگ کسی لنگڑے فقیر کی مشکل آسان کرنے کی خاطر جیب سے ایک پائی نکالنے کو تیار نہ ہوں، مردہ انڈین کو دیکھنے کے لیے دس بخوشی دے دیں گے۔" دور افتادہ ملکوں کے کالی رنگت والے باشندوں پر توڑے جانے والے مظالم کی تصویریں اسی نمائش کا تسلسل ہیں، ان تاملات سے بالکل بے پروا ہو کر جو

تشدد کا نشانہ بننے والے ہماری طرف کے لوگوں کو منظرِ عام پر لانے میں حائل ہوتے ہیں، کیونکہ دوسرے، خواہ وہ دشمن نہ بھی ہوں، محض "دیکھے جانے والے" ہیں، ہم لوگوں کی طرح "دیکھنے والے" نہیں۔ لیکن آخر اپنی زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے طالبان سے تعلق رکھنے والے جس سپاہی کے انجام کو "نیویارک ٹائمز" میں شائع کیا گیا، اس کے بھی تو بیوی بچے، ماں باپ، بہن بھائی رہے ہوں گے۔ ایک دن ایسا بھی تو آ سکتا ہے کہ ان میں سے کسی کی نظر اخبار میں چھپی ہوئی ان تین تصویروں پر پڑ جائے جس میں ان کے شوہر، باپ، بیٹے یا بھائی کو ہلاک کیے جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے — یا عین ممکن ہے وہ یہ تصویریں دیکھ بھی چکے ہوں۔

۵

جدید توقعات، اور جدید اخلاقی احساس، کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ جنگ، خواہ اسے روکا جانا ناممکن ہی کیوں نہ ہو، معمول سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔ امن معمول کی چیز ہے، خواہ کتنا ہی ناقابلِ حصول کیوں نہ ہو۔ بلاشبہ یہ وہ زاویہ نظر نہیں ہے جس سے جنگ کو تاریخ کے تمام ادوار میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ تاریخ کے لحاظ سے تو جنگ معمول رہی ہے اور امن استثنیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لڑائی کے دوران انسانی جسم ٹھیک کس انداز میں ہلاک اور زخمی ہوئے، اس کا بیان Iliad کے قصوں کا بار بار دہرایا جانے والا نقطۂ عروج ہے۔ جنگ کو ایک ایسے عمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے جسے انسان ایک لت کے طور پر کیا کرتا ہے، اور اس سلسلے میں جنگ کے عائد کردہ مجموعی مصائب کی پروا نہیں کرتا اور جنگ کو لفظوں یا تصویروں میں بیان کرنے کے لیے ایک گہری، بے جھجک علیحدگی درکار ہوتی ہے۔ جب لیونارڈو داونچی لڑائی کا منظر دکھانے والی ایک پینٹنگ کے سلسلے میں ہدایات دیتا ہے تو اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ فنکاروں میں اتنی جرأت اور قوتِ تخیل ہونی چاہیے کہ جنگ کو اس کے پورے بھیانک پن کے ساتھ دکھا سکیں:

> شکست خوردہ اور پٹے ہوئے لوگوں کو اس طرح دکھاؤ کہ ان کی رنگت پیلی پڑی ہوئی ہو، بھنویں اٹھی ہوئی ہوں اور بھنوؤں کے اوپر پیشانی پر اذیت سے بل پڑے ہوئے ہوں... اور دانت یوں کھلے ہوں جیسے وہ چیخ چیخ کر آہ و بکا کر رہے ہوں. . ہلاک ہونے والوں کو پورا یا ادھورا خاک میں سنا ہوا دکھاؤ . . ور خون اپنے سرخ رنگ میں لاشوں سے بہہ بہہ کر خاک میں جذب ہوتا ہوا دکھائی

Scanned with CamScanner

دے۔ جانگی سے گزرتے لوگوں کو دانت پیستے، آنکھیں چڑھاتے، بھنچی ہوئی مٹھیاں اپنے جسموں پر مارتے، اور اپنی ٹانگوں کو درد کے مارے موڑتے ہوئے دکھاؤ۔

فکر یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مطلوبہ منظر مناسب طور پر مضطرب کن نہ بن پائے: درست طور پر ٹھوس اور تفصیلی دکھائی نہ دے۔ رحم کسی اخلاقی فیصلے کی بنیاد صرف اس صورت میں بن سکتا ہے جب، ارسطو کے قول کے مطابق، اسے ایک ایسا جذبہ سمجھا جائے جس کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں جو غیر منصفانہ طور پر کسی بدقسمتی سے گزر رہے ہوں۔ لیکن رحم بدقسمتی پر مبنی بہت سے ڈرامائی سانحوں میں خوف کا ساتھی (توام) نہیں ہوتا بلکہ خوف رحم کے جذبے کو ہلکا کرنے — یا اس پر سے توجہ ہٹانے — کا باعث بنتا ہے، کیونکہ خوف (دہشت یا ہول) عموماً رحم کے جذبے کو دھندلا دیتا ہے۔ لیونارڈو یہ تجویز کر رہا ہے کہ فنکار کی نظر کو، لغوی معنوں میں، بے رحم ہونا چاہیے۔ منظر کو کراہت انگیز ہونا چاہیے، اور اس کی دہشت انگیز ناگواری (terribilita) ہی میں فنکارانہ حسن کا چیلنج پوشیدہ ہے۔

مصوروں کے بنائے ہوئے جنگ کے مناظر کے بارے میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ میدانِ جنگ کا خون آلود منظر حسن کا حامل ہو سکتا ہے — حسن کے ماورائی، ہیبت انگیز یا المناک معنوں میں۔ لیکن یہ تصور اس وقت درست نہیں بیٹھتا جب معاملہ کیمرے سے کھینچے ہوئے مناظر کا ہو۔ جنگی تصویروں میں حسن کو دریافت کرنا سنگ دلی کہلائے گا۔ لیکن اس کے برعکس تباہی کا لینڈ سکیپ آخرکار محض ایک لینڈ سکیپ ہے۔ کھنڈروں میں ایک طرح کا حسن ہوتا ہی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والے حملے کے بعد کے مہینوں میں اس تباہ شدہ عمارت کی تصویروں میں حسن کے وجود کو تسلیم کرنا بڑی ہلکے پن اور بے حرمتی کی بات معلوم ہوتی تھی۔ لوگ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ تصویریں "سُرریئل" معلوم ہوتی ہیں: حسن کے معتوب، مفرور تصور کو جلدی میں بنائے گئے اس پردے کے پیچھے چھپنے کی جگہ ملی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی تصویریں — گیلس پیریس، سوزن میزیلاس (Susan Meiselas) اور جوئل میرووٹز (Joel Meyerowitz) اور دیگر تجربہ کار فوٹوگرافروں کی کھینچی ہوئی — واقعی حسین تھیں۔ خود یہ جائے وقوع، یہ اجتماعی قبرستان جسے "گراؤنڈ زیرو" کا نام دیا گیا، بلاشبہ کسی بھی طرح خوبصورت نہیں تھی۔ فوٹوگراف اپنے موضوع کو، خواہ وہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، متقلب کر دیتا ہے؛ اور اپنے عکس کی صورت میں کوئی شے حسین — یا دہشت ناک، یا ناقابلِ برداشت،

Scanned with CamScanner

یا قابلِ برداشت — ہو سکتی ہے جبکہ حقیقت میں وہ ایسی نہ ہو۔

اشیا کو منقلب کرنا وہ کام ہے جو آرٹ کرتا ہے، لیکن فوٹوگرافی، جس کے ذمے المناک اور مجرمانہ واقعات کی شہادت مہیا کرنا ہے، اگر "جمالیاتی" — گویا آرٹ سے ضرورت سے زیادہ مماثل — دکھائی دے تو تنقید کا ہدف بنتی ہے۔ فوٹوگرافی کی دوہری قوت — یعنی ایک طرف دستاویزی شہادت تیار کرنا اور دوسری طرف بصری آرٹ کے نمونے تخلیق کرنا — فوٹوگرافروں پر عائد اخلاقیات کے غیر معمولی طور پر مبالغہ آمیز تصورات کا باعث بنی ہے۔ پچھلے کچھ عرصے میں عام ہونے والا ایک مبالغہ آمیز تصور وہ ہے جس میں ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جاتا ہے۔ اذیت کا منظر دکھانے والی تصویروں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے، بالکل اسی طرح جیسے ان کے عنوانات کو نصیحت آمیز نہیں ہونا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کی رو سے تصویر کی خوبصورتی دیکھنے والے کی توجہ کو موضوع کی سنگینی سے ہٹا کر ذریعے پر مرکوز کرنے کا باعث بنتی ہے، جس سے تصویر کی دستاویزی حیثیت پر ضرب پڑتی ہے۔ تصویر ایسے ہوئے، متضاد پیغام دینے لگتی ہے۔ کہتی ہے: اسے روکا جانا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی پکارتی ہے، کیا حسین نظارہ ہے!*

پہلی جنگ عظیم کے ایک انتہائی دردناک منظر کی مثال لیجیے: زہریلی گیس سے اندھے ہو جانے والے برطانوی فوجیوں کی قطار — جن میں سے ہر ایک نے اپنے قطار میں اپنے آگے کھڑے ہوئے شخص کے کاندھے پر اپنا بایاں ہاتھ رکھا ہوا ہے اور وہ سب مرہم پٹی کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ جنگ کے موضوع پر بنائی گئی غمناک فلموں میں سے کسی کا منظر ہو سکتا ہے — مثلاً کنگ ویڈور (King Vidor) کی م The Big Parade (۱۹۲۵ء)، جی ڈبلیو پیبسٹ (G W. Pabst) کی *Westfront*

---

* برگن بیلسن، بوخن والڈ اور داخاؤ کی تصویریں، جو اپریل اور مئی ۱۹۴۵ء میں نامعلوم مبصروں اور فوجی فوٹوگرافروں نے کھینچی تھیں، انھیں دو معروف فوٹوگرافروں، مارگریٹ بورک وائٹ (Magaret Bourk-White) اور لی ملر (Lee Miller) کی کھینچی ہوئی "بہتر" تصویروں کے مقابلے میں زیادہ مستند سمجھا گیا۔ لیکن جنگی فوٹوگرافی کے سلسلے میں پیشہ ورانہ نقطۂ نظر پر تنقید کوئی نئی بات نہیں۔ واکر ایونز (Walker Evans) کو مارگریٹ بورک وائٹ کی کھینچی ہوئی تصویریں قابلِ نفرت معلوم ہوئیں۔ لیکن ایونز، جس نے *Let Us Now Praise Famous Men* کے طربیہ عنوان والی کتاب کے لیے غریب امریکی کسانوں کی تصویریں کھینچی تھیں، کبھی کسی مشہور شخص کی تصویر کھینچنے پر تیار نہ ہوتا۔

Scanned with CamScanner

1918، لیوس مائلسٹون (Lewis Milestone) کی *All Quiet on the Western Front* یا ہاورڈ ہاکس (Howard Hawks) کی *The Dawn Patrol* (آخر الذکر تینوں فلمیں ۱۹۳۰ء کی ہیں)۔ اب ماضی پر نظر ڈالنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اہم جنگی فلموں کے لڑائی کے منظروں میں جنگی فوٹوگرافی کی نہ صرف گونج ملتی ہے بلکہ وہ منظر اس سے تحریک پائے ہوئے لگتے ہیں، اور اس حقیقت سے خود فوٹوگرافی کے کام کو نقصان پہنچا۔ اسپیل برگ (Spielberg) کی فلم *Saving Private Ryan* (۱۹۹۸ء) میں ڈی ڈے کو اوماہا کے ساحل پر ہونے والی لینڈنگ دکھانے والے مشہور منظر کو اس بنا پر مستند سمجھا گیا کہ وہ دیگر ماخذوں کے علاوہ ان تصویروں پر بنیاد رکھتا تھا جو رابرٹ کاپا نے بڑی بہادری کے ساتھ لینڈنگ کے دوران کھینچی تھیں۔ لیکن کسی جنگی تصویر کو، جب وہ کسی فلم کے منظر سے مشابہ ہو، غیر مستند سمجھا جانے لگتا ہے، خواہ وہ قطعی سٹیج کی ہوئی نہ ہو۔ عالمی مصائب (جنگ کے نتائج، اور ان کے علاوہ دوسرے سانحات) کی فوٹوگرافی میں خصوصی مہارت رکھنے والا فوٹوگرافر سباستیاؤ ساگالدو (Sebastiao Sagaldo) خوبصورت تصویروں کے عدم استناد کے خلاف چلائی جانے والی حالیہ مہم کا خاص نشانہ رہا ہے۔ خاص طور پر اس کے سات سالہ منصوبے کے سلسلے میں جسے اس نے *Migrations· Humanity in Transition* کا عنوان دیا ہے، ساگالدو پر اس بات پر مسلسل حملے کیے جاتے رہے ہیں کہ وہ نہایت دیدہ زیب، حسین تصویریں کھینچتا ہے، جنھیں ''سنیمائی'' (cinematic) قرار دیا جاتا ہے۔ ساگالدو کی تصویروں کی نمائشیں جس طرح ''فیملی آف مین'' قسم کی خطابت سے آلودہ ہوتی ہیں، وہ اس کی تصویروں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، خواہ یہ بات کتنی ہی غیر منصفانہ کیوں نہ ہو۔ (انتہائی قابل تعریف باضمیر فوٹوگرافروں میں سے بعض کے اعلانات میں بہت سی بناوٹی باتیں ملتی ہیں، جنھیں نظر انداز کر دیا جانا چاہیے۔) ساگالدو کے کھینچے ہوئے ستم رسیدہ لوگوں کے پورٹریٹ جس قسم کی تجارتی صورت حال میں دیکھے جاتے ہیں، اس کے ردعمل کے طور پر ان پر کڑی تنقید کی جاتی ہے۔ لیکن اصل مسئلہ ان تصویروں کے اندر ہے، اس میں نہیں کہ انھیں کیسے اور کس جگہ نمائش کے لیے رکھا گیا ہے: مسئلہ یہ ہے کہ یہ تصویریں بے طاقت انسانوں کو اپنی بے طاقتی میں گھٹ کر رہ جانے کی حالت میں دکھاتے ہیں۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ ان بے طاقت لوگوں کے نام عنوانات میں نہیں دیے جاتے۔ جس پورٹریٹ میں دکھائے جانے والے شخص کا نام ظاہر نہ کیا گیا ہو وہ، نادانستگی

Scanned with CamScanner

ہی میں سہی، مشہور لوگوں سے شیفتگی کے اس رجحان کا حصے دار بن جاتا ہے جس نے بالکل متضاد قسم کی تصویروں کی بے پناہ طلب پیدا کردی ہے۔ یہ اصول کہ صرف مشہور لوگوں کو ان کے نام سے پہچانا جائے گا، باقی تمام لوگوں کو ان کے پیشے، نسلی پس منظر، یا ان پر پڑنے والی ابتلا کی نمائندہ حیثیت تک محدود کر دیتا ہے۔ سالگادو کی اتالیس ملکوں میں کھینچی ہوئی مہاجرت کی تصویریں بے شمار اسباب سے ہونے والی اور مختلف نوعیت کی بے دخلیوں اور جلاوطنیوں کو اس واحد عنوان کے تحت جمع کر دیتی ہیں۔ مصائب کو عالمی حیثیت دے کر، انھیں زیادہ بڑا دکھا کر، لوگوں کو شاید یہ سوچنے پر اکسایا جا سکتا ہے کہ انھیں زیادہ "پروا" کرنی چاہیے۔ اس سے انھیں یہ محسوس کرنے کی بھی تحریک ملتی ہے کہ یہ مصائب اور بدقسمتیاں اتنی وسیع، اتنی ناقابل تلافی (irrevocable) اور اتنی رزمیہ نوعیت کی ہیں کہ صرف مقامی سیاسی مداخلت سے ان کا مداوا نہیں کیا جا سکتا۔ جب موضوع کا تصور اس وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے تو رحم کا جذبہ محض ٹھوکریں کھا سکتا ہے — یا اسے تجرید کے طور پر دیکھ سکتا ہے۔ لیکن تمام سیاست، تمام تاریخ کی طرح، ٹھوس ہوتی ہے۔ (یہ بات یقینی ہے کہ کوئی بھی شخص جو تاریخ کے بارے میں واقعی سوچتا ہے، وہ سیاست کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔)

جب تک صاف دکھائے ہوئے مناظر اتنے عام نہیں ہوئے تھے، تب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جس شے کو دکھائے جانے کی ضرورت ہے اسے دکھا کر، یعنی کسی تکلیف دہ حقیقت کو لوگوں کے قریب لا کر، انھیں اس کے بارے میں زیادہ شدت سے محسوس کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں فوٹوگرافی صارفیت کے ہتھکنڈوں کی موثر غلامی کر رہی ہے، وہاں کسی المناک منظر کی تصویر کی اثرانگیزی کو یقینی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے نتیجے میں احساسات (رحم، ہمدردی، ناگواری) کے استحصال کے مسئلوں اور احساسات کو ابھارنے کے مروجہ طریقوں کے بارے میں اخلاقی طور پر حساس فوٹوگرافروں اور فوٹوگرافی کے نظریہ سازوں کی تشویش بڑھتی جا رہی ہے۔

فوٹوگرافی کے ذریعے گواہی دینے والے لوگ ممکن ہے اس بات کو اخلاقی طور پر زیادہ درست خیال کریں کہ دیدہ زیب منظر کو غیر دیدہ زیب بنا دیا جائے۔ لیکن دیدہ زیبی مذہبی بیانیوں کا ایک مستقل جز ہے جس کے ذریعے انسانی مصائب کو، بیشتر مغربی تاریخ کے دوران، سمجھا جاتا رہا ہے۔ جنگ یا قدرتی آفات کے دوران کھینچی گئی بعض تصویروں میں سیحی علامت سازی کی دھڑکن کو محسوس کرنا کوئی

Scanned with CamScanner

جذباتی مبالغہ نہیں ہے۔ ڈبلیو یوجین سمتھ کی جس تصویر میں مناماتا کی ایک عورت کو اپنی مسخ اعضا والی اندھی اور بہری بچی کو گود میں لیے دکھایا گیا ہے، اس میں ننھے یسوع اور مریم کی روایتی تصویروں کی، اور ڈون میکیولن کی کھینچی ہوئی ویت نام میں مرتے ہوئے امریکی فوجیوں کی تصویروں میں صلیب سے اتارے جاتے ہوئے مسیح کی شبیہ کی جھلک نہ دیکھنا بہت دشوار ہے۔ تاہم اس قسم کی مشابہتوں کا احساس — جو حسن اور الوہیت کا تاثر پیدا کرتا ہے — شاید اب زوال پذیر ہے۔ جرمن تاریخ داں باربرا ڈیوڈن (Barbara Duden) کا کہنا ہے کہ چند برس پہلے، ایک بڑی امریکی یونیورسٹی میں انسانی جسم کی مصوری کی تاریخ پڑھاتے ہوئے، جب اس نے مسیحی شلق زنی (Flagallation) کی معروف پینٹنگز کی سلائیڈز دکھائیں تو انڈر گریجویٹ کلاس کے بیس طالب علموں میں سے ایک بھی کسی پینٹنگ کو شناخت نہ کر سکا۔ (ان میں سے ایک نے محض اتنا کہا، "میرا خیال ہے یہ کوئی مذہبی پینٹنگ ہے۔") یسوع کی جس شبیہ کے بارے میں وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ بیشتر طالب علم پہچان لیں گے وہ مصلوب کیے جانے والی شبیہ تھی۔

*

فوٹوگراف اپنے موضوع کو شے میں بدل ڈالتے ہیں وہ کسی واقعے یا انسان کو کسی ایسی شے میں منقلب کر دیتے ہیں جسے اپنے قبضے میں لیا جا سکے۔ اور حقیقت کے شفاف بیان کے طور پر ان کی اہمیت کے باعث انھیں ایک قسم کی کیمیا (alchemy) سمجھا جا سکتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شے تصویر میں بہتر دکھائی دیتی ہے، یا لوگ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بہتر دکھائی دے رہی ہے۔ بلاشبہ یہ فوٹوگرافی کا ایک منصب ہے کہ اشیا کی عمومی صورت کو بہتر بنا دیتی ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ آدمی، اپنی تصویر کو دیکھ کر، اگر اس میں اس کی صورت اصل سے بہتر دکھائی نہ دے رہی ہو، مایوس ہو جاتا ہے۔) حسن کاری کیمرے کا ایک کلاسیکی عمل ہے، اور اس کے باعث جو کچھ تصویر میں دکھایا گیا ہے اس پر ہونے والا اخلاقی ردعمل ماند پڑ جاتا ہے۔ قبح کاری، یعنی کسی شے کو تصویر میں اس کی بدترین شکل میں دکھانا، فوٹوگرافی کا ایک جدید منصب ہے: یہ ناصحانہ نوعیت کا عمل ایک متحرک ردعمل کی دعوت دیتا ہے۔ اگر تصویریں کسی طرزِ عمل کی مذمت کرنا یا ممکنہ طور پر اسے تبدیل کرنا چاہتی ہیں، تو ان کا صدمہ انگیز ہونا ضروری ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک مثال. چند سال پہلے کینیڈا میں، جہاں تخمینے کے مطابق ہر سال پینتالیس ہزار افراد تمباکونوشی کے باعث ہلاک ہو جاتے ہیں، صحت عامہ کے حکام نے سگریٹ کے ہر ڈبے پر لکھی ہوئی انتباہ کی عبارت کے ساتھ سرطان زدہ پھیپھڑوں، خون کے تھکے جمے ہوئے دماغ، بیمار دل، یا سڑتے ہوئے دانتوں والے منھ کی صدمہ انگیز تصویر بھی شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بارے میں کی جانے والی ایک تحقیق نے، کسی نہ کسی بنیاد پر، یہ تخمینہ لگایا کہ انتباہ کے ساتھ ایسی تصویر چھاپنے سے انتباہ کا اثر ساٹھ گنا بڑھ جائے گا اور لوگوں کو تمباکونوشی ترک کرنے پر آمادہ کر سکے گا۔

فرض کر لیتے ہیں کہ یہ درست ہے۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ یہ اثر کب تک رہے گا؟ کیا صدمے کی محدود میعاد ہوتی ہے؟ ان دنوں کینیڈا کے سگریٹ نوش، اگر وہ ان تصویروں پر نظر ڈالتے ہوں، ناگواری کا تشنج محسوس کر رہے ہوں گے۔ کیا اب سے پانچ سال بعد کے سگریٹ نوشوں کا بھی یہی ردعمل ہوگا؟ صدمہ ایسی چیز ہے جس سے آدمی مانوس ہو سکتا ہے۔ صدمہ رفتہ رفتہ اپنے اثر سے محروم ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو آدمی صدمہ انگیز شے کو نہ دیکھنے کا انتخاب کر سکتا ہے۔ جو چیز لوگوں کو اضطراب میں مبتلا کرے ___ جیسے اوپر دی گئی مثال میں سگریٹ نوشی جاری رکھنے کے خواہش مند لوگوں کو دی جانے والی ناخوشگوار اطلاع ___ وہ اس سے اپنی مدافعت کا ذریعہ پا سکتے ہیں۔ اس کا عادی ہو جانا ایک نارمل بات ہے۔ جس طرح لوگ حقیقی زندگی میں ہولناکیوں کے عادی ہو جاتے ہیں، اسی طرح وہ بعض مناظر میں دکھائی گئی ہولناکیوں سے بھی مانوس ہو سکتے ہیں۔

اس کے باوجود، ایسی مثالیں موجود ہیں کہ صدمہ، غمناکی، تنفر پیدا کرنے والے مناظر کے بار بار دیکھے جانے کے باوجود ان پر ہونے والا پرجوش ردعمل ختم نہ ہوا۔ ان کا عادی ہونا کوئی خودکار عمل نہیں ہے، کیونکہ تصویریں (جنھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے، کسی جگہ بھی شامل کیا جا سکتا ہے) اصل زندگی سے مختلف قواعد کی پابندی کرتی ہیں۔ یسوع کے صلیب پر چڑھائے جانے کی نمائندگی کرنے والے مناظر ایمان والوں کے لیے، اگر وہ واقعی ایمان رکھتے ہوں، کبھی پیش پاافتادہ نہیں ہوتے۔ یہ بات اسٹیج کیے جانے والے مناظر کے لیے اور زیادہ درست ہے۔ جاپانی تہذیب کے غالباً معروف ترین بیانیے ''چوشن گورا'' (Chushingura) کی اسٹیج پر پیش کش کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جس منظر میں آسانو دیوتا کو اس مقام کی طرف جاتے ہوئے جہاں اسے سپّوکو

(seppuku) کرتا ہے، راستے میں چیری کے پھولوں کو دیکھ کر متاثر ہوتے دکھایا گیا ہے، اسے دیکھ کر جاپانی تماشبین سسکیاں لیے بغیر نہیں رہیں گے، خواہ وہ اس منظر کو اس سے پہلے کتنی ہی بار — کابوکی (Kabuki) یا بونراکو (Bunraku) کھیل کی صورت میں یا فلم کے پردے پر — دیکھ چکے ہوں۔ امام حسین سے کی جانے والی غداری اور ان کی شہادت کا جو منظر تعزیہ کے نام سے ایران میں کھیلا جاتا ہے، ایرانیوں کی آنکھوں میں آنسو لائے بغیر نہیں رہتا، خواہ وہ ان کا کتنی ہی بار کا دیکھا ہوا کیوں نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس، ان کی رقت کو اس سے جزوی طور پر تحریک ملتی ہے کہ وہ اس منظر سے مانوس ہیں۔ لوگ رونا چاہتے ہیں۔ کسی بیانیے کی صورت میں پیش کی جانے والی دردناکی کبھی مدھم نہیں پڑتی۔

لیکن کیا لوگ دہشت زدہ بھی ہونا چاہتے ہیں؟ غالباً نہیں۔ اس کے باوجود ایسی تصویریں موجود ہیں جن کی طاقت کبھی زائل نہیں ہوتی، جزوی طور سے اس باعث کہ انھیں اکثر نہیں دیکھا جا سکتا۔ مسخ شدہ چہروں کی تصویریں ہمیشہ یہ شہادت دیتی ہیں کہ جھیلی جانے والی ابتلا کتنی بڑی تھی اور اس کی کیا قیمت ادا کی گئی۔ پہلی جنگِ عظیم میں خندقوں کی جہنمی آگ میں بچ جانے والے زخمی فوجیوں کے ہولناک حد تک مسخ شدہ چہرے، ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے امریکی ایٹم بموں کا شکار ہو کر بچ جانے والوں کے پگھل کر جم جانے والے زخموں سے ڈھکے ہوئے چہرے؛ روانڈا میں ہوتوؤں کی چلائی ہوئی توتسیوں کی نسل کشی کی مہم میں بچ جانے والوں کے، کلہاڑوں کے زخم کھائے ہوئے چہرے — کیا ان مناظر کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ لوگ ان کے عادی ہو سکتے ہیں؟

بلاشبہ جنگی جرائم اور مظالم کا تصور ہی تصویری شہادت کی توقعات سے وابستہ ہے۔ یہ شہادت عموماً بعد از وقوعہ کھینچی جانے والی تصویروں، مظالم کی باقیات کی تصویروں پر مشتمل ہوتی ہے — کمبوڈیا میں پول پاٹ (Pol Pot) کے ہلاک کیے ہوؤں کی کھوپڑیوں کے ڈھیر، گواتے مالا اور ال سلوادور، بوسنیا اور کوسووو میں پائی جانے والی اجتماعی قبریں۔ اور یہ بعد از وقوعہ حقیقت بیشتر صورتوں میں ان واقعات کا موثر ترین (keenest) خلاصہ پیش کرتی ہے۔ جیسا کہ ہنّا آرنٹ (Hannah Arendt) نے دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے فوراً بعد نشان دہی کی تھی، کنسنٹریشن کیمپوں کی تصویریں اور نیوز ریلیں گمراہ کن ہیں، کیونکہ یہ ان کیمپوں کا اُس لمحے کا منظر پیش کرتی ہیں جب اتحادی فوجیں وہاں داخل ہوئیں۔ جو چیز ان مناظر کو ناقابلِ برداشت بناتی ہے — لاشوں کے ڈھیر، ہڈیوں کے ڈھانچوں

Scanned with CamScanner

جیسے زندہ قیدی— وہ ان کیمپوں کا عمومی منظر ہرگز نہیں تھا، جہاں ان کی سرگرمی کے دنوں میں قیدیوں کو باقاعدگی سے (گیس کے ذریعے، نہ کہ بھوک یا بیماری کے ہاتھوں) ہلاک کیا جاتا اور پھر فوراً سپردِ آتش کر دیا جاتا تھا۔ اور تصویریں دوسری تصویروں کی یاد دلاتی ہیں: اومارسکا، شمالی بوسنیا، میں ۱۹۹۲ء میں سربوں کے قائم کیے ہلاکت کے کیمپوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بنے بوسنیائی قیدیوں کی تصویریں دیکھ کر ۱۹۴۵ء کے نازی کیمپوں میں کھینچی گئی تصویریں کا یاد آنا ناگزیر تھا۔

مظالم کی تصویریں نہ صرف مثالیں پیش کرتی ہیں بلکہ حقائق کی تصدیق بھی کرتی ہیں۔ اس بحث سے دامن بچاتے ہوئے کہ کتنے لوگ ہلاک کیے گئے (ابتدا میں عموماً تعداد کو بڑھا کر بیان کیا جاتا ہے)، تصویریں نہ مٹنے والی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ مثالیں پیش کرنے کا یہ عمل آرا، تعصبات، تخیلات اور غلط اطلاعات پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ یہ اطلاع کہ جنین پر اسرائیلی حملے میں ہلاک ہونے والے فلسطینیوں کی تعداد اس سے بہت کم تھی جتنا فلسطینی اہلکاروں نے دعویٰ کیا تھا (یہ بات اسرائیلی شروع سے کہتے آ رہے تھے) اتنی اثر انگیز ثابت نہیں ہوئی جتنی اس مہاجر کیمپ کے مسمار کیے ہوئے مرکزی حصے کی تصویریں۔ اور بلاشبہ جو مظالم ہمارے ذہنوں میں معروف تصویروں کے ذریعے سے محفوظ نہیں ہوئے ہیں، یا جن کی تصویریں ہی بہت کم کھینچی گئی ہیں، وہ بہت دور کی بات معلوم ہوتے ہیں— ۱۹۰۴ء میں جرمن نوآبادیاتی انتظامیہ کے حکم پر نمیبیا کے ہیریرو قبیلے کے لوگوں کا مکمل صفایا؛ دسمبر ۱۹۳۷ء میں چین پر جاپانی حملہ، خصوصاً چار لاکھ چینی باشندوں کا قتل اور تیس ہزار عورتوں اور لڑکیوں کو زنا بالجبر کا نشانہ بنایا جانا، جسے "ریپ آف نانکنگ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؛ ۱۹۴۵ء میں برلن فتح کرنے والے سوویت فوجیوں کا اپنے کمان افسروں کی حوصلہ افزائی پر ایک لاکھ تیس ہزار عورتوں اور لڑکیوں کو ریپ کرنا (جن میں سے دس ہزار نے بعد میں خودکشی کر لی)۔ یہ وہ یادیں ہیں جن پر کسی کا دعویٰ نہیں۔

بعض تصویروں سے ہماری مانوسیت ہمارے حال اور ماضیِ قریب کے احساس کی تشکیل کرتی ہے۔ تصویریں حوالے کی راہیں متعین کرتی ہیں، اور اسباب کی منتخب علامات (totems) کے طور پر کام آتی ہیں۔ جذبات کا کسی زبانی نعرے کے مقابلے میں کسی تصویر پر مرکوز ہو کر ٹھوس شکل اختیار کرنا زیادہ اغلب معلوم ہوتا ہے۔ اور تصویریں ہی ہمارے ماضیِ بعید کے احساس کی تشکیل— اور ازسرِنو تشکیل— میں مددگار ہوتی ہیں، جب ایسی صدمہ انگیز تصویریں شائع اور نشر ہوتی ہیں جو اب تک نامعلوم رہی

تھیں۔ سب کی جانی پہچانی تصویریں اب ان اشیا کا ناگزیر حصہ ہیں جن کے بارے میں کوئی معاشرہ سوچتا ہے، یا سوچنے کا اعلان کرتا ہے۔ وہ ان خیالات کو "یادوں" کا نام دیتا ہے، اور یہ، طویل مدتی اعتبار سے، محض افسانہ ہے۔ درست معنوں میں اجتماعی یادداشت کا کوئی وجود نہیں ہوتا — یہ اور اجتماعی احساس جرم مصنوعی تصورات کے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اجتماعی تربیت یقیناً وجود رکھتی ہے۔

تمام یادداشت انفرادی ہوتی ہے، اور اسے دہرایا نہیں جا سکتا — یہ کسی فرد کی موت کے ساتھ ہی مٹ جاتی ہے۔ جس شے کو اجتماعی یادداشت کہا جاتا ہے وہ یاد رکھنے کا نہیں بلکہ اصرار کرنے کا عمل ہے: کہ یہ شے اہم ہے، کہ یہ بات جس طرح پیش آئی تھی اس کی کہانی یہ ہے، اور تصویریں ہمارے ذہنوں میں اس کہانی کو پیوست کر دیتی ہیں۔ نظریات مناظر کا، نمائندہ مناظر کا، ایسا ذخیرہ خلق کرتے ہیں جو ان کے لیے دلیل یا ثبوت کا کام دے سکے، جو مشترک اہم تصورات پیدا کر سکے اور مطلوبہ (قابل پیش بینی) خیالات اور احساسات کو تحریک دے سکے۔ پوسٹر پر چھاپے جانے کے لیے موزوں تصویریں — ایٹم بم کے تجربات کی علامت کھمبی کی شکل کا بادل، مارٹن لوتھر کنگ جونیئر واشنگٹن ڈی سی میں لنکن کی یادگار پر تقریر کرتے ہوئے، چاند کی سطح پر چہل قدمی کرتے ہوئے خلا باز — ساؤنڈ بائیٹس (sound bites) کا بصری ہم ابدل ہیں۔ یہ اسی براہِ راست انداز میں اہم تاریخی لمحوں کی یاد مناتے ہیں جیسے ڈاک کے ٹکٹ؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تصویروں میں سے فتح کے موقعوں کی تصویریں، ایٹم بم کے بادل کو چھوڑ کر، ڈاک کے ٹکٹوں پر شائع ہو بھی چکی ہیں۔ خوش قسمتی سے ہلاکت کے نازی کیمپوں کی ایسی کوئی علامتی تصویر نہیں ہے۔

جس طرح جدیدیت کی ایک صدی کے دوران آرٹ کی تعریف نئے سرے سے متعین کی گئی — کہ ہر وہ چیز جسے آخرکار کسی نہ کسی طرح کے میوزیم میں رکھا جانا مقسوم ہو وہ آرٹ ہے — اسی طرح اب بہت سے تصویری ذخیروں کی یہ تقدیر ہے کہ انھیں میوزیم جیسے اداروں میں نمائش کے لیے رکھا اور محفوظ کیا جائے۔ ان تصویروں اور دیگر تبرکات کے عوامی ذخیرے قائم کرنے کا مقصد اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ یہ جن جرائم کو دکھاتے ہیں وہ لوگوں کے ذہنوں میں برقرار رہیں۔ اسے یاد رکھنا کہا جاتا ہے، لیکن اصل میں یہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے۔

Scanned with CamScanner

یادداشت کے عجائب خانے، اپنی موجودہ کثرت میں، اس طرزِ فکر اور طرزِ سوگواری کی پیداوار ہیں جس کے تحت ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے عشروں میں ہونے والی یورپ کے یہودیوں کی تباہی نے یروشلم کے یادواشیم (Yad Vashem)، واشنگٹن ڈی سی کے ہولوکاسٹ میوزیم اور برلن کے جیوش میوزیم نامی عجائب خانوں میں ادارے کی صورت اختیار کی۔ شواہ (Shoah) کی تصویروں اور دوسری یادگاروں کو متواتر گردش میں رکھا جاتا ہے، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اسے یاد رکھا جائے۔ لوگوں کے ایک گروہ کے مصائب اور شہادت کا حال بیان کرنے والی تصویریں موت، ناکامی اور ستم رسیدگی کی یاددہانیوں سے کہیں زیادہ حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ان تمام مصائب کے باوجود زندہ رہ جانے کے معجزے کو بیان کرتی ہیں۔ یادوں کو برقرار رکھنے کے عمل کا مقصد، ناگزیر طور پر، یہ نکلتا ہے کہ یادوں کی مسلسل تجدید/متواتر تخلیقِ نو کا کام ہاتھ میں لے لیا گیا ہے۔۔۔ اور اس عمل میں سب سے زیادہ مدد علامتی حیثیت اختیار کر لینے والی تصویروں سے ملتی ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنی یادوں کی طرف لوٹ کر جا سکیں، اور انھیں تازہ کر سکیں۔ اب ستم رسیدہ لوگوں کے بہت سے گروہ یادوں کا عجائب خانہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یعنی وہ معبد جس میں ان کے مصائب کا جامع، زمانی ترتیب رکھنے والا باتصویر بیانیہ سجا کر رکھا جائے۔ مثال کے طور پر آرمینی بہت عرصے سے عثمانی ترکوں کے ہاتھوں آرمینیوں کے قتلِ عام کی یاد کو واشنگٹن میں ایک ادارے کی صورت دیے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن آج تک اس دارالحکومت میں، جس کی آبادی کی اکثریت اب بھی افریقی امریکیوں پر مشتمل ہے، غلامی کی تاریخ کا میوزیم کیوں موجود نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں کسی مقام پر بھی غلامی کی تاریخ کو مکمل طور پر بیان کرنے والا میوزیم۔۔۔ پوری کہانی سنانے والا، جو افریقہ میں غلاموں کی تجارت سے شروع ہوتی ہے، نہ کہ کہانی کے محض منتخب حصے، مثلاً زیرِزمیں ریلوے کا قصہ بیان کرنے والا ۔۔۔ موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ ایک ایسی یاد ہے جسے بیدار اور تخلیق کرنا سماجی استحکام کے لیے بہت خطرناک سمجھا گیا ہے۔ ہولوکاسٹ کی یادگار کا میوزیم، اور مستقبل کا آرمینیوں کی نسل کشی کا میوزیم اُن واقعات کی یاد دلاتے ہیں جو امریکہ میں پیش نہیں آئے تھے، چنانچہ یاددہانی کے کام سے ملکی آبادی کے کسی ناراض (embittered) گروہ کے اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ افریقیوں کو غلام بنانے کے جس عظیم جرم کا ارتکاب امریکہ میں کیا گیا تھا اسے میوزیم کی صورت دینے کا مطلب یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ

Scanned with CamScanner

اس شر کا محلِ وقوع "یہ جگہ" تھی۔ امریکی ایسے شر کا تصور کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جو "کہیں اور" پیش آیا ہو، جس سے امریکہ — جو اس لحاظ سے دنیا کا منفرد ملک ہے کہ اس کی پوری تاریخ میں اس کے رہنماؤں کو قابلِ تصدیق طور پر بدمعاش قرار نہیں دیا گیا۔ مستثنیٰ ہے۔ یہ خیال کہ یہ ملک، ہر دوسرے ملک کی طرح، اپنا المناک ماضی رکھتا ہے، امریکہ کی استثنائی حیثیت پر بنیادی، اور ہنوز صل قطور، اعتقاد کے ساتھ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ امریکی تاریخ کو ترقی کی تاریخ کے طور پر دیکھنے کا قومی اتفاقِ رائے وہ پس منظر فراہم کرتا ہے جس کے مقابل ان تمام زیادتیوں کو، خواہ وہ یہاں کی ہوں یا کہیں اور کی، دیکھا جاتا ہے، جن کا علاج یا حل امریکہ کے خیال میں اس کے پاس موجود ہے۔

❁

سائبر ماڈلوں کے اس دور میں بھی ذہن کی خواہش ایک داخلی جگہ حاصل کرنے کی ہوتی ہے — جیسے قدیم انسانوں کے تصور میں ہوتی تھی — جیسے کوئی تھیٹر، جس میں ہم کسی شے کو تصویر کی شکل دے سکیں، اور یہی تصویریں ہمیں یاد رکھنے کا موقع دیتی ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ تصویروں کے سہارے کسی شے کو یاد رکھتے ہیں، بلکہ یہ کہ وہ صرف تصویروں کو یاد رکھتے ہیں۔ تصویروں کے ذریعے یاد رکھنے کا یہ عمل تفہیم کے، اور چنانچہ یاد رکھنے کے، دوسرے تمام طریقوں کو گہنا دیتا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں نازی ازم اور دوسری جنگِ عظیم کے آوردہ مصائب بیشتر کنسنٹریشن کیمپوں کی تصویروں کی شکل میں محفوظ ہیں، جو ۱۹۴۵ء میں انھیں آزاد کرانے کے موقعے پر کھینچی گئی تھیں۔ نسل کشی، بھوک اور وبائی بیماریوں کے نتیجے میں ہونے والی ہولناک اموات ہی وہ واحد شے ہیں جو بعد از نوآبادیاتی دور کے افریقہ میں پیش آنے والی تمام ناانصافیوں اور ناکامیوں میں سے لوگوں کے ذہنوں میں باقی رہ گئی ہیں۔

یاد کرنے کا عمل، روز بروز، کسی کہانی کو یاد کرنے کا نہیں بلکہ کسی تصویر کو ذہن میں لا سکنے کا مترادف ہوتا جاتا ہے۔ ڈبلیو جی سیبالڈ (W. G. Sebald) جیسا ادیب بھی، جو انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل کی ادبی متانت میں رچا ہوا ہے، گمشدہ زندگیوں، گمشدہ فطرت، گمشدہ شہری ترتیب (cityscapes) کی نوحہ گری کے بیانیے کو تصویروں کی بنیاد پر استوار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ سیبالڈ محض ایک نوحہ خواں نہیں تھا، بلکہ متشدد نوحہ خوں تھا۔ وہ محض خود یاد رکھنے پر قانع نہ تھا، بلکہ چاہتا تھا کہ اس کے پڑھنے والے بھی یاد رکھیں۔

Scanned with CamScanner

ہوں کہ تصویریں ناگزیر طور پر اپنے صدمہ انگیز اثر سے محروم نہیں ہوتیں۔ لیکن اگر سوال کسی معاملے کو سمجھنے کا ہو تو یہ زیادہ کام نہیں آتیں۔ بیانیے سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ تصویریں جو کام کرتی ہیں وہ اس سے مختلف ہے: وہ ہمارے ذہنوں پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ بوسنیا کی جنگ کے ایک ناقابل فراموش منظر کا تصور کیجیے، اُس تصویر کا جس کے بارے میں "نیویارک ٹائمز" کے بیرونی نامہ نگار جان کِفنر (John Kifner) نے لکھا تھا: "یہ ایک صریح منظر ہے، بلقان کی جنگوں کا سب سے پائیدار منظر: ایک سرب فوجی ایک مرتی ہوئی مسلمان عورت کے سر پر بے پروائی سے ٹھوکر مار رہا ہے۔ اس سے وہ سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔" لیکن ظاہر ہے کہ یہ تصویر ہمیں وہ سب کچھ بتانے سے قاصر ہے جو ہم جاننا چاہتے ہیں۔

اس تصویر کے فوٹو گرافر رون حبیب (Ron Haviv) کی دی ہوئی تفصیل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر بیلنا (Bijeljina) نامی قصبے میں اپریل ۱۹۹۲ء میں کھینچی گئی تھی، جو سربوں کے بوسنیا پر ٹوٹ پڑنے کا پہلا مہینہ تھا۔ ہم سرب ملیشیا کے سپاہی کو پشت کی طرف سے دیکھتے ہیں، ایک نوعمر کی شبیہ جو اپنے دھوپ کے چشمے کو سر پر چڑھائے ہوئے اور بائیں ہاتھ کی دوسری اور تیسری انگلی کے درمیان سگریٹ اٹکائے ہوئے ہے، جبکہ رائفل اس کے داہنے ہاتھ میں جھول رہی ہے اور داہنا پیر فٹ پاتھ پر دو اور لاشوں کے درمیان اوندھے منھ پڑی ہوئی عورت کے سر پر ٹھوکر مارنے کے لیے ہوا میں اٹھا ہوا ہے۔ تصویر ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ یہ عورت مسلمان ہے، اگرچہ اسے کوئی اور شناخت دینا غیر اغلب ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دوسری دو لاشوں کے ساتھ مردہ حالت میں ("مرتی ہوئی" کیوں؟)، سرب فوجیوں کی نگاہوں کے سامنے کیوں پڑی ہوتی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصویر ہمیں بہت کم اطلاعات مہیا کرتی ہے — سوائے اس کے کہ جنگ بڑی جہنمی شے ہے، اور یہ کہ بندوق بردار خوبرو نوجوان بڑی عمر کی فربہ عورتوں کے سروں پر، جبکہ وہ بے بسی کے عالم میں پڑی ہوں، ٹھوکر مارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

بوسنیا میں پیش آنے والی سفاکیوں کی تصویریں ان واقعات کے فوراً بعد دیکھی گئی تھیں۔ ویت نام کی تصویروں کی طرح، مثلاً رون ہیبرلے (Ron Heberle) کی تصویریں جن میں، مارچ ۱۹۶۸ء میں مائی لائی کے گاؤں میں امریکی فوجیوں کی ایک کمپنی کے ہاتھوں تقریباً پانچ سو نہتے دیہاتیوں کے قتل عام کی شہادت سامنے لائی گئی تھی، بوسنیا کی جنگ کی تصویریں بھی ایک ایسی جنگ کے خلاف مزاحمت

بیدار کرنے میں بہت اہم ثابت ہوئیں جو ناگزیر نہیں تھی، جس کے اسباب معلوم کیے جاسکتے تھے اور جسے اس سے بہت پہلے روکا جا سکتا تھا۔ چنانچہ آدمی ان تصویروں کو دیکھنا، خواہ وہ کتنی ہی ناقابلِ برداشت کیوں نہ ہوں، اپنی ذمے داری سمجھ سکتا تھا، کیونکہ یہ جو کچھ پیش کرتی تھیں اس کے سلسلے میں فوری طور پر کچھ کرنا ضروری تھا۔ لیکن جب ہم سے بہت پرانے زمانے میں ہونے والی سفاکیوں کی ایسی تصویروں کے دفتر پر نگاہ ڈالنے کو کہا جائے جو اب تک نامعلوم رہی تھیں، تب دوسری طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

ایک مثال: ۱۸۹۰ء اور ۱۹۳۰ء کے عشروں کے درمیان امریکہ کے دیہاتوں میں ہجوم کے ہاتھوں ہلاک (lynch) ہونے والے سیاہ فام باشندوں کی تصویروں کا ایک بڑا ذخیرہ، جو ۲۰۰۰ء میں نیویارک کی ایک گیلری میں انھیں دیکھنے والوں کے لیے ایک تباہ کن اور پُرانکشاف تجربہ ثابت ہوا۔ لنچنگ کی یہ تصویریں ہمیں انسانی خباثت کے بارے میں بتاتی ہیں۔ اور انسان کے غیرانسانی پن کے بارے میں۔ وہ ہمیں اس شر کی حدود کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں جسے خاص نسل پرستی نے جنم دیا تھا۔ اس شرانگیزی کے ارتکاب میں یہ بے حیائی بھی شامل تھی کہ اسے فوٹوگرافی کے ذریعے ریکارڈ کیا جائے۔ ان تصویروں کو یادگاروں کے طور پر رکھا جاتا تھا اور ان میں بعض کو پوسٹ کارڈوں کی صورت میں چھاپا بھی گیا؛ ان میں سے بہت سی تصویروں میں باقاعدگی سے گرجا گھر جانے والے اچھے شہریوں کو (کیونکہ ان میں سے بیشتر لازمی طور پر عبادت گزار تھے) کیمرے کے سامنے پوز بنا کر ہنستے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے، جبکہ تصویر کے پیش منظر میں ایک ننگی، جلی ہوئی، مثلہ شدہ لاش کسی پیڑ سے جھول رہی ہے۔ ان تصویروں کی نمائش ہمیں بھی تماشبین بنا دیتی ہے۔

ایسی تصویروں کی نمائش کا کیا مقصد ہے؟ ہم میں غم و غصہ پیدا کرنا؟ "ناگواری"، یعنی تنفر اور رنج کا احساس پیدا کرنا؟ سوگ منانے میں ہماری مدد کرنا؟ کیا ایسی تصویروں پر، جن کا تعلق اتنی پرانی ہولناکیوں سے ہے کہ ان پر کسی کو سزا دینا ممکن نہیں رہا، نگاہ ڈالنا واقعی ضروری ہے؟ کیا انھیں دیکھ کر ہم بہتر لوگ بن جاتے ہیں؟ کیا یہ واقعی ہمیں کچھ سکھاتی ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ تصویریں اس کی تصدیق کرتی ہیں جو ہم پہلے سے جانتے ہیں (یا جاننا چاہتے ہیں)؟

یہ تمام سوالات اس نمائش کے دوران اور بعد میں، جب انھیں Without Sanctuary

Scanned with CamScanner

نامی کتاب میں جمع کیا گیا، اٹھائے گئے۔ یہ کہا گیا کہ بعض لوگ اس رونگٹے کھڑے کر دینے والی تصویری نمائش کی ضرورت پر اعتراض کرتے ہیں، کہ یہ تماش بینی کے شوق کی تسکین کرتی ہے اور کالوں کی ستم رسیدگی کے مناظر کی ترویج کا باعث بن سکتی ہے۔ یا محض دماغ کو ماؤف کر سکتی ہے۔ اس کے باوجود، یہ دلیل دی گئی، ان تصویروں کو "جانچنا" ہماری ذمے داری ہے — یہاں "دیکھنا" کے لفظ کی جگہ "جانچنا" کا زیادہ غیر جذباتی لفظ استعمال کیا گیا۔ مزید کہا گیا کہ اس ناگوار تجربے سے گزرنا اس لیے کارآمد ہے کہ اس سے ہم میں اس بات کی فہم پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ مظالم "وحشیوں" (barbarians) کے کیے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ عقائد کے ایک نظام، نسل پرستی، کے عکاس ہیں، جو انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے مقابلے میں کم انسانی قرار دے کر ایذارسانی اور قتل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ وحشی ہی رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے بیشتر وحشی ایسے ہی (یعنی باقی تمام انسانوں جیسے ہی) دکھائی دیتے ہوں۔

اس سے قطع نظر، جو شخص کسی کے نزدیک "وحشی" ہے، وہ ممکن ہے کسی اور کے نزدیک "وہی کچھ کر رہا ہو جو باقی سب لوگ کر رہے ہیں"۔ (آپ کتنے لوگوں سے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ باقی سب لوگوں سے بہتر ثابت ہوں گے؟) سوال یہ ہے ہم کس کو مجرم ٹھہرانا چاہتے ہیں؟ یا اس سے زیادہ درست لفظوں میں، ہمارے خیال میں ہم کس کو مجرم ٹھہرانے کا حق رکھتے ہیں؟ ہیروشیما اور ناگاساکی کے رہنے والے بچے کسی بھی طرح ان نوعمر افریقی امریکی مردوں (اور بعض صورتوں میں عورتوں) سے کم معصوم تو نہیں تھے جنھیں امریکہ کے چھوٹے قصبوں میں ذبح کر کے درختوں سے لٹکا دیا گیا تھا۔ ۱۳ فروری ۱۹۴۵ء کو ڈریسڈن پر رائل ایرفورس کی بمباری کے نتیجے میں ایک لاکھ سے زیادہ شہری (جن میں تین چوتھائی عورتیں تھیں) قتل کر دیے گئے، ہیروشیما پر گرائے گئے امریکی بم نے بہتر ہزار شہریوں کو چند سیکنڈ میں جلا کر خاک کر ڈالا۔ یہ فہرست اور زیادہ لمبی بھی ہو سکتی ہے۔ تو پھر، ہم کس کو مجرم ٹھہرانا چاہتے ہیں؟ اس ناقابلِ تلافی ماضی کی کون سی سفاکیاں ایسی ہیں جن پر نظر ڈالنا ہمارے خیال میں ہمارا فرض ہے؟

اگر ہم امریکی ہیں تو غالباً ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم سے جھلسے ہوئے شہریوں یا ویت نام کی امریکی جنگ میں نیپام سے جلے ہوئے انسانی گوشت کو کوشش کر کے دیکھنا مریضانہ عمل ہوگا، لیکن امریکیوں کی حیثیت سے سیاہ فاموں کی لنچنگ پر نظر ڈالنا ہماری ذمے داری ہے — یعنی اگر ہم صحیح الخیال لوگوں کی

جماعت میں شامل ہیں، جو اس مسئلے پر خاصی بڑی تعداد پر مشتمل ہے۔ غلامی کے اس نظام کی بہیمیت کو آگے بڑھ کر تسلیم کرنا، جو امریکہ میں قائم رہا تھا اور جس پر بیشتر امریکیوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، پچھلے کئی عشروں سے ایک ایسا قومی پروجیکٹ بن گیا ہے جس میں شامل ہونا اکثر یورو پی نژاد امریکی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ ہنوز جاری پروجیکٹ ایک بڑی کامیابی ہے، سماجی نیکی کا ایک بڑا سنگ میل ہے۔ جنگوں میں امریکہ کی جانب سے (جنگ کے ایک نہایت اہم، بنیادی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوے) مہلک آتشیں اسلحے کے غیر متناسب استعمال کو تسلیم کرنا کوئی خاص قومی پروجیکٹ نہیں ہے۔ امریکی جنگوں کی تاریخ کا میوزیم قائم کرنے کا تصور — جس میں وہ غضب ناک جنگ بھی شامل ہو جو امریکہ نے ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء تک فلپائن میں گریلا فوج کے خلاف لڑی تھی (جس پر مارک ٹوین نے نہایت ماہرانہ تنقید کی تھی)، اور ۱۹۴۵ء میں جاپانی شہروں پر ایٹم بم کے استعمال کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل، ان بموں کے پیدا کردہ نتائج کی تصویری شہادتوں سمیت، پیش کیے گئے ہوں — آج، پہلے سے کہیں بڑھ کر، ایک انتہائی غیر محبِ وطن پروجیکٹ سمجھا جائے گا۔

۶

آدمی ایسی تصویریں دیکھنے کو جن میں بڑے بڑے مظالم اور جرائم کو ریکارڈ کیا گیا ہو، اپنی ذمے داری سمجھ سکتا ہے۔ آدمی کو اس بارے میں سوچنے کو بھی اپنی ذمے داری تصور کرنا چاہیے کہ ان تصویروں کو دیکھنے کا کیا مطلب ہے، اور اس بارے میں کہ یہ تصویریں جو کچھ دکھاتی ہیں اس کو ذہن میں جذب کرنے کی وہ کس قدر صلاحیت رکھتا ہے۔ ان تصویروں پر ہونے والے تمام ردعمل عقل اور ضمیر کی نگرانی میں واقع نہیں ہوتے۔ اذیت رسیدہ، مسخ شدہ جسموں کے بیشتر مناظر جنسی نوعیت کی دلچسپی ابھارتے ہیں۔ (ایک اہم استثنیٰ *The Disasters of War* ہے: گویا کی بنائی ہوئی تصویریں جنسی سرشاری کے عالم میں نہیں دیکھی جا سکتیں۔ وہ انسانی جسم کے حسن کو نہیں ابھارتیں: ان میں دکھائے گئے جسم بھاری بھرکم اور موٹے کپڑوں سے ڈھکے ہوے ہیں۔) تمام مناظر جو کسی دلکش انسانی جسم پر کیا جانے والا تشدد دکھاتے ہیں، کسی نہ کسی حد تک پورنوگرافک ہوتے ہیں۔ لیکن گھناؤنی چیزوں کی تصویریں بھی کشش انگیز ہو سکتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ٹریفک کے کسی ہولناک حادثے کے بعد اس کے پاس

سے گزرنے والی گاڑیوں کی رفتار سست پڑنے کا سبب محض تجسس نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ کوئی بھیانک منظر دیکھنے کی خواہش کو تسکین دینے کا نادر موقع ہوتا ہے۔ ایسی خواہشوں کو "مریضانہ" کہنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ معمول سے ہٹ کر کبھی کبھار پیش آتی ہیں، لیکن ایسے مناظر کی کشش کبھی کبھار واقع ہونے والی چیز نہیں، اور اندرونی اذیت کا ایک مستقل سبب ہے۔

درحقیقت مثلہ شدہ جسموں کی کشش کے تسلیم کیے جانے کی سب سے پہلی مثال (جہاں تک مجھے معلوم ہے) دماغی کشمکش کے ایک بنیادی بیان میں ملتی ہے۔ یہ "ریپبلک" کتاب چہارم، کا ایک اقتباس ہے جہاں افلاطون کی زبانی سقراط اس بات کا بیان کر رہا ہے کہ نازیبا خواہشیں کس طرح ہماری عقل پر غلبہ پالیتی ہیں، جس کے باعث ہماری ذات اپنی فطرت کے ایک حصے پر غصے میں آجاتی ہے۔ افلاطون ذہنی عمل کا ایک سہ فریقی نظریہ وضع کرتا رہا ہے جس کے تین اجزا عقل، غصہ یا اشتعال، اور اشتہا یا خواہش ہیں — جو فرائیڈ کے سپرایگو، ایگو اور اڈ کے نظریے کا پیش رو ہے (فرق یہ ہے کہ افلاطون عقل کو سب سے اوپر رکھتا ہے اور ضمیر کو، جس کی نمائندگی غصہ یا اشتعال کر رہا ہے، درمیان میں)۔ اس بحث کے دوران، اس بات کی مثال پیش کرنے کے لیے کہ آدمی کس طرح، متذبذب انداز ہی میں سہی، گھناؤنی چیزوں کی کشش کا شکار ہو جاتا ہے، اپنی سنی ہوئی ایک کہانی بیان کرتا ہے جو اگلائیون (Aglaion) کے بیٹے لیونٹیس (Leontius) کے بارے میں ہے۔

> شمالی دیوار کے باہر پیرائیس پر چڑھتے ہوئے اس نے کچھ مجرموں کی لاشیں زمین پر پڑی دیکھیں جن کے پاس جلاد کھڑا ہوا تھا۔ وہ قریب جا کر ان لاشوں کو دیکھنا چاہتا تھا، لیکن کراہت محسوس کرتے ہوئے ان کی طرف سے منھ پھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کشمکش میں مبتلا رہا، لیکن آخرکار اس کی خواہش بہت منھ زور ثابت ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری کھول دیں، دوڑتا ہوا لاشوں کے قریب پہنچا اور چلا کر بولا "یہ لو، منحوس آنکھو! اس حسین منظر کو جی بھر کے دیکھ لو!"

عقل اور خواہش کے درمیان کشمکش کو واضح کرنے کے لیے نامناسب یا خلاف قانون جنسی جذبے کی کسی زیادہ عام مثال کو چننے سے انکار کرتے ہوئے افلاطون بظاہر اس بات کو طے شدہ سمجھتا ہے کہ ہم میں بھی بربادی، اذیت اور مسخ کردہ جسموں کے مناظر دیکھنے کی اشتہا موجود ہے۔

مظالم کی تصویروں کے پیدا کردہ اثرات پر بات کرتے ہوئے یقیناً اس قابل نفرت سمجھے جانے

والے جذبے کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

جدیدیت کے آغاز پر شاید یہ بات تسلیم کرنا آسان رہا ہوگا کہ گھناؤنے پن کے لیے انسان میں ایک قدرتی میلان موجود ہے۔ ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) کا کہنا تھا کہ لوگ اذیت رسیدگی کے مناظر دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ''میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہم دوسروں کو حقیقی مصائب اور اذیت اٹھاتے دیکھ کر ایک سطح کی خوشی، اور تھوڑی بہت نہیں بلکہ خاصی خوشی محسوس کرتے ہیں۔'' اس نے اپنی کتاب *A Philosophical Enquiry into the Origin of Our Ideas of the Sublime and Beautiful* (۱۷۵۷ء) میں لکھا تھا۔ ''کسی غیر معمولی اور دردناک سانحے سے بڑھ کر کوئی منظر نہیں جسے ہم اتنے پرتجسس اشتیاق سے دیکھتے ہوں۔'' ولیم ہیزلٹ نے شیکسپیئر کے کردار ایاگو (Iago) اور اسٹیج پر دکھائی جانے والی خباثت کے بارے میں اپنے مضمون میں سوال کرتا ہے ''ہم اخباروں میں ہولناک آتش زدگی اور رونگٹے کھڑے کردینے والی قتل کی وارداتوں کی خبریں اتنے شوق سے کیوں پڑھتے ہیں؟'' پھر وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے کہتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ''بدی سے رغبت''، ''ظلم کی کشش'' انسانوں میں اسی قدر فطری ہے جتنا ہمدردی کا جذبہ۔

جنسیات کے ایک عظیم ترین نظریہ ساز جورج باتائے (Georges Bataille) نے چین میں ۱۹۱۰ء میں کھینچی ہوئی ایک تصویر، جس میں ایک قیدی کو ''سو زخموں کی موت'' سے گزرتے ہوئے دکھایا گیا تھا، اپنی میز پر سجا رکھی تھی تاکہ اسے ہر روز دیکھ سکے۔ (یہ تصویر، جو اس کے بعد ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کرچکی ہے، ۱۹۶۱ء میں باتائے کی زندگی میں شائع ہونے والی اس کی آخری کتاب *The Tears of Eros* میں شامل کی گئی تھی۔) ''اس تصویر نے،'' باتائے لکھتا ہے، ''میری زندگی میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ میں اپنے ذہن پر مسلط ہوجانے والے اذیت کے اس منظر سے، جو بیک وقت نہایت سرشار کن اور ناقابلِ برداشت ہے، کبھی رہائی نہ پاسکا۔'' اس تصویر کو بغور دیکھنے کا مطلب، باتائے کے مطابق، احساس کو سخت اذیت میں ڈالنا بھی ہے اور ایک ممنوع جنسی علم کو رہا کرنا بھی — یہ ایک پیچیدہ ردِعمل ہے جس کا اعتراف کرنا بہت سے لوگوں کے لیے بہت دشوار ہوگا۔ بیشتر لوگوں کے لیے یہ منظر قطعی ناقابلِ برداشت ہوگا: کٹے ہوئے بازوؤں والا قیدی کئی مصروف چاقوؤں سے زخم کھا کھا کر جانکنی کے عالم میں ہے — اور یہ فوٹوگراف ہے، کوئی پینٹنگ نہیں؛ ایک حقیقی مارسیاس، نہ کہ

Scanned with CamScanner

اسطوری۔۔۔ اور اب تک زندہ ہے، اور اس کے اوپر کے رخ مڑے ہوئے چہرے پر سرشاری کا ویسا ہی تاثر ہے جیسا نشاۃ ثانیہ کے دور کی کسی اطالوی پینٹنگ میں سینٹ سباستیان کے چہرے پر۔ غور سے دیکھی جانے والی شے کے طور پر سفاکی کے مناظر کئی قسم کی ضرورتوں کی تسکین کر سکتے ہیں۔ کمزوری پر قابو پا کر اپنے اندر فولادی مضبوطی پیدا کرنا۔ اپنے اعصاب کو زیادہ ماؤف کرنا۔ ناقابل اصلاح شر کے وجود کو تسلیم کرنا۔

باتائے یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ وہ اس ہولناک سفاکی کے منظر سے لذت حاصل کرتا ہے۔ لیکن وہ یہ کہہ رہا ہے کہ وہ تصور کر سکتا ہے کہ انتہائی درجے کی اذیت، محض اذیت سے زیادہ کوئی شے ہو سکتی ہے، ایک قسم کی تبدیلی ہیئت۔ دوسروں کے مصائب اور اذیت کے نظارے کا یہ وہ تصور ہے جس کی جڑیں مذہبی طرز فکر میں ہیں، جس کی رو سے اذیت رسیدگی کو قربانی، اور قربانی کو حصول رفعت سے منسلک کیا جاتا ہے۔۔۔ ایک ایسا طرز فکر جو جدید طرز احساس کے لیے انتہائی اجنبی ہے جس میں اذیت کو غلطی یا حادثہ یا پھر جرم سمجھا جاتا ہے۔ ایسی شے جس کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ جس کو مسترد کرنا لازمی ہے۔ ایسی شے جس سے انسان کو بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔

❊

دور افتادہ مقامات پر پیش آنے والے مصائب کا جو علم تصویروں کے ذریعے سے ہم تک پہنچتا ہے، اس کا کیا کیا جائے؟ لوگ عموماً اپنے قریب کے لوگوں کی تکلیف میں دیکھنا برداشت نہیں کر پاتے۔ (اس خیال پر مبنی ایک پُر قوت دستاویزی فریڈرک وائزمین کی فلم *Hospital* ہے۔) تماش بینی کی کشش کے باعث۔۔۔ اور ممکنہ طور پر یہ جاننے پر اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ نہیں ہو رہا، مرنے والا شخص میں نہیں ہوں، جنگ کی ابتلا مجھ پر نہیں پڑی ہے لوگوں کے لیے دوسروں کی اذیت کے بارے میں، خواہ یہ دوسرے ایسے لوگ ہوں جن کے ساتھ خود کو آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہو، سوچنے کے عمل کو ٹالنا ایک نارمل بات ہے۔

سرائیوو شہر کی رہنے والی ایک عورت نے، جس کی یوگوسلاو آدرش سے وابستگی کسی شک و شبہے سے بالاتر تھی، اور جس سے میری ملاقات اپریل ۱۹۹۳ء میں میرے وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد ہوئی، مجھے بتایا: ''اکتوبر ۱۹۹۱ء میں یہیں، پُرامن سرائیوو شہر میں اپنے عمدہ اپارٹمنٹ میں تھی جب سربوں نے

Scanned with CamScanner

کروشیا پر حملہ کیا، اور مجھے یاد ہے کہ جب شام کی خبروں میں، یہاں سے چند سو میل دور، ووکوور (Vukovar) شہر کی تباہی کے مناظر دکھائے گئے، تو میں نے سوچا تھا 'اف، کس قدر ہولناک ہے!' اور ٹی وی کا چینل بدل دیا تھا۔ تو پھر اگر فرانس یا اٹلی یا جرمنی میں کوئی شخص یہاں ہر روز ہونے والی ہلاکتوں کو شام کی خبروں میں دیکھ کر کہے، 'اف! کس قدر ہولناک ہے!' اور پھر چینل بدل کر کوئی اور پروگرام دیکھنے لگے تو میں اس پر کیسے برہم ہو سکتی ہوں۔ یہ نارمل بات ہے۔ انسانی طریقہ ہے۔'' جہاں کہیں لوگ خود کو محفوظ محسوس کرتے ہیں — اس عورت کی بات کا تلخ، خود کو ملامت کرنے والا مفہوم یہ تھا — وہاں وہ بے حس رہیں گے۔ لیکن کسی اور ملک کے باشندے کے سرائیوو پر آنے والی ابتلا سے آنکھیں پھیر لینے کی بہ نسبت سرائیوو کے رہنے والے کسی شخص کے، ایک ایسے مقام پر جو اس وقت تک اسی کے ملک کا حصہ تھا، ہونے والے ہولناک واقعات کے مناظر سے آنکھیں چرانے کا یقیناً کوئی اور بھی محرک ہو سکتا ہے۔ غیر ملکیوں کی غفلت شعاری، جس کے بارے میں وہ عورت اتنا ہمدردانہ رویہ رکھتی تھی، اس احساس کا بھی نتیجہ تھا کہ اس سلسلے میں کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ لیکن خود اس عورت کا اپنے اتنے قریب برپا ہونے والی جنگ سے آنکھیں چار نہ کر پانا بے بسی اور خوف کا بھی اظہار تھا۔

لوگ محض اس وجہ سے نظریں نہیں پھیر لیتے کہ تشدد کے مناظر کی روزانہ خوراک نے ان کو بے حس بنا دیا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ خوف زدہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہر شخص کا مشاہدہ ہے، ماس کلچر — فلم، ٹیلی وژن، کامکس، وڈیو گیمز — میں تشدد اور سادیت (sadism) کی قابلِ قبول سطح مسلسل اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی منظر کشی جو چالیس برس پہلے لوگوں کو کراہت سے پہلو بدلنے اور فرش پر لوٹنے پر مجبور کر دیتی، آج ٹین ایجر کسی بھی ملٹی پلیکس سنیما میں آنکھ جھپکائے بغیر دیکھ لیتے ہیں۔ بیشتر جدید کلچروں میں قتل و غارت لوگوں کے لیے صدمے کی نہیں بلکہ تفریح کی شے ہے۔ لیکن ہر تشدد کو ایک سی اجنبیت اور علیحدگی کے ساتھ نہیں دیکھا جاتا۔ بعض آفات دوسری آفات کے مقابلے میں ستم ظریفی کا موضوع بننے کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔*

* موت کے موضوع کی اس قدر گہری پکڑ رکھنے والا اور بے حسی کی مسرتوں کا اتنا بڑا مبلغ اینڈی وارہول (Andy Warhol) نہایت معنی خیز طور پر، مختلف قسم کی پرتشدد اموات (کار اور ہوائی جہاز کے حادثوں، خودکشیوں، سزائے موت) کی نیوز رپورٹوں کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔ لیکن اس کی پردۂ ریشمیں پر پیش کی ہوئی موت کی نقلوں میں جنگ میں

دوسرے ملکوں میں رہنے والوں نے ان ہولناک مناظر کو دیکھنا شاید اس لیے بند کر دیا ہو کہ، مثلاً، بوسنیا کی جنگ بند نہیں ہوئی، کیونکہ سیاست کاروں نے دعویٰ کیا کہ یہ ایسی صورت حال ہے جس کے اسباب تک پہنچنا ممکن نہیں۔ سفاکیوں پر لوگوں کا ردعمل اس لیے کند ہو جاتا ہے کہ کوئی جنگ، ہر جنگ، ایسی معلوم ہوتی ہے کہ اسے روکا جانا ممکن نہیں۔ ہمدردی ایک غیر مستقل جذبہ ہے۔ اسے عمل میں منقلب کرنا پڑتا ہے، ورنہ وہ کمھلا جاتا ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ ان جذبات کا جنھیں برانگیختہ کیا گیا ہے، اور اس علم کا جو ہم تک پہنچایا گیا ہے، کیا کیا جائے۔ اگر آدمی یہ سمجھتا ہو کہ ''ہم'' کچھ نہیں کر سکتے — لیکن یہ ''ہم'' ہے کون؟ — اور نہ ''وہ'' کچھ کر سکتے ہیں — ''وہ'' کون ہیں؟ — تب اسے اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے، وہ کلبی اور بے حس ہوتا جاتا ہے۔

اور جذبے کے اثر میں آنا بھی لازمی طور پر اس سے بہتر نہیں ہوتا۔ جذباتیت اس باعث بدنام ہے کہ وہ بہیمیت اور اس سے بدتر چیزوں کے ذوق سے متوفق (compatible) ہے۔ (آؤشوتز کے ہلاکت کیمپ کے کمانڈنٹ کی اس معروف مثال کو یاد کیجیے جو شام کو گھر جا کر اپنے بیوی بچوں کو گلے لگاتا ہے اور رات کے کھانے سے پہلے پیانو پر شوبرٹ کا نغمہ بجاتا ہے۔) جو کچھ لوگوں کو دکھایا جائے — اگر یہ اس عمل کا درست بیان ہو تو — اس سے لوگ ان مناظر کی بھاری تعداد کے باعث بے حس نہیں ہوتے جو ان پر ٹھونسے گئے ہیں۔ احساس کے کند ہونے کا سبب بے عملی ہوتی ہے۔ جن انسانی کیفیات کو بے حسی، اخلاقی یا جذباتی بے ہوشی کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، وہ دراصل احساسات سے بھرپور ہوتی ہیں: یہ احساسات غصے اور نامرادی کے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ سوچیں کہ کون سے جذبے پیدا ہونے چاہییں، تو ہمدردی کا انتخاب نہایت سادہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسروں کو ہونے والی اذیت سے تصویروں کے ذریعے حاصل ہونے والی قربت سے، دور دراز کسی مقام پر اذیت اٹھانے والے جسے اسکرین پر

ہونے والی اموات شامل نہیں ہوتی تھیں۔ الیکٹرک چیئر کی خبری تصویر، اور کسی شام کے اخبار کی دہاڑتی ہوئی سرخی ''جیٹ حادثے میں ۱۲۹ ہلاک'' یقیناً۔ لیکن ''ہنوئی پر بمباری'' قطعی نہیں۔ موت کے تشدد کا حوالہ دینے والی واحد تصویر جسے وارہول نے ریشمی پردے پر پیش کیا، وہ تھی جو ستم ظریفی کا مظہر، یعنی کلیشے بن چکی تھی: ایٹم بم سے اٹھنے والا کھمبی کی شکل کا بادل، جسے ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح پورے صفحے پر دہرایا گیا تھا (میریلین، جیکی اور ماؤ کی تصویر کی طرح) اور یوں اس کے دھندلے پن، اس کی دلکشی، اس کی پیش پا افتادگی کو ابھارا گیا تھا۔

کلوزاپ میں دکھایا جا رہا ہے — اور اس منظر کو دیکھنے والے مراعات یافتہ شخص کے درمیان ایک تعلق کے وجود کا اشارہ ملتا ہے، جو بالکل غیر حقیقی ہے، جو ہمارے اور طاقت کے درمیان رشتے کا ایک اور پراسرار پردہ ہے۔ جب تک ہم ہمدردی محسوس کرتے رہیں، ہمیں یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ ہم اس عمل میں شریک نہیں جس سے یہ اذیت پیدا ہوئی ہے۔ ہماری ہمدردی ہماری معصومیت اور بے بسی، دونوں کا اعلان کرتی ہے۔ اس حد تک (ہماری تمام تر نیک نیتی کے باوجود) یہ ردعمل نامناسب نہ بھی ہو تو غیر متعلق ضرور ہوتا ہے۔ جنگ اور ہلاکت خیز سیاست کا شکار ہونے والوں کے ساتھ ہم جو ہمدردی محسوس کرتے ہیں، اس سے پیچھا چھڑا کر اس بات پر غور کرنا کہ ہماری مراعات اسی نقشے پر واقع ہیں جس پر ان کے مصائب، اور ان دونوں کو آپس میں مربوط کر کے دیکھا جا سکتا ہے — ایسے انداز میں جسے ہم تصور میں نہ لانے کو ترجیح دیتے ہیں — بالکل اسی طرح جیسے کچھ لوگوں کی امارت کو دوسرے لوگوں کے افلاس سے مربوط کر کے دیکھنا ممکن ہے، یہ ایک ایسا کام ہے جس کے لیے یہ دردناک، ہلا دینے والے مناظر محض پہلی چنگاری مہیا کرتے ہیں۔

۷

فوٹوگرافی کے اثرات کے بارے میں دو وسیع طور پر مروج تصورات پر غور کیجیے، جو بہت تیزی سے پیش پا افتادہ اقوال کا درجہ حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ چونکہ مجھے فوٹوگرافی کے موضوع پر خود اپنے لکھے ہوئے مضامین میں — جن میں سے پہلا تیس برس پیشتر لکھا گیا تھا — ان تصورات کی صورت گری دکھائی دیتی ہے، اس لیے مجھے ان سے الجھنے کی ناقابلِ مزاحمت ترغیب محسوس ہو رہی ہے۔

پہلا تصور یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کی توجہ سے — جس کا مطلب انتہائی فیصلہ کن طور پر مناظر کی نمائش ہے — عوامی توجہ کا رخ متعین ہوتا ہے۔ جب تصویریں موجود ہوں تو جنگ ''حقیقی'' بن جاتی ہے۔ چنانچہ ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کو مناظر کے ذریعے ابھارا گیا تھا۔ یہ احساس کہ بوسنیا کی جنگ کے سلسلے میں کچھ کیا جانا ضروری ہے، صحافیوں کی توجہ سے — جسے بعض اوقات ''سی این این افیکٹ'' بھی کہا جاتا ہے — پیدا ہوا جو محصور شہر سرائیوو کے مناظر کو تین سال سے زیادہ عرصے تک، ہر رات، کروڑوں گھروں میں پہنچاتے رہے۔ یہ مثالیں تصویروں کے اس فیصلہ کن اثر کو واضح کرتی ہیں

جس سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ ہم کون سے سانحوں اور بحرانوں پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے، کن چیزوں کی پروا کریں گے، اور، انجامِ کار، ان تنازعات سے کون سے حساب کتاب وابستہ ہیں۔

دوسرا تصور۔۔۔ جو ممکن ہے اس تصور کا بالکل متضاد معلوم ہو جو ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے — یہ ہے کہ اس دنیا میں جو مناظر سے لبالب، بلکہ ٹھساٹھس، بھر چکی ہے، جو مناظر واقعی اہم ہیں ان کا اثر گھٹتا جا رہا ہے: ہم بے حس ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر کار، یہ مناظر ہماری محسوس کرنے، اپنے ضمیر کو بیدار کرنے کی صلاحیت کو کم سے کم کرتے جا رہے ہیں۔

اپنی کتاب On Photography (۱۹۷۷ء) میں شامل چھ مضامین میں سے پہلے مضمون میں میں نے یہ بحث کی تھی کہ اگرچہ کسی وقوعے کا علم تصویروں سے ذریعے ہونے پر وہ وقوعہ، تصویروں کے غیر موجود ہونے کے مقابلے میں، زیادہ حقیقی ہو جاتا ہے، لیکن بار بار اس کی تصویریں دیکھتے رہنے سے وہ کم حقیقی معلوم ہونے لگتا ہے۔ تصویریں اگر ایک طرف ہمدردی کو ابھارتی ہیں تو دوسری طرف اسے سکیڑ بھی دیتی ہیں۔ کیا یہ بات سچ ہے؟ جب میں نے اسے لکھا تھا تو اسے سچ ہی سمجھتی تھی۔ اب میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ اس بات کی کیا شہادت ہے کہ تصویریں رفتہ رفتہ اپنا اثر گنوا بیٹھتی ہیں، کہ ہمارا تماش بینی کا کلچر مظالم کی تصویروں کی اخلاقی قوت کو ختم کر دیتا ہے؟

یہ سوال خبروں کے بنیادی ذریعے، ٹیلی وژن، کی بابت ایک نقطۂ نظر سے تعلق رکھتا ہے۔ کوئی منظر اپنے استعمال کیے جانے کے طریقے کے باعث اپنے اثر سے محروم ہوتا ہے، اور اس بنا پر کہ اسے کہاں اور کتنی کثرت سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹیلی وژن پر دکھائے جانے والے مناظر، اپنی تعریف کی رو سے، ایسے مناظر ہوتے ہیں جن سے آدمی، جلد یا بدیر، اکتا جاتا ہے۔ جو شے بے حسی سے مشابہ دکھائی دیتی ہے اس اشتہا کے ناقابلِ تسکین ہونے میں پنہاں ہے جسے ٹیلی وژن اکساتے اور اپنے بے تحاشا مناظر سے بجھاتے رہنے کی کوشش میں منظم طور سے جتا رہتا ہے۔ بسیار منظری (image-glut) دیکھنے والے کی توجہ کو سبک، متحرک اور مواد سے قدرے بے پروا رکھتی ہے۔ مناظر کا متواتر بہاؤ کسی ایک منظر کے دوسرے منظر پر فوقیت پانے کی راہ مسدود کر دیتا ہے۔ ٹیلی وژن کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ آدمی چینل بدل سکتا ہے؛ چینل بدلنا، بے چین ہونا، اکتاہٹ محسوس کرنا نارمل سرگرمی ہے۔ ناظرین نڈھال ہو جاتے ہیں۔ انھیں بار بار جوش دلانے، جھٹکا دے کر بیدار کرنے کی ضرورت

Scanned with CamScanner

ہوتی ہے۔ مواد اب ان جوش دلانے والے طریقوں میں شامل نہیں رہا۔ مواد سے غور و فکر پر مبنی کوئی تعلق پیدا کرنے کے لیے آگہی کی ایک مخصوص شدت درکار ہوتی ہے — اور ٹھیک یہی وہ چیز ہے جسے ذرائع ابلاغ کے پیش کیے ہوئے مناظر سے پیدا ہونے والی توقعات کمزور کر دیتی ہیں، جن میں سے مواد کا نچڑ کر بہہ جانا ہی احساس کے مردہ ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

❋

یہ دلیل کہ جدید زندگی ہولناکیوں کی روزمرہ خوراک پر مشتمل ہے جو ہم میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے اور جس کے ہم رفتہ رفتہ عادی ہو جاتے ہیں، جدیدیت پر تنقید کے بنیادی خیال کی حیثیت رکھتی ہے — اور یہ تنقید کم و بیش اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود جدیدیت۔ ۱۸۰۰ء میں ورڈز ورتھ (Wordworth) نے Lyrical Ballads کے پیش لفظ میں طرزِ احساس کے اس بگاڑ کی مذمت کی تھی جو "جو روزانہ پیش آنے والے عظیم قومی واقعات، اور آبادی کے شہروں میں ارتکاز" سے پیدا ہوتا ہے" جہاں ان کے پیشوں کی یکسانی کسی غیر معمولی وقوعے کی طلب بیدار کر دیتی ہے، اور یہ طلب اطلاعات کی تیز رفتار ترسیل کے ذریعے گھنٹے گھنٹے بھر کے وقفے سے تسکین پاتی رہتی ہے۔ "ضرورت سے زیادہ برانگیختگی کا یہ عمل "ذہن کی ایک شے کو دوسری شے سے ممیز کرنے کی صلاحیت کو کند کر دیتا ہے" اور "اسے ایک کم و بیش وحشیانہ بے حسی کی کیفیت میں جتلا کر دیتا ہے"۔

ذرا دیکھیے کہ انگریز شاعر "روزمرہ" واقعات اور "غیر معمولی وقوعوں" کی "گھنٹے گھنٹے بھر کے وقفے سے" آنے والی خبروں سے پیدا ہونے والی بے حسی کی بات کر رہا تھا۔ (سنہ ۱۸۰۰ء میں!) یہ واقعات اور وقوعے کس نوعیت کے تھے، یہ رازدارانہ انداز میں پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے کوئی ساٹھ برس بعد ایک اور عظیم شاعر اور سماجی تشخیص کار نے — جو فرانسیسی ہونے کے سبب مبالغہ آرائی پر اتنا ہی تصرف رکھتا تھا جتنا انگریز کم بیانی سے سروکار رکھتے ہیں — اسی الزام کو زیادہ آتشیں روپ میں پیش کیا۔ یہ بودلیر (Baudelaire) ہے، جو ۱۸۶۰ء کے عشرے میں اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے:

> کوئی دن، کوئی مہینہ یا کوئی سال ہو، یہ ناممکن ہے کہ آدمی کسی بھی اخبار پر نظر ڈالے اور اس کی ہر سطر سے انسانی کج روی کی انتہائی خوفناک جھلک دکھائی نہ دے... ہر اخبار، پہلی سطر سے آخری

سطر تک، محض ہولناکیوں کی بُنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جنگیں، جرائم، چوریاں، بدکاریاں، اذیت رسانیاں، شاہزادوں، قوموں، عام افراد کے گھناؤنے کرتوت، عالمی ظلم و تعدی کا ایک طوفانِ بدتمیزی۔ اور یہ وہ مکروہ اشتہا انگیز شے ہے جسے مہذب انسان ہر صبح ناشتے کے ساتھ اپنے حلق سے اتارتا ہے۔

جب بودلیر یہ الفاظ لکھ رہا تھا تب تک اخباروں نے تصویریں چھاپنا شروع نہیں کیا تھا لیکن اس بنا پر صبح کے اخبار میں چھپی دنیا کی ہولناکیوں کو ناشتے کے ساتھ ہضم کرنے والے بورژوا آدمی کی بابت بودلیر کا الزامی بیان، اس معاصر تنقید سے کسی طرح مختلف نہیں ٹھہرتا کہ ہم ہر روز صبح کے اخبار اور ٹیلی وژن کے ذریعے احساس کو کند کر دینے والی کتنی ہولناکیاں اپنے اندر انڈیلتے رہتے ہیں۔ تازہ ترٹیکنالوجی کبھی نہ تھمنے والی خوراک مہیا کرتی ہے ہمیں دیکھنے کے لیے جس قدر وقت میسر ہو اسے سانحوں اور سفاکیوں کے مناظر سے بھرتی ہوئی۔

On Photography کی اشاعت کے بعد سے، بہت سے ناقدوں نے نشان دہی کی ہے کہ جنگ کے آزار — ٹیلی وژن کی بدولت — ہر رات کی پیش پا افتادہ تکرار بن کر رہ گئے ہیں۔ جو مناظر کبھی صدمہ پہنچاتے اور اشتعال دلاتے تھے، ان کے سیلاب میں ہم ردِعمل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمدردی کا احساس، اپنی حدوں تک پہنچ کر، ماؤف ہو گیا ہے۔ یہ وہ تشخیص ہے جو عموماً پیش کی جاتی ہے۔ لیکن یہاں کیا مطالبہ کیا جا رہا ہے؟ یہ کہ قتل و غارت کے منظر، مثلاً، ہفتے میں صرف ایک بار دکھائے جایا کریں؟ یا زیادہ عمومی طور پر یہ، جیسا کہ میں نے On Photography میں تجویز کیا تھا، کہ "مناظر کی قدرتی ماحولیات (ecology)" کو برقرار رکھنے کے لیے کام کیا جائے؟ لیکن ایسی کوئی چیز واقع ہونے والی نہیں ہے۔ نگرانوں کی کوئی کمیٹی ایسی نہیں جو ہولناکی کا راشن مقرر کرے، تاکہ مناظر کی صدمہ انگیزی کی صلاحیت تازہ رہ سکے۔ اور یہ ہولناکیاں بھی تھمنے والی نہیں ہیں۔

*

جو نقطۂ نظر On Photography میں تجویز کیا گیا تھا — یعنی یہ کہ ہماری یہ صلاحیت کہ اپنے تجربات پر جذباتی تازگی اور اخلاقی موزونیت کے ساتھ ردِعمل کر سکیں، فحش اور گھناؤنے مناظر کے نہ ختم ہونے والے پھیلاؤ کے باعث نیم جان ہوتی جا رہی ہے — اسے ان مناظر کی بے محابا ترسیل کی

Scanned with CamScanner

قدامت پسندانہ تنقید کہا جاسکتا ہے۔

میں اس نقطۂ نظر کو قدامت پسند اس لیے کہتی ہوں کہ جس شے کو حقیقت کا ''احساس'' کہا جاتا ہے وہ ماند پڑتی جارہی ہے۔ لیکن حقیقت، اس کی حاکمیت کو کمزور کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود، اب تک موجود ہے۔ یہ نقطۂ نظر دراصل حقیقت کی مدافعت کرتا ہے، اور اس پر بھرپور انداز میں ردعمل کرنے کے معیارات کو لاحق خطروں سے سروکار رکھتا ہے۔

اس تنقید کا ایک زیادہ انتہا پسندانہ — اور کلبی — روپ یہ ہے کہ مدافعت کرنے کے لیے کوئی شے باقی نہیں رہی۔ جدیدیت کے بہت بڑے جبڑوں نے حقیقت کو چبا کر اس مواد کو تصویروں کی شکل میں باہر اُگل ڈالا ہے۔ ایک نہایت موثر تجزیے کی رو سے ہم ''دیدہ زیب مناظر کے معاشرے'' کے باشندے ہیں۔ ہر صورت حال کو ہمارے لیے حقیقی — گویا دلچسپ — روپ دینے کے لیے کسی قابل دید منظر میں تبدیل کرنا ضروری ہے۔ لوگ خود مناظر میں تبدیل ہو جانے — یعنی مشہور شخصیت (celebrity) بن جانے — کی آرزو رکھتے ہیں۔ حقیقت نے اپنا مقام تیاگ دیا ہے۔ اب صرف اس کی شبیہیں، ذرائع ابلاغ کی صورت میں، باقی رہ گئی ہیں۔

خاصی پُرتخیل خطابت ہے یہ۔ اور بہت سے لوگوں کو قائل کر لینے والی بھی، کیونکہ جدیدیت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ لوگ یہ محسوس کرنا پسند کرتے ہیں کہ ان کے لیے اپنے تجربات کی پیش بینی کرنا ممکن ہے۔ (یہ نقطۂ نظر خاص طور پر مرحوم گائے دیبور (Guy Debord) اور ژاں بودریلار (Jean Baudrillard) کی تحریروں سے وابستہ ہے، جن میں سے اول الذکر کا خیال تھا کہ وہ ایک التباس، ایک بناوٹی شے کو بیان کر رہا ہے، اور آخرالذکر یہ اعتقاد رکھنے کا دعویدار ہے کہ اب صرف مناظر، مصنوعی طور پر ابھاری گئی حقیقتیں، وجود رکھتی ہیں، معلوم ہوتا ہے فرانسیسی اس قسم کی چیزوں میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔) یہ بات اب عام طور پر کہی جاتی ہے کہ حقیقی دکھائی دینے والی ہر چیز کی طرح جنگ بھی دراصل mediatique ہے۔ یہ تشخیص کئی ممتاز فرانسیسیوں، بشمول آندرے گلکسمان (Andre Glucksmann) کی تھی جو دن بھر کا چکر لگانے کے لیے محاصرے کے دنوں کے سرائیوو میں آتے تھے: کہ جنگ میں شکست و فتح کا فیصلہ سرائیوو، یا پورے بوسنیا، میں وقوع پذیر ہونے والی کسی شے کی بنیاد پر نہیں ہوگا، بلکہ اس بنا پر ہوگا کہ ذرائع ابلاغ میں کیا پیش آتا ہے۔ اس بات پر اکثر زور دیا

Scanned with CamScanner

جاتا ہے کہ ''مغرب'' بجائے خود جنگ ہی کو ایک دیدہ زیب منظر کے طور پر دیکھنے لگا ہے۔ بہت سے لوگ، جو اس شے کو سمجھنے کی کوشش میں ہیں جو معاصر سیاست اور کلچر میں غدد، یا خالی، یا احمقانہ طور پر فتح مند محسوس ہوتی ہے، حقیقت کی موت کے اطلاع ناموں کو — عقلیت پسندی کی موت، دانشور کی موت، سنجیدہ ادب کی موت جیسے اطلاع ناموں کی طرح — معلوم ہوتا ہے کسی غور و فکر کے بغیر قبول کر لیتے ہیں۔

حقیقت کے ایک دیدہ زیب منظر میں تبدیل ہو جانے کی بات کرنا ایک حیرت انگیز مقامی پن (provincialism) ہے۔ یہ دنیا کے دولت مند حصے میں، جہاں خبروں کو تفریح میں بدل دیا گیا ہے، رہنے والی قلیل، تعلیم یافتہ آبادی کی ٹی وی دیکھنے کی عادات کو — یعنی اس پختہ کار اندازِ نظر کو جو ''جدیدیت'' کا طرۂ امتیاز ہے، اور پارٹی بندی کی اس روایتی ہیئت کو مسمار کرنے کی اولین شرط جو اختلافِ رائے اور بحث مباحثے کو راہ دیتی ہے — پوری دنیا پر منطبق کر دیتا ہے۔ یہ ایک کج رو، غیر سنجیدہ انداز میں تجویز کرتا ہے کہ دنیا میں حقیقی ستم رسیدگی وجود نہیں رکھتی۔ لیکن دنیا کو خوشحال ملکوں کے ان علاقوں کا مترادف قرار دینا جہاں کے باشندوں کو دوسروں کی اذیت کا تماش بین ہونے، یا تماش بین ہونے سے انکار کرنے، کی مشتبہ رعایت حاصل ہے، ایک مہمل بات ہے۔ بالکل اسی طرح مہمل جیسے یہ کہ دوسروں پر آنے والی ابتلا پر ردِعمل کرنے کی انسانی صلاحیت کو محض ان لوگوں کی ذہنیت تک محدود کر کے دیکھا جائے جو جنگ اور ہمہ گیر ناانصافی و دہشت کے بارے میں براہِ راست تجربے کی بنیاد پر کچھ نہیں جانتے۔ ٹیلی وژن دیکھنے والے کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو اسکرین پر دیکھے جانے والے مناظر کے بارے میں بے حس نہیں ہیں۔ وہ حقیقت کی جانب سرپرستانہ انداز اختیار کرنے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

مظالم کے مناظر کی کاسموپولیٹن بحث میں یہ مفروضہ اختیار کرنا ایک کلیشے کا درجہ حاصل کر گیا ہے کہ ان مناظر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا، اور ان کے نشر کیے جانے میں کوئی خلقی کلبیت (something innately cynical) پنہاں ہے۔ آجکل لوگ جنگ کی تصویروں کو کتنا بھی اہم سمجھتے ہوں، اس سے اس شک کا ازالہ نہیں ہوتا جو ان مناظر کی دلچسپی کی بابت، اور انھیں تیار کرنے والوں کی نیت کے بارے میں قائم رہتا ہے۔ ایسا ردِعمل دو انتہائی مخالف سروں پر واقع مقامات سے آتا

Scanned with CamScanner

ہے: ایک جانب ایسے کلبی افراد کی طرف سے جو کبھی کسی جنگ کے نزدیک نہیں گئے، اور دوسری طرف جنگ سے تھکے ہوئے ان لوگوں کی جانب سے جو ان مصائب کو جھیل رہے ہیں جنھیں تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔

جدیدیت کے باشندوں، مناظر کی صورت میں دکھائے گئے تشدد کے صارفوں، اور کوئی خطرہ مول لیے بغیر کسی خطرناک صورت حال کے قریب جانے کے عادی لوگوں کو اخلاص کے امکان کے بارے میں کلبی رویہ اختیار کرنے کی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ کچھ لوگ خود کو جذباتی طور پر متاثر ہونے سے بچانے کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنی آرام کرسی میں دراز، خطروں سے دور رہتے ہوئے، اپنی برتر حیثیت کا دعویٰ کرنا نسبتاً آسان کام ہے۔ درحقیقت جنگ زدہ خطوں میں جا کر شہادت دینے والوں کی کوششوں پر ''جنگی سیاحی'' (war tourism) کی پھبتی کسنا اتنا عام ہو گیا ہے کہ اس نے بطور پیشہ جنگی فوٹوگرافی پر ہونے والی گفتگو میں بھی راہ پالی ہے۔

یہ احساس عام طور پر پایا جاتا ہے کہ ایسے مناظر کی طلب ایک فحش، پست قسم کی اشتہا ہے، کہ یہ تجارتی عفریت پن ہے۔ محاصرے کے برسوں کے دوران سرائیوو شہر میں، بمباری یا بندوق برداروں کی فائرنگ کے عین درمیان میں، سرائیوو کے کسی شہری کو کسی تصویری صحافی سے، جسے اس کے گلے میں جھولتے ہوئے فوٹوگرافی کے آلات سے صاف پہچانا جا سکتا تھا، چیخ کر یہ کہتے سننا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی: ''کیا تم کسی دھماکے کے انتظار میں ہو، تاکہ لاشوں کی تصویریں کھینچ سکو؟''

بعض اوقات یہ بات سچ بھی ہوتی تھی، لیکن جیسا عموماً خیال کیا جاتا ہے اس سے بہت کم صورتوں میں، کیونکہ بمباری یا فائرنگ کی زد میں آئی ہوئی سڑک پر موجود فوٹوگرافر کو بھی ہلاکت کا اتنا ہی خطرہ درپیش ہوتا تھا جتنا ان شہریوں کو جن کی تصویریں لینے کے لیے وہ ان کا تعاقب کر رہا ہوتا (یا کر رہی ہوتی)۔ اس کے علاوہ، محاصرے کی خبرنگاری کرنے والے تصویری صحافیوں کے شوق اور حوصلے کا واحد محرک کوئی اچھی خبری کہانی حاصل کرنے کا لالچ نہیں ہوتا تھا۔ اس تنازعے کے دوران سرائیوو میں رہ کر نامہ نگاری کرنے والے بیشتر تجربہ کار صحافی غیر جانبدار نہیں تھے۔ اور سرائیوو کے شہری یقیناً چاہتے تھے کہ ان کی ابتلا کو تصویروں کی شکل میں محفوظ کیا جائے: ستم رسیدہ لوگ اپنے مصائب کی نقل تیار کیے جانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ان کی ابتلا کو ایک نہایت منفرد امر کے طور پر دیکھا

Scanned with CamScanner

جائے۔۱۹۹۴ء کے شروع میں انگریز تصویری صحافی پال لو (Paul Lowe) نے، جو محصور شہر میں ایک برس سے زیادہ عرصے سے رہ رہا تھا، اپنی وہاں کھینچی ہوئی تصویروں کی، اور چند برس پیشتر سومالیا میں کھینچی ہوئی تصویروں کی مشترکہ نمائش ایک جزوی طور پر تباہ شدہ آرٹ گیلری میں منعقد کی: سرائیوو کے شہری، جو اپنے شہر کی متواتر تباہی کی نئی تصویریں دیکھنے کا اشتیاق رکھتے تھے، سومالیائی تصویروں کی شمولیت پر خفا ہوئے۔ پال لو کی دانست میں یہ معاملہ بہت سادہ تھا۔ وہ ایک پیشہ ور فوٹوگرافر تھا، اور نمائش کے یہ دونوں حصے اس کے کام کے دو ابواب تھے۔ سرائیوو کے شہریوں کے لیے بھی یہ معاملہ بالکل سادہ تھا۔ اپنے مصائب کو کسی دوسرے عوام کے مصائب کے ساتھ ساتھ رکھنے کا مطلب ان دونوں کا موازنہ کرنا تھا (کہ کون سا جہنم بدتر ہے)، یعنی سرائیوو کی شہادت کو محض ایک مثال کے درجے تک گرا دینا تھا۔ سرائیوو میں جو مظالم کیے جا رہے تھے ان کا افریقہ میں ہونے والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں، انھوں نے اعلان کیا۔ ان کے اشتعال میں بلاشبہ نسل پرستی کا عنصر موجود تھا — بوسنیا کے لوگ یوروپی ہیں، سرائیوو کے شہری وہاں آنے والوں کو یہ بات یاد دلاتے کبھی نہ تھکتے تھے — لیکن اگر سومالیا کے بجائے چیچنیا یا کوسووو، یا کسی بھی دوسرے ملک، کے شہریوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کی تصویریں نمائش میں ان کی تصویروں کے ساتھ رکھی جاتیں تب بھی انھیں اعتراض ہوتا۔ اپنی ابتلا کو کسی اور کی ابتلا کے ساتھ جڑا ہوا دیکھنا ناقابلِ برداشت ہے۔

۸

کسی مقام کو جہنم کا نام دینے کا مطلب، بے شک، ہمیں یہ بتانا نہیں کہ لوگوں کو اس جہنم سے کس طرح باہر نکالا جائے، یا اس کے شعلوں کی حدت کو کیونکر کم کیا جائے۔ اس کے باوجود، انسانی خباثت نے اس دنیا میں جتنے مصائب پیدا کیے ہیں ان کی آگہی کو اپنے ذہن میں تسلیم کرنا، اس آگہی کو توسیع دینا، بجائے خود ایک مثبت بات معلوم ہوتی ہے۔ ایسا شخص جو دنیا میں بدمعاشی کے وجود کے انکشاف پر مستقل حیرت زدہ رہتا ہو، جو ان گھناؤنی اور ہر ممکن قسم کی ایذارسانیوں کا سامنا ہونے پر، جو انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ کرنے پر قادر ہے، ہمیشہ مایوسی (بلکہ بے یقینی) میں مبتلا ہو جاتا ہو، یقیناً اخلاقی یا نفسیاتی بلوغت کو نہیں پہنچا۔

ایک خاص عمر کے بعد اس قسم کی معصومیت یا سطحی پن کا، اس سطح کی لاعلمی یا فراموشی کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔

اب مناظر کا ایک نہایت وسیع ذخیرہ موجود ہے جس کے ہوتے ہوئے اس قسم کے اخلاقی بھی پن کو قائم رکھنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ہولناک تصویریں ہمارے ذہنوں پر مسلط ہوتی ہیں تو ہو جائیں۔ اگر وہ محض علامات ہی ہیں اور اپنی دکھائی ہوئی حقیقت کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتیں تب بھی کوئی حرج نہیں: اس کے باوجود وہ ایک اہم کام انجام دیتی ہیں۔ تصویریں کہتی ہیں: یہ ہے وہ کچھ جو انسان — رضاکارانہ طور پر، جوش و خروش سے، خود کو حق بجانب سمجھتے ہوئے — کرنے پر قادر ہیں۔ اسے بھولنا مت۔

یہ کسی شخص سے یہ کہنے کے مترادف نہیں ہے کہ وہ کسی مخصوص، غیر معمولی طور پر عفریتی شر انگیزی کو یاد رکھے۔ ("بھول مت جانا!") شاید یادداشت کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، اور سوچنے کو اتنی نہیں۔ یاد رکھنا یقیناً ایک اخلاقی عمل ہے، اس کی بذاتِ خود ایک اخلاقی قدر ہے۔ یاد، دردانگیز طور پر، واحد رشتہ ہے جو ہم مرے ہوؤں کے ساتھ قائم رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ عقیدہ کہ یاد رکھنا ایک اخلاقی عمل ہے، انسان کے طور پر ہماری فطرت میں بہت گہرا اترا ہوا ہے: انسان، جو جانتے ہیں کہ وہ مر جائیں گے، اور جو خود سے پہلے مر جانے والوں —— دادا دادی، ماں باپ، استادوں اور پرانے دوستوں — کو یاد کرتے ہیں۔ سنگ دلی اور فراموشی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی چیزیں لگتی ہیں۔ لیکن اجتماعی زندگی کے ایک طویل تر دورانیے میں تاریخ یاد رکھنے کے عمل کی قدر کے بارے میں متضاد اشارے دیتی ہے۔ دنیا میں ناانصافی بے پناہ زیادہ ہے۔ اور بہت زیادہ چیزیں یاد رکھنا (مثلاً قدیم رنج — سرب، آرش) بے حد تلخی پیدا کرتا ہے۔ امن قائم کرنے کا مطلب بھلا دینا ہے۔ سمجھوتا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یادداشت ناقص اور محدود ہو۔

اگر مقصد تھوڑی سی گنجائش حاصل کرنا ہے تاکہ انسان اپنی ذاتی زندگی گزار سکے، تب یہ بات زیادہ پسندیدہ معلوم ہوتی ہے کہ مخصوص ناانصافیوں کی روداد اس عمومی فہم میں گھل جائے کہ انسان ہر جگہ ایک دوسرے کے ساتھ سفاکانہ سلوک کیا کرتے ہیں۔

❁

اپنے آپ کو چھوٹی اسکرینوں — ٹیلی وژن، کمپیوٹر، پام ٹاپ — کے سامنے متعین کر کے ہم دنیا بھر میں ہونے والے سانحوں کی تصویریں اور مختصر رپورٹیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کی نسبت اب اس قسم کی خبریں زیادہ تعداد میں آنے لگی ہیں۔ ممکن ہے یہ محض ایک التباس ہو۔ بات صرف یہ ہے کہ خبروں کی رفتار اب "ہر جگہ" ہے۔ اور بعض لوگوں کے مصائب دیکھنے والوں کے لیے (بشرطیکہ ان مصائب کے دیکھنے والوں کا وجود ہو) بعض دوسرے لوگوں کی ابتلا کی نسبت زیادہ داخلی دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں۔ جنگ کی خبریں اب دنیا بھر میں نشر ہو جاتی ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دور دراز مقامات پر مصیبتیں جھیلنے والوں کی ابتلا کے بارے میں سوچنے کی صلاحیت اب زیادہ عام ہو گئی ہے۔ جدید زندگی میں — یعنی اس قسم کی زندگی میں جہاں بے تحاشا بڑی تعداد میں چیزیں ہم سے توجہ کی طالب ہوتی ہیں — یہ بات نارمل معلوم ہوتی ہے کہ آدمی اس شے سے نظریں پھیر لے جسے دیکھ کر اسے برا محسوس ہوتا ہے۔ اگر ذرائع ابلاغ جنگ اور دیگر شرانگیزیوں کے باعث ہونے والے مصائب کی تفصیلات پر زیادہ وقت صرف کرنے لگیں تو چینل بدل دینے والوں کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔ لیکن یہ بات غالباً سچ نہیں ہے کہ لوگ اب پہلے کی نسبت کم ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

یہ بات کہ ہم پوری طرح منقلب نہیں ہوتے، کہ ہم منہ پھیر سکتے ہیں، صفحہ پلٹ سکتے ہیں، چینل بدل سکتے ہیں، مناظر کے ذریعے کیے جانے والے حملے کی اخلاقی قدر کی تکذیب نہیں کرتی۔ یہ کوئی نقص نہیں ہے کہ ہم ان مناظر کو دیکھ کر پوری طرح جھلس نہیں جاتے۔ ہمیں "کافی حد تک" تکلیف نہیں ہوتی۔ اور نہ کسی تصویر سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جس ابتلا کا انتخاب اور نشان دہی کر رہی ہے اس کی تاریخ اور اسباب کے متعلق ہماری لاعلمی کا ازالہ کر سکے گی۔ یہ مناظر صرف ہمیں دعوت دیتے ہیں کہ ہم تسلیم شدہ طاقتوں کے پیدا کردہ عوامی مصائب پر توجہ دیں، ان کے بارے میں سوچیں، جانیں، اور ان کے جو جواز پیش کیے جاتے ہیں ان کو پرکھیں۔ تصویر میں جو کچھ دکھایا گیا ہے اس میں سے کون سی چیز کس سبب سے پیدا ہوئی ہے؟ ذمے دار کون ہے؟ کیا یہ درگزر کے قابل ہے؟ کیا اس کا ہونا ناگزیر تھا؟ کیا بعض ایسے حالات جنھیں ہم اب تک قبول کرتے چلے آ رہے ہیں، چیلنج کیے جانے چاہییں؟ یہ مناظر ہمیں اکساتے ہیں کہ ان تمام سوالات پر غور کریں، اور اس فہم کے ساتھ کہ اخلاقی اشتعال، ہمدردی کے جذبے کی طرح، اپنے طور پر کوئی راہِ عمل نہیں سجھا سکتا۔

Scanned with CamScanner

تصویریں جو کچھ دکھاتی ہیں اس کے سلسلے میں کچھ نہ کر پانے سے پیدا ہونے والی برہمی ان تصویروں کا نظارہ کرنے والوں کو ناشائستگی کا قصوروار ٹھہرانے کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے، اور دوسری طرف جس انداز سے ان تصویروں کو پیش کیا جاتا ہے — یعنی جلد کو نرم بنانے والی کریموں، درد رُبا دواؤں اور SUVs کے اشتہاروں میں گھرے ہوئے — اس کی ناشائستگی کی نشان دہی کی شکل میں بھی۔ اگر ہم تصویروں میں دکھائی گئی زیادتی کے سلسلے میں کچھ کر سکتے تو شاید ان مسئلوں کی اتنی زیادہ پروا نہ کرتے۔

❁

تصویروں کی اس بنا پر مذمت کی جاتی رہی ہے کہ وہ ابتلا کو دور سے دیکھنے کا ایک طریقہ ہیں — جیسے اسے دیکھنے کا کوئی اور طریقہ بھی ممکن ہو۔ لیکن — تصویروں کی وساطت کے بغیر — قریب سے دیکھنا بھی تو محض دیکھنا ہی ہے۔

سفاکیوں کو دکھانے والی تصویروں پر عائد کی جانے والی ملامتوں میں سے بعض کا تعلق ایسی چیزوں سے ہے جو دراصل دیکھنے کے عمل کی خصوصیات ہیں۔ دیکھنا ایک بلاکوشش عمل ہے؛ دیکھنے کے لیے کسی قدر فاصلہ درکار ہوتا ہے؛ دیکھنے کے عمل کو منقطع کیا جا سکتا ہے (آنکھیں بند کرنے کے لیے ہمارے پاس پپوٹے ہیں، جبکہ کانوں کو اس طرح بند نہیں کیا جا سکتا)۔ یہ عین وہی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر یونانی فلسفیوں نے دیکھنے کی حس کو حواسِ خمسہ میں عمدہ ترین اور شریف ترین قرار دیا تھا، اور جو اَب نقائص سمجھی جانے لگی ہیں۔

یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ فوٹوگرافی حقیقت کا جو خلاصہ پیش کرتی ہے اس میں بجائے خود کوئی اخلاقی نقص ہے؛ یعنی یہ کہ آدمی کو کوئی حق نہیں کہ دوسروں کی اذیت کو فاصلے پر رہ کر، یعنی اس کی وحشیانہ طاقت سے محفوظ رہتے ہوئے، محسوس کرے؛ اور یہ کہ دیکھنے کی حس کی جن خصوصیات کی اب تک اس قدر ستائش کی جاتی رہی ہے ان کی ہمیں بہت زیادہ انسانی (یا اخلاقی) قیمت ادا کرنی پڑی ہے — یعنی فوٹوگرافی کے پیش کیے ہوئے خلاصے کا عیب یہ ہے کہ اس کی بدولت ہم دنیا کی جارحیت سے کچھ ہٹ کر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ ہمیں مشاہدے اور اپنی مرضی سے توجہ دینے کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ دراصل فوٹوگرافی کا نہیں بلکہ انسانی ذہن کے عمل کا بیان ہے۔

Scanned with CamScanner

حقیقت سے ذرا پیچھے ہٹ کر سوچنے میں کوئی غلط بات نہیں۔ کئی داناؤں کے اقوال کا خلاصہ ان لفظوں میں پیش کیا جا سکتا ہے: ''کوئی شخص سوچنے اور حملہ کرنے کے کام بیک وقت نہیں کر سکتا۔''

۹

بعض تصویریں — جو ابتلا کی علامت بن جاتی ہیں، مثلاً ۱۹۴۳ء میں پولینڈ کے شہر وارسا کے ایک یہودی محلے (ghetto) میں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے ایک ننھے لڑکے کی تصویر جسے ہلاکت کے کیمپ کی طرف لے جایا جا رہا ہے — عبرت انگیز یاد دہانیوں، غور و فکر کا موضوع بننے والی اشیا کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہیں تا کہ دیکھنے والے کی حقیقت کی آگہی میں مزید گہرائی پیدا ہو؛ آپ چاہیں تو انھیں غیر مذہبی تبرکات (secular icons) بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ مطالبہ بھی پیدا ہوگا کہ انھیں دیکھنے کے لیے ایک متبادل مقدس مقام، یعنی مذہبی مراقبہ گاہ کی مماثل کوئی جگہ، موجود ہو جہاں ان پر غور و فکر کیا جا سکے۔ جدید معاشرے میں، جہاں عوامی استعمال کی مثالی جگہ سپر اسٹور (یا ایرپورٹ یا میوزیم) ہو، ایسی گنجائش تلاش کرنا دشوار ہے جہاں کسی چیز کے بارے میں سنجیدہ ہوا جا سکے۔

دوسرے لوگوں کی اذیت دکھانے والی تصویروں کو کسی آرٹ گیلری میں دیکھنا ان کے استحصال کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسے انتہائی درجے کے مناظر بھی جن کی سنگینی، جن کی جذباتی قوت، لازوال محسوس ہوتی ہے، مثلاً ۱۹۴۵ء میں کھینچی گئی کنسنٹریشن کیمپوں کی تصویریں، کسی فوٹوگرافی کے میوزیم (پیرس کا ہوٹل سلی، نیویارک کا انٹرنیشنل سنٹر فار فوٹوگرافی) میں، کسی میوزیم کے کیٹلاگ میں، ٹیلی وژن پر، ''نیویارک ٹائمز'' کے صفحات پر، ''رولنگ اسٹون'' کے صفحات پر، یا کسی کتاب میں دیکھے جانے پر الگ الگ اہمیت کے حامل لگتے ہیں۔ کسی فوٹو البم میں لگی یا بھدے نیوز پرنٹ پر چھپی ہوئی کوئی تصویر (مثلاً ہسپانوی خانہ جنگی کی تصویریں) جب ایگنس بی بوتیک کی دیوار پر آویزاں کی جاتی ہے تو کوئی اور چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہر تصویر کسی مخصوص سیاق و سباق (setting) میں دیکھی جاتی ہے۔ اور یہ سیاق و سباق اب متعدد قسم کے ہیں۔ غیر رسمی لباس بنانے والی اطالوی کمپنی بینیٹن (Benetton) نے اپنی ایک بدنام اشتہاری مہم میں ایک ہلاک شدہ کروشیئن فوجی کی خون آلود قمیص کی تصویر کو استعمال کیا تھا۔ اشتہاری تصویریں عموماً اتنی ہی بلند طلب (ambitious)، ہنرمندانہ، ہوشیاری سے پیدا کیے

ہوئے غیر رسمی پن کی حامل، ودھل انداز، ستم ظریفانہ اور سنجیدہ ہوتی ہیں جتنی آرٹ فوٹوگرافی کے دائرے میں آنے والی تصویریں۔ جب کاپا کی کھینچی ہوئی گرتے ہوئے سپاہی کی تصویر "لائف" کے صفحے پر وٹالس ہیر کریم کے اشتہار کے مقابل شائع ہوئی، تو ان دو مختلف انواع، "ادارتی" اور اشتہاری" فوٹوگرافی، سے تعلق رکھنے والی تصویروں کے پیش کش کے انداز میں نہایت وسیع، ختم نہ کیا جا سکنے والا فرق موجود تھا۔ اب یہ فرق مٹ چکا ہے۔

بعض باضمیر فوٹوگرافروں کے کام کے بارے میں پائی جانے والی معاصر تشکیک کی حقیقت اس بات پر بہی سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی کہ ان تصویروں کو اتنے مختلف سیاق وسباق میں نشر کیا جاتا ہے، کہ انھیں ایک خاص احترام کے ساتھ دیکھنے اور ان پر بھرپور ردعمل کرنے کی گنجائش لازمی طور پر نہیں نکلتی۔ بلاشبہ آج کی دنیا میں، سوائے اس جگہ کے جہاں لیڈروں کے محب وطن احترام کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، کسی اور متبرک مقام کی ضمانت نہیں دی جا سکتی جہاں کسی بات پر مناسب احترام اور علیحدگی کے ساتھ غور وفکر کیا جا سکے۔

انتہائی سنجیدہ یا دردناک موضوعات کو پیش کرنے والی تصویریں جس حد تک آرٹ ہیں ــــ اور دیوار پر آویزاں ہوتے ہی وہ آرٹ میں بدل جاتی ہیں، خواہ اعلانات کے ذریعے اس کی کتنی ہی تردید کیوں نہ کی جائے ــــ اس حد تک ان کی تقدیر آرٹ کے دیگر نمونوں سے مختلف نہیں ہوتی جنھیں نمائش کے لیے دیوار یا اسٹینڈ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔ یعنی انھیں دیکھنا تفریحی چہل قدمی ــــ عموماً کسی کے ساتھ کی جانے والی چہل قدمی ــــ کے دوران لی جانے والی ایک جھلکی کی حیثیت رکھتا ہے۔ میوزیم یا آرٹ گیلری میں جانا ایک سماجی موقع ہے، جس میں آرٹ کو دیکھنے اور اس پر تبصرہ کرنے کے دوران توجہ کے بھٹکنے کے ہر طرح کے امکانات ہوتے ہیں۔* ایک حد تک ایسی تصویریں کتاب میں شائع ہونے

---

* میوزیم کے ارتقا نے بذات خود توجہ کو بھٹکانے والے اس ماحول کو پھیلانے میں کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادارہ جو پہلے ماضی کے آرٹ کو محفوظ کرنے اور اس کی نمائش کرنے کے مقصد سے قائم کی جانے والی ذخیرہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا، اب بیک وقت ایک درس گاہ اور فن پاروں کی فروخت گاہ بن گیا ہے، جس کا ایک اہم منصب آرٹ کی نمائش ہے۔ لیکن اس کا بنیادی منصب مختلف تناسبوں میں تیار کیا جانے والا تفریح اور تعلیم کا آمیزہ ہے، جس کے تحت تجربات، مذاقوں اور مشابہتوں کی مارکیٹنگ کی جاتی ہے۔ نیویارک کا میٹروپولیٹن میوزیم ان ملبوسات کی نمائش منعقد کرتا ہے جو جیکولین بووییر کینیڈی

Scanned with CamScanner

پر اپنی اہمیت اور متانت قائم رکھتی ہیں، جہاں پڑھنے والا انھیں تنہائی میں دیکھ سکتا ہے اور بولے بغیر ان پر غور کر سکتا ہے۔ تاہم، کسی لمحے کتاب بند ہو جائے گی۔ ان تصویروں سے پیدا ہونے والا طاقتور جذبہ لمحاتی بن جائے گا۔ آخر کار ان تصویروں میں لگایا جانے والا الزام ماند پڑ جائے گا؛ کسی مخصوص تنازعے کی مذمت اور مخصوص جرائم کے قصور واروں کی نشان دہی، انسانی سفاکی اور انسانی بہیمیت کی عمومی مذمت کی شکل اختیار کر لے گی۔ اس وسیع تر عمل کے سلسلے میں فوٹوگرافر کا اپنا منشا غیر متعلق ہے۔

❁

کیا جنگ کی متواتر کشش کا کوئی تریاق موجود ہے؟ اور کیا یہ ایسا سوال ہے جو کسی مرد کی بہ نسبت کسی عورت کی طرف سے پوچھا جانا زیادہ متوقع ہے؟ (غالباً ہاں۔)

کیا کوئی شخص کسی تصویر (یا تصویروں کے ایک مجموعے) کو دیکھ کر جنگ کی مخالفت کے لیے عملی طور پر اس طرح آمادہ ہو سکتا ہے جیسے ڈریزر (Dreiser) کی کتاب *An American Tragedy* یا ترگنیف (Turgenev) کی کہانی *The Execution of Troppmann* کو پڑھ کر سزائے موت کے خلاف متحرک ہو سکتا ہے؟ (موخر الذکر تحریر جلاوطن ادیب کے اس تجربے کی روداد ہے جب اسے پیرس کے قید خانے میں ایک مشہور مجرم کے گلوٹین پر سزائے موت پانے سے پیشتر کے چند گھنٹوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔) بظاہر کسی تحریر کے اثر انگیز ہونے کا امکان نسبتاً زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ جزوی طور پر اس کا تعلق وقت کے اس دورانیے سے ہے جس میں کوئی شخص اسے دیکھنے، محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کوئی تصویر، یا تصویروں کا مجموعہ، جنگ کے موضوع کے انکشاف اور تجربے کے

اوناسس نے اپنے وائٹ ہاؤس کے قیام کے دوران پہنے تھے، اور لندن کے امپیریل وار میوزیم نے، جو اپنے فوجی ساز و سامان اور تصویروں کے ذخیرے کے لیے معروف ہے، اب آنے والوں کے لیے پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے متعلق دو قسم کے ماحول کا بندوبست کر رکھا ہے۔ اول الذکر (۱۹۱۶ء کی Somme کی لڑائی) سے متعلق The Trench Experience کا گوشہ، جس میں دیکھنے والا ایک راہداری سے گزرتا ہے جس میں گولا باری اور زخمیوں کے چلانے کی ٹیپ کی ہوئی آوازیں گونجتی ہیں، لیکن کسی قسم کی بو (لاشوں کی سڑاند اور زہریلی گیس کی بدبو) کے بغیر، اور دوسری جنگ عظیم سے متعلق گوشہ The Blitz Experience جو اعلان کے مطابق لندن میں ۱۹۴۰ء میں ہونے والی جرمن بمباری کے دوران پائے جانے والے حالات کی پیش کش ہے جس میں زیر زمین حفاظتی خندق میں ہونے والا ہوائی حملے کا تجربہ بھی شامل ہے۔

Scanned with CamScanner

معاملے میں یوکرینی ڈائرکٹر لاریزا شیپتکو (Larisa Shepitko) کی فلم The Ascent (۱۹۷۷ء)— میرے علم کی حد تک جنگ کی غمناکی کے موضوع پر موثر ترین فلم— اور جاپان کی ایک حیران کن دستاویزی فلم، کازوؤ ہرا (Kazuo Hara) کی The Emperor's Naked Army Marches On (۱۹۸۷ء) سے بازی نہیں لے جا سکتی۔ موخرالذکر فلم بحرالکاہل کی جنگ کے ''ذہنی طور پر مختل'' سابق سپاہی کا پورٹریٹ ہے جس کا زندگی بھر کا کام ٹرک پر سوار ہو کر لاؤڈ سپیکر پر جاپان کے جنگی جرائم کی مذمت کرتے پھرنا ہے، اور اس سفر میں وہ اپنے سابق اعلیٰ افسروں کا ناخوندہ مہمان بنتا ہے اور ان سے ان جرائم، مثلاً فلپائن میں امریکی قیدیوں کے قتل، کے لیے معافی مانگنے کا مطالبہ کرتا ہے جن کا حکم دینے یا جن میں حصہ لینے کے وہ مرتکب ہوئے تھے۔

جنگ مخالف تہا تصویروں میں جو تصویر مجھے اپنی فکر کی گہرائی اور قوت کے اعتبار سے مثالی معلوم ہوتی ہے وہ جیف وال (Jeff Wall) کی کھینچی ہوئی بہت بڑی تصویر ہے جس کا عنوان Dead Troops Talk ہے اور ذیلی عنوان ہے ''مقور، افغانستان، میں سرخ فوج پر گھات لگا کر کیے گئے ایک حملے کے بعد کا منظر، سرما ۱۹۸۶ء''۔ ساڑھے سات فٹ اونچی اور تیرہ فٹ سے زیادہ چوڑی، ایک لائٹ باکس پر جڑی ہوئی یہ سیبا کروم ٹرانسپیرنسی، جو کسی دستاویز کی عین ضد ہے، اور دھماکے کے بعد کے پہاڑی لینڈسکیپ کے پس منظر میں کچھ انسانی شبیہوں کو دکھاتی ہے، فوٹوگرافر کے اسٹوڈیو میں تیار کی گئی تھی۔ وال، جو کینیڈا کا رہنے والا ہے، کبھی افغانستان نہیں گیا۔ یہ حملہ ایک ایسی جنگ کا مصنوعی طور پر تخلیق کردہ منظر ہے جو خبروں کا متواتر موضوع رہی ہے۔ وال نے جنگ کی ہولناکی کو تصور میں لانے کا کام اپنے ذمے لیا، (وہ خود کو گویا سے متاثر بتاتا ہے)، اس انداز میں جیسے انیسویں صدی کی تاریخی پینٹنگز میں اور اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز کے دنوں میں، یعنی کیمرے کی ایجاد سے ذرا پہلے، تاریخ بطور قابلِ دید منظر کے مختلف اسالیب— تابلو ویواں (tableaux vivants)، موم کے بنے ہوئے نمائشی مناظر، ڈایوراما اور پینوراما— میں پیش کیا جاتا تھا، اس طرح کہ ماضی، خصوصاً ماضی قریب، حیران کن اور مضطرب کن حد تک حقیقی دکھائی دینے لگتا تھا۔

وال کے تخیلاتی فوٹوورک میں دکھائی گئی انسانی شبیہیں ''حقیقت پسندانہ'' ہیں لیکن منظر بجائے خود، ظاہر ہے، ہرگز حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ مرے ہوئے سپاہی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اس فن پارے

میں انھیں باتیں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

دبیز سرمائی یونیفارم اور لمبے بوٹ پہنے تیرہ روسی سپاہی دھماکے کے بعد کی داغ دار، خون آلود پہاڑی ڈھلان پر اِدھر اُدھر بیٹھے اور لیٹے ہوئے دکھائے گئے ہیں، جبکہ ان کے اردگرد اکھڑی ہوئی چٹانیں اور جنگ کا ملبہ بکھرا پڑا ہے: گولوں کے خول، دھات کے مڑے ہوئے ٹکڑے، ایک بوٹ جس میں ایک ٹانگ کا نچلا حصہ پھنسا ہوا ہے... یہ منظر گانس کی فلم *J'accuse* کے آخری سین کا نظرثانی شدہ روپ معلوم ہوتا ہے جس میں پہلی جنگِ عظیم کے ہلاک شدہ سپاہی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، لیکن جبری بھرتی کے تحت فوج میں شامل ہونے والے یہ روسی سپاہی، جو سوویت یونین کی اپنے آخری دنوں میں چھیڑی ہوئی احمقانہ نوآبادیاتی جنگ میں ہلاک ہوئے، کبھی دفن نہیں کیے گئے۔ ان میں چند نے سروں پر اب تک ہیلمٹ پہن رکھے ہیں۔ ایک سپاہی جو گھٹنوں کے بل کھڑا پُرجوش انداز میں بات کر رہا ہے، اس کے منھ سے جھاگ کی صورت میں اس کا سرخ مغز نکل کر بہہ رہا ہے۔ ماحول پُرحرارت، زندہ ولانہ اور دوستانہ معلوم ہوتا ہے۔ کچھ فوجی کہنیوں کے بل کروٹ سے لیٹے اور کچھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں اور ان کی کھلی ہوئی کھوپڑیاں اور چور چور بازو صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک سپاہی دوسرے سپاہی پر، جو پیٹھ پھیرے سو رہا ہے، جھکا ہوا ہے جیسے اسے اٹھ بیٹھنے پر آمادہ کر رہا ہو۔ دو سپاہی گھڑسواری کا کھیل کھیل رہے ہیں، ان میں سے ایک دوسرے کی پیٹھ پر سوار ہے جو چاروں ہاتھ پیروں پر چلتا دکھائی دے رہا ہے۔ ایک تیسرا سپاہی گھوڑا بنے ہوئے سپاہی کے سامنے گوشت کا ایک لوتھڑا ہنستے ہوئے لہرا رہا ہے۔ ایک سپاہی، جس کے سر پر ہیلمٹ ہے اور دونوں ٹانگیں اڑ چکی ہیں، کچھ دور کھڑے اپنے ساتھی کی طرف رخ کیے ہوئے ہے اور اس کے ہونٹوں پر متوجہ مسکراہٹ ہے۔ اس کے نیچے کی طرف دو سپاہی، جو بظاہر اٹھ کر بیٹھنے پر آمادہ نہیں، چت پڑے ہوئے ہیں اور ان کے خون میں لتھڑے ہوئے سر ڈھلان پر نیچے کی سمت جھول رہے ہیں۔

اس منظر کے اثر تلے آ کر، جو اس قدر قصوروار ٹھہرانے والا معلوم ہوتا ہے، دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ یہ سپاہی ابھی مڑ کر اس سے مخاطب ہو جائیں گے۔ لیکن نہیں، ان میں سے کوئی بھی تصویر سے باہر نہیں دیکھ رہا۔ احتجاج کا کہیں کوئی اندیشہ نہیں۔ وہ ہم سے چیخ کر اس بہیمانہ شے کو روکنے کا مطالبہ کرنے والے نہیں جس کو جنگ کہا جاتا ہے۔ وہ مر کر دوبارہ اس لیے نہیں جی اٹھے ہیں کہ لڑکھڑاتے قدموں سے

جاکران جنگ بازوں کی مذمت کریں جنھوں نے انھیں قتل کرنے اور قتل ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ اور
ان کو دوسروں کے لیے دہشت کا باعث بھی نہیں دکھایا گیا ہے، کیونکہ ان کے درمیان ہی (تصویر کے
بائیں کونے میں) کوڑا چننے والا ایک افغان سفید لباس پہنے اکڑوں بیٹھا پوری طرح محو ہو کر کسی کے فوجی
تھیلے کی تلاشی لے رہا ہے۔ سپاہی اس پر قطعی توجہ نہیں دے رہے، اور اوپر (تصویر کے داہنے گوشے) سے
دو افغان، جو شاید خود بھی سپاہی ہیں، ڈھلوان پتھریلے راستے پر اترتے آ رہے ہیں۔ انھوں نے، جیسا
کہ ان کے قدموں کے پاس پڑے کلاشنکوفوں کے ڈھیر سے اندازہ ہوتا ہے، ہلاک شدہ سپاہیوں
غیر مسلح کر لیا ہے۔ یہ ہلاک شدگان زندہ انسانوں سے — اپنی جان لینے والوں سے، گواہوں۔
سے — قطعی بے پروا ہیں۔ وہ ہم سے کیوں آنکھیں چار کریں؟ ان کے پاس ہم سے کہنے
ہے؟ "ہم" — اس "ہم" میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو اس قسم کے کسی تجربے سے نہیں
سے یہ ہلاک ہونے والے سپاہی گزرے ہیں — نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں۔
نہیں کر سکتے کہ جو کچھ ہوا وہ کیا تھا۔ ہم اپنے تصور میں نہیں لا سکتے کہ جنگ
ہولناک ہے، اور کیسی نارمل بات بن جاتی ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے، نہ تصور کر
جو وہ تمام سپاہی، اور تمام صحافی اور امدادی کارکن اور آزاد مبصر، جنھوں
کچھ وقت گزارا ہے، اور خوش قسمتی سے اُس موت سے بچ نکلے
لوگوں کو آ لیا، متواتر محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کا احساس درست

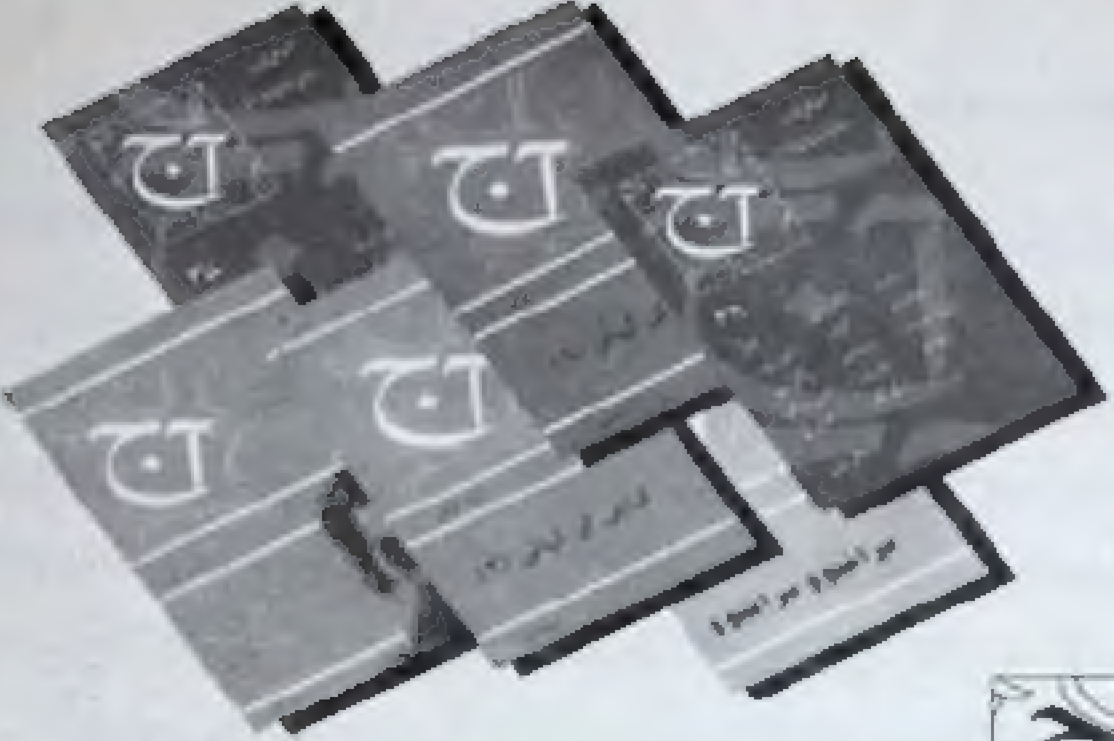

عالمی ادب کا سہ ماہی جریدہ

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے "آج" کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۹ء میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے ۵۰ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ "آج" کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، "سرائیوو سرائیوو" (بوسنیا)، نرمل ورما، اور "کراچی کی کہانی" کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

"آج" کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں
اور "آج کی کتابیں" اور "سٹی پریس" کی شائع کردہ کتابیں ۵۰ فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: ۳۰۰ روپے
ہندستان میں: ۴۲۰ روپے
دیگر ملکوں میں: ۱۳۰ امریکی ڈالر

۵۱

قیمت

پاکستان میں: ۹۰ روپے

ہندوستان میں: ۶۵ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner